

سَعَادَتِ حَسَن مَنُشُو



گنجِ فرشتے

گنجِ فرست

سعادت حسن منٹو

مکتبہٴ شعرو ادب لاہور

۷۔ ڈی بلاک سی۔ سن آباد

جلا حرق بنی سید شو محفوظ ہیں

ناشر _____ محمد نواز

انتہام _____ رفیق احمد

طبع _____ انیسویں ویں کیمبریا پریس لاہور

قیمت _____ ۱۸ روپے

گنجِ معانی حضرتِ غالب

کے نام

ہوس گلُ کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پرواہی نے مجھے

ترتیب

۹	میرا صاحب
۳۷	آغا حشر سے دو ملاقاتیں
۵۹	آغا شیرانی سے چند ملاقاتیں
۷۹	تین گر لے
۱۰۱	باری صاحب
۱۴۴	صحت چغتائی
۱۷۵	مُری کی دھن
۲۱۱	پری چیر و نسیم باتو
۲۳۷	اشوک کمار
۲۶۷	نرگس
۲۹۷	کشتِ زعفران
۳۱۵	بالو رافیل
۳۳۷	گجے فرشتے

میرا صاحب

یہ سی سینتیس کا ذکر ہے۔ مسلم لیگ روہڑہ شاہب مٹی میں خود شاہب کی ابتدائی منزلوں میں تھا جب خواہ مخواہ کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ صحت مند تھا، طاقت ور تھا اور جی میں ہر وقت یہی خواہش تڑپتی تھی کہ سامنے جو قوت آئے تو اس سے بڑھ جاؤں اگر کوئی قوت سامنے نہ آئے تو اسے خود پیدا کروں۔ اور یہ مقابل بنا کر اس سے گتے جاؤں یہ وہ وقت ہوتا ہے جب آدمی ہر وقت کچھ کرنے کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ کچھ کرنے سے میرا مطلب ہے کوئی بڑا کام کوئی بہت بڑا کام نہ مرنے کا نہ ہوا تو سرزد ہی ہو جائے۔ مگر کچھ ہو ضرور۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں پھر اس زمانے کی طرف لوٹتا ہوں جب غلبہ جوان تھا، مظلوم نہیں اُس نے اپنی جوانی کے دنوں میں کسی سیاسی تحریک میں حصہ

یہ تھا یا نہیں مگر خاکِ مسلم یگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ غازی آباد گورنمنٹ ایسے کئی جوانوں کی ایک جماعت تھی، جس کا میں ایک خلیفہ مبر تھا۔ اپنے اخلاص کا ذکر میں نے اس لیے بڑے وثوق سے کیا ہے۔ ————— کہ اُن دنوں میرے پاس سوائے اس کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔

یہ اُسی زمانے کا ذکر ہے کہ محمد علی جناح، دہلی تشریف لائے اور مسلمانوں نے اُن کا شاندار جلوس نکالا جیسا کہ ظاہر ہے غازی آباد گورنمنٹ اس جلوس کو پُر رونق اور پُر جوش بنانے میں پورا حصہ لیا۔ ہماری جماعت کے سالار انور قریشی صاحب تھے بڑے تنومند جوان جو اب شاعرِ پاکستان کے لقب سے مشہور ہیں۔ ہماری کور کے جوانوں کے ہونٹوں پر انہی کا تصنیف کردہ قومی ترانہ تھا۔ معلوم نہیں ہم سڑکوں پر تھے یا نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے حلق سے باہر نکلتا اُس کو سڑکوں کی پابندیوں میں جکڑنے کا جوش کسی کو بھی نہیں تھا۔

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے

نارِ پابند نے نہیں ہے

یہ تاریخی جلوس تاریخی شہرِ دہلی کی تاریخی جامع مسجد سے شروع ہوا اور پُر جوش نعرے بکھیرتا چاندنی چوک، لال کنواں، حوضِ قاضی اور چاؤڈی بازار سے ہوتا ہوا اپنی منزل یعنی مسلم یگ کے آفس پہنچ کر ختم ہو گیا۔

اجتماعی طور پر اس تاریخی جلوس میں محمد علی جناح صاحب کو قیامِ اعظم کے

غیر فانی خطاب سے نعروں کی کیا گیا۔ ان کی ساری کے لئے چھ گھنٹوں کی فٹن کا انتظام تھا۔ جلوس میں مسلم لیگ کے تمام سرکردہ اراکین تھے۔ موٹروں، موٹر سائیکلوں، ہائیکلوں اور اونٹوں کا ایک جوم تھا۔ مگر بہت ہی منظم۔ اس نظم کو دیکھ کر قائد اعظم جرحطبا بہت ہی نظم پسند تھے بہت مسرور نظر آتے تھے۔

میں نے اس جلوس میں اُن کی کئی جھکیاں دیکھیں۔ ان کی پہلی جھلک دیکھ کر میرا ردِ عمل سلوم نہیں کیا تھا۔ اب سوچتا ہوں اور تجزیہ کرتا ہوں تو صرف اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ خلوص چمک بے رنگ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ردِ عمل بھی یقیناً بے رنگ تھا۔ اس وقت اگر کسی بھی آدمی کی طرف اشارہ کر کے ٹھوسے کہا جاتا کہ وہ دیکھو تبارِ قائد اعظم ہے تو میری عقیدت اُسے قبول کر لیتی اور اپنے سر اُنکھوں پر جگہ دیتی —! لیکن جب میں نے جلوس کے مختلف موڑوں اور پھول میں ان کو کئی مرتبہ دیکھا۔ تو میری توجہ مندی کو دھکا سا لگا۔ میرا قائد اور اس قدر دُرُک — اس قدر خف!

مخائب نے کہا تھا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ ہمارے گھر آئے تھے۔ یہ اُن کی مہربانی اور خدا کی قدرت تھی۔ خدا کی

قسم میں کبھی اُن کو دیکھتا تھا۔ ان کے خیف و زلہ جسم کو۔ اُس مُشتِ

اور کبھی اپنے ہتے کئے ڈیل ڈول کو۔ جی میں آتا کہ یا تو میں سکر جاؤں یا وہ پھل جانیں۔ لیکن میں نے دل ہی دل میں اُن کے انہی ناتواں دست و بازو کو نظر بد سے منظر رکھنے کے لئے دعائیں بھی مانگیں۔ دشمنوں پر ان کے لگائے ہوئے زخموں کا چرچا عام تھا۔

حالات پٹا کھاتے ہی رہتے ہیں۔ معلوم نہیں پٹوں کا نام حالات ہے یا حالات کا نام پٹے۔ بہر حال کچھ ایسی صورت ہوئی کہ دماغ میں آرٹ کا کیڑا جو کچھ دیر سے سو رہا تھا۔ جاگا اور آہستہ آہستہ ریگنے لگا۔ طبیعت میں یہ آکسا بہت پیدا ہوئی کہ مجھے چل کر اس میدان میں قسمت آزمائی کی جائے۔ ہمارے کی طرف بچپن ہی مائل تھا۔ سوچا کہ شاید وہاں چل کر اپنے جو بزرگ کھانے کا موقع مل جائے۔
 — کہاں خدمتِ قوم و ملت کا جذبہ، اور کہاں اور کدھی کا ضبط۔ انسان میں جب مجموعہ اضداد ہے۔

مجھے پہنچا۔ ان دنوں امپیریل فلم کمپنی اسٹوڈیو جوبی پر تھی۔ یہاں رسائی گز بہت ہی شکل تھی۔ ہر کسی کی جیلے داخل ہوتی گئی۔ آٹھ گھنٹے روزہ پابندی کے طور پر کام کرتا تھا اور یہ خواب دیکھتا تھا کہ ایک روز آسمانِ فلم کا درخشندہ ستارہ بن جاؤں گا۔

اللہ کے فضل سے باقوفی بہت ہوں۔ خوش گفتار و سہی تو کچھ ایسا بگشتار بھی نہیں۔ اردو مادری زبان ہے۔ جس سے امپیریل فلم کمپنی کے تمام ستارے

نا آشنا تھے۔ اس نے میری مدد دہلی کے بجائے بجے میں کی۔ وہ یوں کروڑوں کے قریب قریب تمام تاروں نے اپنی گردنوں کا حال مجھ سے کھوایا۔ اور پھر صواب کرنے لگے۔ اُردو میں کوئی خط آتا تو میں انہیں پڑھ کے سنا۔ اس کا مطلب بتاتا ہوں کہ جواب لکھتا۔ مگر اس غشی گیری اور خطوط نویسی سے کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ اکثر اتنا اکثر اسی رہا۔

اس دوران میں امپیریل مسلم کمپنی کے مالک سیٹھ آرڈیشیر رائے کے ذہنی مسائل موڑ ڈرائیور بدھن سے میری دوستی ہو گئی اور اس نے اس کا حق یوں ادا کیا کہ فرصت کے اوقات میں مجھے موڑ چلانا سکھا دی مگر چونکہ یہ اوقات نہایت ہی مختصر ہوتے تھے اور بدھن کو ہر وقت سبکی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ سیٹھ کو اس کی چوری کا علم نہ ہو جائے۔ اس لئے میں اپنی تمام ذہانت کے باوصف موڑ چلانے کے فن پر پوری طرح حاوی نہ ہو سکا۔ حاوی ہونا تو بہت بڑی بات ہے۔ بہس یوں سمجھیے کہ مجھے بدھن کی مدد کے بغیر ناف جیسی سیدھی سڑک پر سیٹھ آرڈیشیر کی بیوک چلانا آگئی تھی۔ اس کے کل پرنوں کے متعلق میرا علم صفر تھا۔

اداکاری کی دھن سر پر بہت بڑی طرح سوار تھی۔ مگر یہ سر کا معاملہ تھا۔ دہلی میں مسلم لیگ اور اُس کے رواج و رواں قانناظم محمد علی جناح بدستور ایسے ہوئے تھے امپیریل فلم کمپنی میں اکیٹیوٹی ریمج پر، جینڈی بازار اور محمد علی روڈ میں اور پلے آؤٹ پر اکثر مسلمانوں کی اقلیت کے ساتھ کانگریس کے سلوک کا تذکرہ ہوتا تھا۔

اپسریل میں سب جانتے تھے کہ میں مسلم لیگی ہوں۔ اور قائد اعظم محمد علی جناح کا نام
 بیوا۔ لیکن یہ وہ ناز تھا۔ جب ہندو کسی کے منہ سے قائد اعظم کا نام سن کر اس کے
 جان میرا نہیں ہر جاتے تھے قیام پاکستان کا مطالبہ ابھی تفرطام پر نہیں آیا تھا۔ میرا خیال
 ہے اپسریل غم کہنی کے لوگ جب مجھ سے قائد اعظم کا تعریفی ذکر سنتے تو یہ سمجھتے
 تھے کہ وہ بھی کوئی ہیرہ ہے جس کا میں پرستار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دن اُس
 زمانے کے سب سے بڑے فلمی میروڈی میو ریائے ٹائمر آف انڈیا کا پرچہ میری
 طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”لو یہی یہ تمہارے جناح صاحب ہیں“

میں سمجھا ان کی کوئی تصویر بھی ہے۔ پرچہ ملی مریا کے دفتر سے لے آیا اُن
 پٹ کے دیکھا۔ مگر ان کی شبیہ نظر نہ آئی، میں نے اس سے پوچھا ”کیوں جیتا
 کہاں ہے ان کا فرور؟“

بنی مریا کی جون گھوٹ اشائل کی باریک باریک مرتجہیں سکر اہٹ کے باعث
 اُس کے ہونٹ پر کچھ میل سی گئیں۔ ”چوٹو دوٹو نہیں ہے۔ ان کا اشتہار چیلے
 میں نے پوچھا: اشتہار؟ کیا۔۔۔ اشتہار؟“

بنی مریا نے ہرچہ کیا اور ایک بابا کا لم دکھا کر کہا: ”سٹر جناح کو ایک
 مونٹر کینک کی ضرورت ہے۔ جران کے گریج کا سارا کام سنبھال سکے۔“

میں نے اخبار میں وہ منبر دیکھی۔ جہاں بنی مریا نے اعلیٰ دہی جوئی تھی، اور
 ہیں ”اوہ کیا جیسے میں نے ایک ہی نظر میں اس اشتہار کا سارا مغزوں پرچہ دیا ہے

مالا لگا واقف ہے کہ خاکسار کو انگریزی اتنی ہی آتی تھی جتنی ڈی بی مہیا کو اردو۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں میری موٹر ڈرائیور سی صرف اتنی ایسی سیدھی شرک تک محدود تھی۔ موٹر کی میکنزم کیا ہوتی ہے اس کے متعلق حرام ہے مجھے کچھ علم ہو۔ سیلف دبانے پر انجی کیوں اشارٹ ہوتا ہے۔ اس وقت اگر ٹیچر سے کوئی یہ سوال کرتا تو میں یقیناً یہ جواب دیتا کہ یہ قانون موٹر ہے سیلف دبانے پر بعض اوقات انجی کیوں اشارٹ نہیں ہوتا — اس سوال کا بھی جواب یہ ہوتا کہ یہ بھی قانون موٹر ہے۔ جس میں انسانی عقل کو کوئی دخل نہیں۔

آپ کو حیرت ہو گی کہ میں نے بی مہیا سے جناح صاحب کے بنگلے کا پتا وغیرہ نوٹ کر لیا اور دوسرے روز صبح ان کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا۔ اصل میں مجھے ملازمت حاصل کرنے کا خیال تھا۔ اس کی توقع تھی۔ بس یہ نہیں ان کو ان کی رہائش گاہ میں قریب سے دیکھنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اپنے خلوص کو ڈپوسٹ کے طور پر سامتہ لینے میں موٹ پلینزٹ روڈ واقع مالا بارہل پر ان کی خوش ناکوشی پر پہنچ گیا۔ باہر بنگلان پہرہ دار تھا۔ کئی تھانوں کی سفید شلوار، مسوڑہ ریشمی لنگی بہت ہی صاف ستھرا اور بارعب، اگر انڈیل اور طاقتور، اس کو دیکھ کر میری طبیعت خوش ہو گئی۔ دل ہی دل میں کئی مرتبہ میں نے اس کے اور اپنے فوٹر کی پیمائش کی اور یہ محسوس کر کے مجھے بڑی عجیب سی تسکین ہوئی کہ فرق بہت معمولی ہے یہی کوئی ایک آدھ انچ کا۔

مجھ سے پہلے اور کئی امیدوار جمع تھے۔ سب کے سب اپنی اسناد کے ہندے
 نفل میں دالے کھڑے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ بڑے فخر سے کی بات
 یہ ہے کہ اسناد تو ایک طرف رہیں۔ میرے پاس ڈسرایونگ کا معمولی لائسنس
 تک نہیں تھا۔ اُس وقت دل صرف اس خیال سے دھڑک رہا تھا کہ بس اب
 چند محفل میں قائد اعظم کا دیدار ہونے والا ہے۔

میں ابھی اپنے دل کی دھڑکن کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ قائد اعظم
 پورچ میں نمودار ہوئے سب اٹیشن ہو گئے۔ میں ایک طرف سوٹ گیا۔ اُن کے ساتھ
 اُن کی دو لڑکیاں اور کئی تیلی بشیئر تھیں جن کی متعدد تصاویر میں اخباروں اور رسالوں میں
 دیکھ چکا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اُن کے باادب مکتبہ مطلوب صاحب تھے۔
 جناح صاحب نے اپنی یکم چشمی جینک آنکھ پر جمائی اور تمام امیدواروں کو
 ہڈے غور سے دیکھا۔ جب اُن کی سیل آنکھ کا رخ میری طرف ہوا۔ تو میں اور
 زیادہ سوٹ گیا۔ فوراً اُن کی کعب جانے والی آواز بند ہوئی مجھے صرف اتنا
 سنائی دیا: یو۔ ۔ ۔

آئی انگریزی میں جانتا تھا۔ اُن کا مطلب تھا: تم "مگروہ" تم "کرن" تھا۔
 جس سے وہ مخاطب ہوئے تھے! میں سمجھا کہ میرے ساتھ والا ہے چنانچہ میں
 نے اُسے کہنی سے جھوکا دیا اور کہا: "یو۔" تبہیں ہمارے ہیں۔
 میرے ساتھی نے گنت بھرے بھر میں چہچہا: "صاحب میں آ"

گنجے فرشتے

وہ بھی اقمہ چلے گئے اور میں گھر لوٹ آیا ۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر درہ دولت پر حاضر ہوا۔ جب اطلاع کرائی تو ان کے غرض پوش حسین و جمیل اور صحت مند سیکرٹری تشریف لائے اور مجھے یہ حیرت انگیز مشورہ سنایا کہ صاحب نے مجھے پسند کیا ہے ۔ اس لئے میں فوراً گراج کا چارج لے لوں ۔

یہ سن کر جی میں آئی کہ ان پر لائقیت کا سارا پرل کھول دوں اور صاف صاف کہہ دوں کہ حضرت قائد اعظم کو اس خاکسار کے تعلق غلط نہیں ہوئی ہے میں تو محض تعزیراً یہاں چلا آیا تھا یہ آپ گراج کا بوجھ اس نااہل کے کندھوں پر کیوں دھر رہے ہیں مگر جانے کیوں میں کچھ نہ بولا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آٹا خانہ گراج کا پردھان بنا دیا گیا۔ چابیاں میرے حوالے کر دی گئیں۔ چار کاریں تھیں مختلف میک کی ماور مجھے صرف سیٹھ آرڈیشیر ایرانی کی بیوک چلانا آتی تھی۔ اور وہ بھی اعلیٰ جیبی سیدھی سڑک پر۔ والا باہر ہل تک پہنچنے میں کئی موڑ تھے۔ کئی غم اور موڑ میں آزاد کو صرف اپنی اکیلی جان نہیں لے جانا تھی۔ اسے خدا معلوم کن کن اہم کاموں پر اس رہنما کو بیٹھنے پھرنا تھا۔ جس کی زندگی کے ساتھ لاکھوں مسلمانوں کی جان وابستہ تھی ۔

میں نے سوچا چابیاں وغیرہ سب چھوڑ چھار کے بھاگ جاؤں۔ بھاگ کے سیدھا گھر پہنچوں۔ وہاں سے اپنا اسباب اٹھاؤں اور کٹ کٹا کے دہلی کا

رُخ کروں۔ مگر پھر سوچتا یہ درست نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ بلا کم و کاست جناب صاحب کو سارے حقائق سے باخبر کر دوں اور معافی مانگ کر انسانوں کی طرح واپس اس جگہ چلا جاؤں جو کہ میرا اصل مقام ہے مگر آپ یقین مانے کیجئے کہ مجھے پورے چھ ہفتے تک اس کا موقع نہ ملا۔

میں نے پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“

محمد صلیف آزاد نے جواب دیا: ”آپ سن لیجئے۔ دوسرے روز حکم ہوا کہ آزاد موٹر لائے۔ وہ جہاں سے موٹروں پر خطا ہوا کرتا ہے، خطا ہوتے ہوئے رو گیا میں نے ارادہ کر لیا کہ جو بہنی صاحب سامنے آئیں گے سلام کر کے گراچ کی چابیاں اُن کے حوالے کر دوں گا اور اُن کے قدموں میں گر پڑوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ پارچ میں تشریف لائے تو اس بندہ نابالغ کے منہ سے دھب کے ایسے ایک لفظ بھی نکل نہ سکا۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ فاطمہ صاحبہ تھیں۔ عورت خمر نہ پیتے کسی کے قدموں میں گرنا، منٹو صاحب، کچھ بہت وہ تھا۔“

میں نے آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں شرم کے لال لال ڈورے دیکھے اور مسکرا دیا: ”خیر۔۔۔ پھر کیا ہوا؟“

ہوا یہ منٹو صاحب کو خاکسار کو موٹر اشارٹ کرنی ہی پڑی۔ نئی چیکر ڈسٹی اللہ کا نام لے کر اٹکل پتو اشارٹ تو کر دی۔ اور بڑی صفائی سے کوٹھی کے باہر بھی لے گیا، پر جب بالا بارہل سے نیچے اترتے وقت لال پتی کے منہ کے پاس پہنچا

جانتے ہیں نہ نالی جتنی ہو

میں نے اثبات میں سر ملایا : ہاں ہاں

”بس صاحب، وہاں شکل پیدا ہو گئی۔ اشارہ من نے کہا تھا کہ بڑیک دبا کر
مساجد ٹیک کر بیا کر۔ اقرار تفری کے عالم میں کچھ ایسے انارڈی پن سے بڑیک ہائی کر
گاڑی ایک دھچکے کے ساتھ رکی۔ قائد اعظم کے ہاتھ سے اُن کا سگار گر پڑا۔
فاطر جناح صاحب اچھل کر دو ہاشت آگے۔ لگیں لے گایاں دینے۔ کاٹر
تو بہر نہیں میرے بدن میں اتھکا پٹنے گئے۔ دارغ چکراتے لگا۔ قائد اعظم نے سگار
اٹھایا اور انگریزی میں کچھ کہا۔ جس کا غالباً یہ مطلب تھا کہ واپس لے چلو۔ میں نے
حکم کی تعمیل کی۔ تو انہوں نے نئی گاڑی اور نیا ڈرائیور طلب فرمایا اور جہاں جانا تھا
چلے گئے۔ اس واقعے کے بعد چھ بیسے تک مجھے ان کی خدمت کا موقع نہ ملا۔
میں نے مسکرا کر پوچھا : ایسی ہی خدمت کا ہاں

آزاد بھی مسکرایا : جی ہاں۔ بس میں سمجھے کہ صاحب نے مجھے اس کا موقع
نہ دیا دوسرے ڈرائیور تھے۔ وہ ان کی وردی میں رہتے تھے مطلوب صاحب رات
کو بتا دیتے تھے کہ کون ڈرائیور کب اور کس گاڑی کے لئے چاہیئے۔ میں اگر ان سے
اپنے تعلق کچھ دریافت کرتا تو وہ کوئی فاطر خواہ جواب نہ دے سکتے۔ یہ مجھے بہت
میں معلوم ہوا۔ صاحب کے دل میں کیا ہے۔ اس کے تعلق کوئی بھی وثوق سے
کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اور نہ اُن سے کوئی کسی امر کے بارے میں استفسار ہی کر سکتا

تبادلہ صرف مطلب کی بات کرتے تھے اور مطلب کی بات ہی سنتے تھے یہی وجہ ہے کہ میں ان سے اتنا قریب ہوتے ہوئے بھی یہ معلوم نہ کر سکا کہ اپنے گراں گاہ کا تعلق ان کا کیا ہے۔ ان کا رہنے کی طرح انہوں نے مجھے کیوں ایک طرف پھینک رکھا ہے؟ میں نے آزاد سے کہا: ہر گز نہ کہہ سکتا ہے وہ تمہیں قطعاً سمجھوں ہی گئے ہوں۔

آزاد کے حلق سے وزنی تہمت بلند ہوئی: "نہیں جناب نہیں۔" صاحب مجھے سے بھی کبھی نہیں جوتے تھے۔ ان کو ابھی طرح معلوم تھا کہ آزاد چھ بیٹے سے گراں میں پڑا روٹیاں توڑ رہا ہے۔ اور مگر صاحب جب آزاد روٹیاں توڑے تو وہ معمولی روٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہ تو رش لا غلط فرمائیے؟

میں نے آزاد کی طرف دیکھا۔ سن سینٹس، انٹرس میں جانے اس کا کیا تعلق تھا۔ مگر میرے سامنے ایک کافی مضبوط اور نرمند آدمی بیٹھا تھا جس کو آپ ایگٹر کی حیثیت میں یقیناً جانتے ہوں گے۔ تقسیم سے پہلے وہ بیٹی کی میسر میں کام کرتا تھا۔ اور کچل کل یہاں لاہور میں اپنے دوسرے ایگٹر بھائیوں کے ساتھ فلمی صنعت کی زبوں حالی کا شکار کسی نہ کسی جیلے گذر اوقات کر رہا ہے۔

مجھے پچھلے برس ایک دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ موٹی موٹی آنکھوں سیاہ رنگ اور کسرتی بدن والا ایگٹر ایک مدت تک قائد اعظم محمد علی جناح کا موزر ڈرائیور رہ چکا ہے چنانچہ اسی وقت سے میری نگاہ اس پر تھی، جب کبھی اس سے ملاقات ہوتی ہی اس کے آٹا کار چھوڑ دیتا اور اس سے باتیں سن کر اپنے حلقے میں مجھے کرتا رہتا۔

کل جیب میں نے یہ مضمون کھنسنے کے لئے اس سے کہی باتیں دوبارہ میں تو مجھے
 قائد اعظم کی زندگی کے ایک بہت ہی دلچسپ پہلو کی جھلک نظر آئی محمد حنیف آزاد
 کے ذہن پر اس بات نے خاص طور پر اثر کیا تھا کہ اس کا آقا طاقت پسند تھا جس
 طرح علامہ اقبال کو بلند قیامت چیزیں پسند تھیں۔ اسی طرح قائد اعظم کو تنومند
 چیزیں مرغوب تھیں یہی وجہ ہے کہ اپنے لئے لازموں کا انتخاب کرتے وقت وہ
 جسمانی صحت اور طاقت سب سے پہلے دیکھتے تھے۔

اُس زمانے میں جس کا ذکر محمد حنیف آزاد کرتا ہے قائد اعظم کا سیکرٹری ملوث
 بڑا وجہ آدمی تھا جتنے ذرا بھرتے، سب کے سب جسمانی صحت کا بہترین نمونہ تھے
 کوٹھی کے پاس ہی اسی نقطہ نظر سے چنے جاتے تھے۔ اس کا نفاذاتی پس منظر
 اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جناب مرحوم خود بہت ہی لا فراور حنیف تھے مگر
 طبیعت چوکے بے حد مضبوط اور کسرتی تھی اس لئے کسی ضعیف اور نحیف شخص کو خود
 سے مشروب ہوتا پسند نہیں کرتے تھے۔

وہ چیز جو انسان کو مرغوب اور پیاری ہو، اس کے بناؤ سنگار کا وہ خاص
 اہتمام کرتا ہے چنانچہ قائد اعظم کو اپنے صحت مند اور طاقتور لازموں کی پوشش کا بہت
 خیال رہتا تھا۔ چٹان چوکیدار کو حکم تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا قومی لباس پہنا کر سے آزاد خیالی
 نہیں تھا۔ لیکن کبھی کبھی ارشاد ہوتا تھا کہ گجڑی پہنے، سر کا یہ لباس بڑا طر حدار
 ہے چونکہ اس سے قد و قیامت میں خوش گوار اضافہ ہوتا ہے اس لئے

وہ اس کے سر پر گھڑی بندھا کر بہت خوش ہوتے تھے، اور اس خوشی میں اس کو انعام دیا کرتے تھے۔

اگر غور کیا جائے تو جسم کی ہا غری کا یہ احساس ہی ان کی مضبوط اور پُر وجاہت زندگی کی سب سے بڑی قوت تھی، اُن کے چہنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے، اور ہونے سوچنے میں یہ قوت ہر وقت کار فرما رہتی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا کہ قائمناظم کی خوراک بہت ہی قلیل تھی: وہ اتنا کم کھاتے تھے کہ مجھے بعض اوقات قہقہہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے کس طرح ہیں۔ اگر مجھے اُس خوراک پر رکھا جاتا تو یقیناً دوسرے ہی روز میری چربی گھسنے لگتی۔ بسکین اس کے برعکس ہر روز چار پانچ مرغیاں، باورچی خانہ میں ذبح ہوتی تھیں۔ ان میں سے صرف ایک بونے کی بخنی اور وہ بھی بشکل ایک چھوٹی پیالی اُن کی خوراک کا جزو بنتی تھی۔ غوث ہر روز آتا تھا۔ اور کافی مدت داریں آتا مگر یہ سب غازیوں کے پیٹ میں جاتا تھا۔

”ہر روز رات کے کھانے کے بعد صاب کا غدہ یا شاید خود دنی کی فہرت پر نشان لگا دیتے تھے اور ایک سو کا نوٹ میرے حوالے کر دیتے تھے۔ یہ دوسرے روز کے طعام کے اخراجات کے لئے ہوتا تھا۔“

میں نے آزاد سے پوچھا۔ ”ہر روز سو روپے؟“

”جی ہاں، پورے سو روپے۔ اور قائمناظم کبھی حساب طلب نہیں فرماتے

تھے جو باقی بچتا وہ سب ملازموں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ کبھی تیس چار جاتے تھے۔ کبھی پچاس اور کبھی کبھی ساٹھ ستر اُن کو یقیناً اس بات کا علم تھا کہ ہم ہر روز بہت سے روپے گول کرتے ہیں۔ مگر اس کا ذکر انہوں نے کبھی نہ کیا۔ البتہ مس جناح بہت تیز تھیں۔ اکثر بگڑ جاتی تھیں کہ ہم سب چور ہیں۔ ایک آنے کی خیر کا ایک ٹریج لگاتے ہیں۔ مگر صاحب کا سوک کچھ ایسا تھا کہ ہم سب اُن کے مال کو اپنا مال سمجھنے لگے تھے چنانچہ ان کی جھڑکیاں اور گھرکیاں سُن کر اپنے کان سمیٹ لیتے تھے۔ صاحب ایسے برتنوں پر اپنی ہمشیرہ سے "اٹ اڑا اڑا" "اٹ اڑا اڑا" کہتے اور معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

مگر ایک دفعہ "اٹ اڑا اڑا" کہنے سے معاملہ رفع دفع نہ ہوا۔ اور محنت بہت مس جناح نے باورچی کو نکال دیا۔ ایک باورچی کو نہیں دونوں باورچیوں کو کیونکہ قائد اعظم بیک وقت باورچی خانے کے لئے دو ملازم رکھتے تھے۔ ایک وہ جو ہندوستانی کھانے پکانا جانتا ہو۔ دوسرا وہ جو انگریزی طرز کے کھانے پکانے کی بہت رکتا ہو۔ عام طور پر ہندوستانی باورچی بیکار پڑا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی، بعض اوقات جنہیں کے بعد اس کی باری آتی تھی۔ اور اس کو حکم ملتا تھا کہ وہ ہندوستانی کھانے تیار کرے۔ مگر قائد اعظم کو ان سے دلی رغبت نہیں تھی۔

آزاد نے بتایا: "جب دونوں باورچی نکال باہر کئے گئے تو صاحب نے کچھ نہ کہا۔ وہ اپنی ہمشیرہ کے معاملوں میں دخل نہیں دیا کرتے تھے چنانچہ کئی دن

دولوں وقت کا کھانا آج ہوٹل میں تناول فرماتے رہے اس دوران میں ہم لوگوں نے خوب عیش کیے۔ مگر سہ سوڑے کرنے باور چوٹی کی تلاش میں نکل جاتے اور محض اوجڑ اور محوم گھام کو واپس آجاتے تھے کہ کام کا کوئی آدمی نہیں ملا۔ آخر میں مس جناح کے کہنے پر پانے باور چوٹی واپس بلائیے گئے۔

جو شخص بہت کم خود ہودہ و دروڑ کو بہت کھاتے دیکھ کر یا تو جلتا جلتا ہے یا بہت خوش ہوتا ہے قائد اعظم دوسری قبیل کے کم خوروں میں تھے وہ و دروڑ کو کھانہ کو دلی سرت عکس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز سو روپے دے کر وہ صاحب کتاب سے بالکل غافل ہو جاتے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اسراف پسند تھے۔ محمد حنیف آزاد ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتا ہے۔

”ہرین اتالیس کا ذکر ہے شام کے وقت دروڑ کی میر ہو رہی تھی میں ان کی سفید پیکارڈ آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ سمند کی موجیں ہوسے ہوسے ساحل سے ٹکرائی تھیں۔ موسم میں گلابی ٹھنکی تھی۔ صاحب کا موٹو بہت اچھا تھا میں نے جتنے پاکر حمید کا ذکر بھیجے اس سے جو میرا مطلب تھا وہ ظاہر ہے صاحب فوراً تار گئے میں نے بیک دیروڑ میں دیکھا ان کے چلے ہوٹل سکر کے نہ جیسا ہونے والا سگاردمن سے نکال کر انہوں نے کہا ”اوہ... دل... دل...“ ابھی تم ایک دم مسلمان ہو گیا ہے۔“ محمد اسد وینو۔

اس سے چار روز پہلے قائد اعظم آزاد کو مسلمان بنا چکے تھے یعنی انعام کے

طور پر اسے دوسو روپے دے چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کو خنڈا سا ہندو بننے کی تلقین کی۔ مگر آزاد پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس عید پر وہ سید مرتضیٰ جیلانی فلم پروڈیوسر کے پاس اپنی مسلمانی مستحکم کرنے کی غرض سے آیا تاکہ اس سے سیرمی ملاقات ہوئی اور میں نے یہ مضمون تیار کرنے کے لئے اس سے مزید معلومات حاصل کیں۔

قائد اعظم کی گھریلو زندگی کا نقشہ مستور ہے اور ہمیشہ مستور رہے گا۔ عام طور پر یہی کہا جاتا ہے، لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کی گھریلو زندگی، ان کی سیاسی زندگی میں کچھ اس طرح مدغم ہو گئی تھی کہ اس کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ بیوی تھی، وہ مت ہوئی ان سے جدا ہو چکی تھی۔ لڑکی تھی اس نے ان کی مرضی کے خلاف ایک پارسی لڑکے سے شادی کر لی تھی۔

محمد حنیف آزاد نے مجھے بتایا: ”صاحب کو اس کا سخت صدمہ پہنچا تھا ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی مسلمان سے شادی کرے خواہ وہ کسی بھی رنگ و نسل کا ہو۔ لیکن ان کی لڑکی جواز پیش کرتی تھی کہ جب صاحب کو اپنی شریک زندگی منتخب کرنے میں آزادی حاصل تھی تو وہ یہ آزادی اسے کیوں نہیں بخشتے۔“

قائد اعظم نے بچنے کے ایک بہت بڑے پارسی کی لڑکی سے شادی کی تھی یہ تو سب کو معلوم ہے۔ لیکن یہ بات بہت کم آدمیوں کو معلوم ہے کہ پارسی اس دشتے سے بہت ناخوش تھے، ان کی یہ گردش اور خواہش تھی کہ جناح صاحب سے بد لیں۔

چنانچہ بعض دقیقہ رس اصحاب کا یہ کہنا ہے کہ قائداً غلام کی لڑکی کا پارسی لڑکے سے شادی کرنا ایک غلام سازش کا نتیجہ ہے، میں نے جب اس کا ذکر انداز سے کیا تو اس نے کہا: اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن مجھے صرف اس قدر معلوم ہے کہ صاحب کی زندگی میں اپنی بیوی کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا۔ جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کی صاحبزادی نے ایک پارسی سے شادی کر لی ہے تو وہ بے حد متاثر ہوئے، ان کا چہرہ اس قدر لطیف تھا کہ معمول سے معمولی واقعہ بھی اس پر آثار چڑھاؤ پیدا کر دیتا تھا جو دوسروں کو فوراً نظر آ جاتا تھا۔ اچھے پر ہلکی سی شکن ایک خورناک خط کی صورت اختیار کر جاتی تھی — ان کے دل و دماغ پر اس حادثے سے کیا گزری، اس کے متعلق مرحوم ہی کہہ سکتے تھے، ہمیں صرف خارجی ذریعوں سے جو کچھ معلوم ہوا اس کی تباہی پر کہہ سکتے ہیں کہ وہ بہت مضطرب رہے، چند روز تک وہ کسی سے نہ ملے اس دوران میں انہوں نے سینکڑوں سگار پونک ڈالے ہوں گے۔ اور سینکڑوں میل ہی اپنے کمرے میں ادھر ادھر بکرا لگا کر طے کئے ہوں گے۔

”سچہ بچہ کے عالم میں ان کو ادھر ادھر ٹھہرنے کی عادت تھی۔ رات کے منٹے میں وہ اکثر پختہ اور بے داغ فرش پر ایک طرح سے کھٹکتے رہتے تھے پختے قدم ادھر سے ادھر ایک فاصلہ، خاموش فضا، جب وہ چلتے تو ان کے سفید اور کالے یا سفید اور ہلاؤن شوز ایک عجیب قسم کی یک آہنگ ہم ٹک پیدا کرتے، جیسے کلاک معین و قنوں کے بعد اپنی زندگی کی خبر دے رہا ہے۔ قائداً غلام کو اپنے جوتوں سے

پہنچا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان کے قدموں میں ہوتے تھے اور ہر وقت ان کے اشاروں پر پھلتے تھے ۔

”چند روز مسلسل ذہنی اور روحانی طور پر مضطرب رہنے کے بعد ایک روز ایک ایسی فکری فوہار ہوئی، ان کے چہرے پر اب اس صدمے کا کوئی اثر باقی نہیں تھا۔ ان کی گردن جس میں فرقہ وارانہ کے باعث خفیت سا دم پیدا ہو گیا تھا، پھر کسی طرح سیدھی اور آگزی ہوئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اس صدمے کو باطل سمجھ گئے تھے؟ جب آزاد نے قائمہ اعظم کی زندگی کے اس صدمے کا ذکر دوبارہ پیش کیا تو میں نے اس سے پرچھا: وہ اس صدمے کو نہیں بھولے تھے۔ یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

”آزاد نے جواب دیا: ”غلاموں سے کیا بات چھی رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ صندوق کھولنے کا حکم دیتے تھے۔ جست کے اس جہازی صندوق میں بے شمار کپڑے تھے، ان کی مرحوم بیوی اور نازنا بندہ دار لڑکی کے جیب وہ چوٹی سی پتی تھی۔ یہ کپڑے باہر نکالے جاتے تو صاحب بڑی سنگین خاموشی سے ان کو دیکھتے رہتے۔ ایک دم ان کے منہ پتے اور شفات چہرے پر غم و اندوہ کی لکیروں کا ایک جال سا بکھر جاتا۔ اسٹ اسٹ اسٹ۔ اسٹ اسٹ اسٹ۔ کہہ کر وہ اپنی آنکھ سے مونوکل اُتارتے اور اُسے پرچتے ہوئے ایک طرف چل دیتے۔“

”محدثہ آزاد کے بیان کے مطابق قائمہ اعظم کی تین بہنیں: فاطمہ جنت رحمت خدیجہ، تیسری کا نام مجھے یاد نہیں، وہ ڈوگری میں رہتی تھیں۔ چوپائی کا رند

نزد چائی مورو روکس پر رحمت جناح مقیم تھیں، ان کے شہر کہیں عازم تھے آمدن
 قلیل تھی، صاحب ہر پہیے بجے ایک بندہ حاضر دیتے۔ جس میں کچھ کرنسی نوٹ ہوتے
 تھے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی ایک پارسل سا بھی دیتے۔ جس میں قابا پکڑے وغیرہ
 ہوتے تھے۔ یہ چیزیں مجھے رحمت جناح کے ان پہنچانا ہوتی تھیں۔ یہاں سے فاطمہ علی
 اور خود صاحب بھی کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ وہ بہن جو ڈوگری میں رہتی تھیں،
 شادی شدہ تھیں، ان کے متعلق مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ آسودہ حال تھیں، اور
 کسی امداد کی محتاج نہیں تھیں۔ ایک بھائی تھا، اس کی مدد وہ اتنا مددہ کرتے تھے مگر
 اس کو غرض میں آنے کی اجازت نہیں تھی۔

تاؤدا اعظم کے اس بھائی کو میں نے بجے میں دیکھا ہے، میڈوائے بار میں ایک شلم
 کریں نے دیکھا کہ تاؤدا اعظم کی شکل و صورت کا ایک آدمی آدھارم کا اکڑوڑے رہا
 ہے۔ ویسا ہی ناک نقش ویسے ہی اٹے کنگھی کئے ہوئے بال، قریب قریب ویسی
 ہی سفید لٹ۔ میں نے کسی سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا
 کہ وہ مشر محمد علی جناح کا بھائی احمد علی ہے۔ میں بہت دیر اس کو دیکھتا رہا مگر
 آدھارمیک اس نے بڑی شان سے آہستہ آہستہ لبوں کے ذریعے سے چس چس کر
 کر ختم کیا بل جو ایک روپے سے کم تھیں ادا کیا جیسے ایک بہت بڑی رقم ہے اور
 اس کی نشست سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بجے کی ایک گھٹیا بار کے بجائے تاج محل
 ہوٹل کے شراب خانے میں بیٹھا ہے۔

گاندھی جناح کی تاریخی تعلقات سے کچھ دیر پہلے بننے میں مسلمانوں کا ایک تاریخی اجتماع ہوا۔ میرے ایک دوست اس جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پیٹ فارم پر قائم اعظم اپنے مخصوص انداز میں تقریر کر رہے تھے اور بہت دُور ان کا بھائی احمد علی آنکھ پر سونول لگائے کچھ اس انداز سے کھڑا تھا۔ جیسے وہ اپنے بھائی کے الفاظ دانتوں تلے چبا رہا ہے۔

اندولن خانہ کھیلوں میں قائم اعظم کو صرف بیئر ڈب سے دلچسپی تھی۔ کبھی کبھی جب ان کو اس کھیل سے شغل خزانے کی خواہش ہوتی تو وہ بیئر ڈوم کھلانے کو حکم دیتے۔ صفائی رول تو برکمرے میں ہر روز ہوتی تھی، مگر جب وہ کسی خاص کمرے میں جانے کا ارادہ فرماتے تو ملازمین ان کے داخلے سے پہلے اپنا اچھی طرح اطمینان کر لیتے۔ کہ ہر چیز صاف ستھری اور ٹھیک ٹھاک ہے۔ بیئر ڈوم میں مجھے جاننے کی اجازت تھی۔ اس لئے کہ مجھے بھی اس کھیل سے تھوڑا بہت شغف ہے۔ بارہ گیندیں ان کی خدمت میں پیش کر دی جاتیں، ان میں سے وہ انتخاب کرتے اور کھیل شروع ہو جاتا۔ بھستہ فائل جناح پاس ہوتیں، صاحب سگڑ سگڑ کر ہونٹوں میں دبایاتے۔ اور اس گیند کی پوزیشن کو ابھی طرح جانچتے جس کے شوکر لگنا ہوتا تھی، اس جانچ پر حال میں وہ کئی منٹ صرف کرتے، کبھی ایک زاویے سے دیکھتے کبھی دوسرے زاویے سے۔ آخر میں کیڑ کو قوتے اپنی پتلی پتلی انگلیوں پر اسے سادگی کے گز کی طرح پھیرتے زیر پر کہہ کتے بھشت باندھتے، مگر کوئی دوسرا مناسب دوزخوں زاویہ ان کے ذہن میں آتا اور

وہ اپنی ضرب لاک لیتے۔ ہر طرف سے اپنا پورا اطمینان کرنے پر جب سیو گیند کے ساتھ ٹکراتے اور نتیجہ ان کے حساب کے مطابق ٹھیک نکلتا تو اپنی بہن کی طرف فائدہ انداز میں دیکھ کر مسکرا دیتے۔

سیاست کے کھیل میں قائمہ اعظم اسی طرح قنطارتے۔ وہ ایک دم کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، ہر مسئلے کو وہ غیر ٹوکے میز پر پڑی ہوئی گیند کی طرح ہر زاویے سے بنورد دیکھتے تھے اور صرف اسی وقت اپنے کیو کو حرکت میں لا کر ضرب لگاتے تھے جب ان کو اس کے کارگر ہونے کا پورا وثوق ہوتا تھا۔ وار کرنے سے پہلے شکار کو اپنی نگاہوں میں اچھی طرح تول لیتے تھے۔ اس کی نشست کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیتے تھے، پھر اس کی سیاست کے مطابق اختیار منتخب کرتے تھے، وہ ایسے شکاری نہیں تھے کہ پستول اٹھایا اور داغ دیا، اس یقین کے ساتھ کہ نشانہ خطا نہیں جائیگا نشانہ کی ہر غلطی خطا نشست باندھنے سے پہلے ان کے پیش نظر رہتی تھی۔

آزاد کے بیان کے مطابق قائمہ اعظم عام ملاقاتیوں سے پرہیز کرتے تھے ہڈ دو روز کار باقوں سے انہیں سخت نفرت تھی، صرف مطلب کی بات اور وہ بھی نہایت اختصار کے ساتھ سُنے اور کرنے کی عادت تھی یہی وجہ ہے کہ ان کے خاص کمرے میں جہاں بہت کم لوگوں کو داخلے کی اجازت تھی، صرف ایک صوفہ تھا اس صوفے کے ساتھ ایک چھوٹی سی تپائی تھی۔ اس میں صاحب اپنے سگار کی لاک پھیکتے تھے۔ صوفے کے بائیں دو طرف کھیس تھے۔ ان میں وہ قرآن مجید رکھے رہتے تھے جو

ان کے عقیدت مندوں نے ان کو تحفے کے طور پر دیئے تھے اس کمرے میں ان کے ذاتی کاغذات بھی محفوظ تھے۔ عام طور پر وہ اپنا زیادہ وقت اسی کمرے میں گزارتے تھے اس میں کوئی میز نہیں تھا۔ مطلوب یا کوئی اور شخص جب بھی اس کمرے میں آیا جاتا تو اسے دروازے میں کھڑا رہنا پڑتا۔ یہیں وہ صاحب کے احکام سنتا اور اُٹے پاؤں چلا جاتا۔ صوفے کے خالی حصے پر ان کے زیر مطالعہ کاغذات بکھرے رہتے تھے۔ کوئی خط لکھوانا، ہنرنا تر مطلوب کر یا اسٹینو کو بلواتے اور خط یا بیان کی عبارت بول دیتے۔ ان کے لیے میں ایک قسم کی کرتلی تھی۔ میں انگریزی زبان کے مزاج سے واقف نہیں ہوں لیکن جب وہ بولتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا کہ وہ زور دہنیے والے الفاظ پر بھی زور دے رہے ہیں۔

آزاد کے مختلف بیانات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ قائد اعظم کی جسمانی کمزوری کا غیر شعوری یا تحت الشعوری احساس ہی ان کو سخت مظاہر کا باعث بنا۔ ان کی زندگی حجاب برآب تھی، مگر وہ ایک بہت بڑا بھنور ہی کے رہتے تھے، بعض اصحاب کا تو یہ کہنا ہے کہ وہ اتنے دن صرف اسی قوت کے بل پر جیئے — جسمانی کمزوری کے اس احساس کی قوت پر۔

محمد حنیف آزاد کے بیان کے مطابق بہادر یا درجنگ مرحوم قائد اعظم کے بہترین دوستوں میں سے تھے۔ صرف انہی سے ان کے مراسم بہت بے تکلفانہ تھے وہ جب بھی ان کے یہاں قیام کرتے تو یہ دونوں شخصیتیں شفیٹ دوستانہ انداز میں قومی اور

سیاسی مسائل پر غور کرتی تھیں۔ اس وقت قائد اعظم اپنی آمریت کچھ عرصے کے لئے اپنی شخصیت سے جدا کر دیتے۔ میں نے صرف یہی ایک شخص دیکھا جس سے مطلب بھولی کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ایسا عرصہ ہوتا تھا جیسے وہ بچپن کے ساتھی ہیں جب آپس میں باتیں کرتے تو کوئی مرتبہ تیار و بند سے آواز دہکتیوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ بہادر یار جنگ کے علاوہ مسلم لیگ کے دوسرے سربراہان و اراکین مثال کے طور پر راجہ محمود آباد، آئی رائی چندریگر، مولانا زاہر حسین۔ نواب زادہ یاقوت علی خان، نواب انیس اور علی امام صاحب اکثر تشریف لاتے تھے۔ لیکن صاحب ان سے باطن و قریبی انداز میں پیش آتے۔ وہ بے تکلفی کہاں جو بہادر یار جنگ کے لیے مخصوص تھی۔

میں نے آزاد سے پوچھا: "خان یاقوت علی خان تو اکثر آتے ہوں گے؟" آزاد نے جواب دیا: "جی ہاں صاحب ان سے اس طرح پیش آتے تھے جیسے وہ ان کے سب سے ہونہار شاگرد ہیں۔ اور خان صاحب بھی بڑے ادب اور ڈری سادات مندی سے ان کا ہر حکم سنتے اور بجا لاتے تھے۔ جب ان کی طبیعت ہوتی تو وہ مجھ سے کبھی کبھی پوچھ لیا کرتے تھے۔ کہو آزاد، صاحب کا موڈ کیسا ہے ان کا جیسا موڈ ہوتا میں بتا دیا کرتا تھا۔ جب اس میں کوئی خرابی واقع ہو جاتی تو کوئی کے تمام درد و دیور کو فوراً پتہ چل جاتا تھا؟"

قائد اعظم اپنے ملازمین کے کردار و اطوار کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جیسے طرح

اُن کو تن کے میل سے نفرت تھی۔ اسی طرح وہ سن کے میل سے متفرق تھے مطلوبان کو بہت پسند تھا۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا کہ وہ ایک رضا کار لڑائی سے محبت کی ٹیمیں برصغیر ہے تو ان کو بہت کوفت ہوئی۔ عجز وہ اس قسم کی کوفت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتے تھے۔ اُس کی طبیعت ہر ٹی اور فوراً ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا مگر اس کو نصرت کرنے کے بعد وہ اُس سے اس طرح پیش آئے جس طرح دو قتل سے آتے ہیں۔

آزادیان کرتا ہے، ایک بار میں رات کے دو بجے سیر و تفریح سے صبح اُرخ ہو کر کوٹھی آیا۔ وہ دن ایسے تھے۔ جب رگوں میں جوانی کے خون کو کھولانے میں ایک عجیب قسم کی لذت محسوس ہوا کرتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ صاحب کو میرے دیہے سے آنے کا جہم تک نہ ہوگا۔ مگر ان کو کسی نہ کسی طرح پتہ چل گیا۔ دوسرے روز کا مجھے طلب فرمایا۔ اور انگریزی میں کہا کہ تم اپنا کیریئر خراب کر رہے ہو۔ پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں ارشاد ہوا۔ "اول، اب تھرا شادی بلکے گا۔" چنانچہ چار ماہ بعد جب وہ یمنی سے وہی اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے۔ تو ان کی بہت کے مطابق میری شادی ہو گئی۔ اور میری خوش قسمتی ہے کہ بعض ان کی وجہ سے میرا رشتہ سادات خاندان میں ہوا۔ جن میں تو شیخ تھا۔ لڑائی والوں نے مجھے اس لئے قبول کیا کہ آزاد قاعدہ اعظم کا غلام ہے۔

میں نے آزاد سے دفتر ایک سوال کیا۔ کیا تم نے کبھی قائد اعظم کے منہ

سے اُنی ایم سو رہی سنا تھا :

آزاد نے اپنی سوئی تنومند گردن زور سے نفی میں جلائی : " نہیں — کبھی نہیں — پھر وہ مسکایا : " اگر اتفاق سے کبھی اُنی ایم سو رہی ان کے منہ سے نکل جاتا تو مجھ یقین ہے کہ کوشنری میں سے تیرے الفاظ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹا دیتے : " میرا خیال ہے آزاد کے اس بے ساختہ جملے میں قائد اعظم محمد علی جناح کا پیدا ہونا گمراہ آجاتا ہے ۔

محمد صلیب آزاد زندہ ہے ، اس پاکستان میں جو اس کے قائد اعظم نے اسے عطا کیا ہے ۔ اور جواب اس کے ہونہار شاگرد خان بیات علی خان کی قیادت میں دنیا کے نقشے پر زندہ رہنے کی جدوجہد کر رہا ہے ۔ اس آزاد خطہ زمین پر آزاد ، پنجاب آرٹ پکچرز کے دروازے کے باہر پان مارے کی دکان کے پاس ٹرٹی ہوئی کھاٹ پر بیٹھا اکثر اپنے آقا کا منتظر رہتا ہے ۔ اور اس اچھے وقت کے لئے دست بدعا رہتا ہے ۔ جب وقت پر اس کی تحواریہ مل جایا کرے ۔ اب وہ قائد اعظم کی تعلیم کے مطابق ہندوین کے لئے بھی تیار ہے ۔ بشرطیکہ اس کو اس کا موقع دیا جائے

وہ بے حد متفکر تھا ، جب میں نے اس سے قائد اعظم کی زندگی کے بارے میں اس کے اثرات کے تعلق استفسار کیا ۔ اس کے پاس پان کے لئے بھی پیسے نہیں تھے ۔ میں نے جب اُس کے نظریات اصرار دھر کی باتوں سے کسی قدر دور کئے تو اس نے ایک آہ بھر کر کہا : " صاحب استعمال فرما گئے ہیں — کاش ان کے اس سفر میں میں

مجھے شریک ہوتا۔ ان کی سفید اوپن پکیرڈ ہوتی، اس کا وہیل میرے ہاتھوں میں ہوتا، ارد میں آہستہ آہستہ ان کو مٹر کی مقصود تک لے جاتا۔ ان کی نازک طبیعت و چمکوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے سنا ہے واللہ اعلیٰ درست ہے یا غلط جب ان کا جہاز کراچی ایئرڈروم پر پہنچا تو ان کو گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچانے کے لئے جوائے بولنس تھی اس کا انہیں درست حالت میں نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر چل کر رگ گئی تھی۔ اس وقت میرے صاحب کو کس قدر کوفت ہوئی ہوگی :-
آزاد کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسو تھے ۔

آغا حشر سے دو ملاقاتیں

تاریخیں اور سن مجھے کبھی یاد نہیں رہے، یہی وجہ ہے کہ یہ مضمونی لکھتے وقت مجھے کافی الجھن ہو رہی ہے۔ خدا معلوم کون سا سن تھا۔ اور میری عمر کیا تھی، لیکن صرف اتنا یاد ہے کہ بعد مشکل انٹرنس پاس کر کے اور دو دفعہ ایف اے میں فیل ہونے کے بعد میری طبیعت پُر محاشی سے بالکل اچاٹ ہو چکی تھی اور جھٹ سے میری دلچسپی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ کسٹرواجیل سنگھ میں دینویا فسطو کبھار کی دکان کے اوپر ایک بیٹھک تھی۔ جہاں دن رات جڑا ہوتا تھا۔ فلش کھیل جاتی تھی بشرط شروع میں تو یہ کھیل میری سمجھ میں نہ آیا۔ لیکن جب آگیا تو پھر میں اسی کا ہو رہا۔ رات کو جو تھوڑی بہت سونے کی فرصت ملتی تھی۔ اس میں بھی خراب راتوں میں اور تریوں ہی کے اُتے تھے۔

ایک برس کے بعد مجھے سے مجھے کچھ اتنا بہت ہونے لگی۔ طبیعت اب کوئی اور شغل چاہتی تھی۔ کیا؟ — یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ — دینویا نفس کو کہاں کی ٹینک میں ایک روز ابراہیم نے جو کہ امرتسر میں چٹھی میں تانگوں کا دارودست، آغا حشر کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ امرتسر آئے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ سنا تو مجھے سکول کے رہ۔ ان یاد آگئے۔ جب تین چار مہینہ وہ لفظوں کے ساتھ مل کر ہم نے ایک ڈراما ٹینک، کلب کھولی تھی۔ اور آغا حشر کا ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے کا ارادہ کیا تھا یہ کلب صرف چند مہینے میں روزانہ قائم رہ سکی تھی۔ اس لئے کہ والد صاحب نے ایک روزہ صارفین کو رومینم اور بیٹے سب توڑ پھوڑ دیے تھے۔ اور واضح الفاظ میں ہم کو بتا دیا تھا کہ ایسے واقعات شغل انہیں بالکل پسند نہیں۔

اس کلب کے باقیات آغا حشر کے اس ڈرامے کے چند الفاظ ہیں۔ جو میرے ذہن کے ساتھ ابھی تک چپکے ہوئے ہیں۔ "اتنا تو اس کے کرم ہیں؟" میرا خیال ہے جب دارود ابراہیم نے آغا حشر کا ذکر کیا تو مجھے اس وقت ڈرامے کا پورا ایکسپیریا یاد تھا چنانچہ مجھے اس خبر سے ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو گئی کہ آغا حشر امرتسر میں ہے آغا صاحب کا کوئی ڈرامہ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ

دلت کو گھر سے باہر رہنے کی مجھے قطعاً اجازت نہیں تھی۔ ان کے ڈرامے بھی میں نے نہیں پڑھے تھے۔ اس لئے کہ مجھے مٹر نیاؤں کو ریٹ آف لنڈن اور تیبہ تھرام فیروز پوری کے ترجمہ کردہ انگریزی جاسوسی ناول جیسی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا لیکن

اس کے باوجود امرتسر میں آغا صاحب کی آمد کی خبر نے مجھے کافی متاثر کیا۔
 آغا صاحب کے متعلق بے شمار باتیں مشہور تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کوچہ و گلیاں
 میں راکتے تھے جو بھاری گلی تھی، جس میں ہزار مکان تھا۔ آغا صاحب بہت بڑے
 آدمی تھے۔ کٹھیری تھے۔ یعنی میرے ہم قوم۔ اور پھر میری گلی میں وہ کسی اپنے
 بچپن کے ایام گزار چکے تھے۔ ان تمام باتوں کا لگائی اثر جو مجھ پر ہوا آپ اسے
 بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

داروہ ابراہیم سے جب میں نے آغا صاحب کے متعلق کچھ اور پوچھا تو اس
 نے وہی باتیں بتائیں جو میں ارداس سے خراج مرتبہ سن چکا تھا۔ کردہ پہلے دس بجے
 کے عیاش ہیں۔ دن رات شراب کے نشے میں دھت رہتے ہیں بے حد گندہ ذہن
 ہیں۔ ایسی ایسی گلیاں ایجاد کرتے ہیں کہ غلطی میں من کی کوئی شال نہیں ملتی۔
 بڑے سے بڑے آدمی کو بھی غلطی میں نہیں آتے۔ کچنی کے فلاں فلاں سیٹھ نے
 جب ان سے ایک بار ڈرائے کا تقاضا کیا تو انہوں نے اس کو اتنی موٹی گالی دی جو
 ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں آغا صاحب کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے لئے کافی
 تھی۔ لیکن حیرت ہے کہ سیٹھ نے اُن نہ کی اور اچھے جوڑ کر کہنے لگے: آغا صاحب
 ہم آپ کے نوکر ہیں۔۔۔ بدیہہ گرتے۔ ایک مرتبہ یہ ہرسل جو رہی تھی مگر
 کے باعث ایک الیکٹریس بار بار مارتے پر سے اٹھی کے ساتھ پسینہ پونچھ رہی
 تھی۔ آغا صاحب جھنجھلائے اور ایک شعر موزوں ہو گیا۔

ابروہ سزاوار کر دکھ جائے گی اُنکی

نادان ہوتو ہمارے کیلا نہیں کرتے

یہ برسل ہو رہی تھی۔ لفظ ”فٹ“ ایک ایکٹرس کی زبان پر نہیں پڑنا تھا۔
آغا صاحب نے گرج کر ”فٹ“ کا ایک ہم قافیہ لفظ لڑکا دیا — ایکٹرس کی
زبان پر فوراً ”فٹ“ پڑھ گیا۔

آغا صاحب کے کان تک یہ بات پہنچی کہ عاصد یہ پردہ پگنڈا کر رہے ہیں کہ
ہندی کئے ڈرائے ان کے اپنے کئے ہوئے نہیں کیونکہ وہ ہندی زبان سے بالکل
ناواقف ہیں آغا صاحب شیخ پر ڈرامہ شروع ہونے سے پہلے آئے اور حاضریں
سے کہا: میرے متعلق چند مضامین پر دلائل بات پھیلا رہے ہیں کہ میں نے اپنے
ہندی کے ڈرائے کرانے کے پتلے توں سے لکھوائے ہیں — میں اب آپ
کے سامنے شدہ ہندی میں تقریر کروں گا — چنانچہ آغا صاحب دو گھنٹے تک
ہندی میں تقریر کرتے رہے جس میں ایک لفظ بھی اردو یا فارسی کا نہیں تھا۔
آغا صاحب جس ایکٹرس کی طرف نگاہ اٹھاتے تھے وہ فوراً ہی ان کے
ساتھ خلوت میں چلی جاتی تھی۔

آغا صاحب تھیٹروں کو حکم دیتے تھے کہ ”تید ہو جاؤ“ اور شراب پی کر ٹھپتے
ٹھپتے بیک وقت کو میڈی اور ٹریکڈی لکھوانا شروع کر دیتے تھے۔

آغا صاحب نے کبھی کسی عورت سے عشق نہیں کیا — لیکن مجھے داروغہ ابراہیم

کی نرہانی معلوم ہوا۔ کہ یہ بات جھوٹ ہے۔ کیونکہ وہ اترتھری کی مشہور طوائف مختار پر عاشق ہیں۔ یہی مختار جس نے مصورت کا پیارِ ظلم میں ہیر و من کا پارٹ ادا کیا ہے۔

مختار کو میں نے دیکھا ہوا تھا۔ مال بازار میں انور پٹیل کی دکان پر بیٹھ کر ہم قریب قریب ہر جمعرات کی شام کو مختار کو داری کوٹے سے نئے فیشن کے کپڑوں میں ہمیں دوسری طوائفوں کے ہمراہ نکالنا ہر چیز کی روگاہ کی طرف جاتے دیکھا کرتے تھے۔

آغا صاحب شکل مصورت کے کیسے تھے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کچھ بھی ہوئی تصویریں دیکھنے میں آئی تھیں۔ مگر ان کی چھائی اس قدر وہابیات تھی کہ مصورت پہچانی ہی نہیں جاتی تھی۔ عمر کے متعلق صرف آغا معلوم تھا۔ کہ وہ اب ضعیف ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں جتنی عمر کے آخری وقت میں ان کو مختار سے کیسے مشق ہوا۔ اس پر ہم سب کو جو دنیویا فضلہ گہار کی ٹھیک میں جوا کھیل رہے تھے، سمجھ تعجب ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے، مال کے پیسے نکالتے ہوئے دنیویا فضلہ گہار نے گردن ہانک کر مجھے فلسفیانہ انداز میں کہا تھا، "بڑھاپے کا عشق بڑا قاتل ہوتا ہے"۔

ایک بار آغا صاحب کا ذکر ٹھیک پر ہوا تو پھر قریب قریب ہر روز ان کی باتیں ہوتے گئیں، ہم میں سے صرف دارود اہلہ ہم آغا صاحب کو ذاتی طور پر جانتا تھا۔ ایک روز اس نے کہا، "کل رات ہم مختار کے کوشے پر تھے۔ آغا صاحب گانڈیکے کا سہارا لیے بیٹھے تھے۔ ہم میں سے باری باری ہر ایک نے ان سے پوچھا کہ در خواست کی کہ وہ اپنے نئے غمی ڈرانے، رستم و سہراب کا کوئی تقدس سنائیں، مگر

انہوں نے اٹھار کر دیا۔ ہم سب یارس ہر گئے۔ ایک نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آغا صاحب کی بن میں بیٹھ گئی اور ان سے کہنے لگی: آغا صاحب بہادر حکم ہے کہ آپ رستم و سہراب سنائیں! — آغا صاحب سکڑائے اور بیٹھ کر رستم کا پڑ زور مکار ادا کرنا شروع کر دیا۔ اللہ اللہ کیا گرج دار آواز تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا تیز دھارا پہاڑ کے چٹوروں کو بہائے لئے جا رہا ہے۔

ایک دن ابراہیم نے بتایا کہ آغا صاحب نے پناہ ایک نظم ترک کر دیا ہے۔ جو آغا صاحب کے تعلق زیادہ جانتے تھے۔ ان کو بہت تعجب ہوا۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ فیصلہ انہوں نے حال ہی میں مختار سے عشق ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ یہ عشق بھی کیا جلاتی۔ ہم سمجھ نہ سکے۔ لیکن دینویا نفلوں نے نال کے کڑ پیسے اپنے تہہ کے ٹب میں بانٹتے ہوئے ایک بار پھر کہا: بڑھاپہ کے عشق سے خدا بچائے — بڑی ظالم چیز ہوتی ہے۔

جوئے نے طبیعت اگتا ہی چلی تھی۔ میں نے جھجک جانا آہستہ آہستہ چھوڑ دیا۔ اس دوران میں میری ملاقات باری صاحب اور حاجی نق نق سے ہوئی۔ جو روزنامہ مساوات کے ایڈیٹر مقرر ہو کر امرتسر آئے ہوئے تھے۔ پیچھے کے ہوٹل "شیراز" میں دونوں چاؤ پیچھے آتے تھے اور ادب اور سیاست پر باتیں کرتے تھے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی۔ باری صاحب کو میں نے بہت پسند کیا۔ اسی دوران میں مجھے نے اختر شیرانی مرحوم کو مدعو کیا۔ دن رات ٹھہرے کے دور چھنے لگے۔ شعر و ادب سے

میری دلچسپی بڑھنے لگی۔ جو وقت پہلے غلش کھیلنے میں گھٹا تھا اب مساوات کے دفتر میں کھٹے لگا۔ کبھی کبھی باری صاحب ایک آدھ خبر ترجمے کے لئے مجھے دے دیتے۔ جو میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں کر دیا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ میں نے فلمی خبروں کا ایک کام سنبھال لیا۔ بعض دوستوں نے کہا کہ محض خرافات ہوتی ہے لیکن باری صاحب نے کہا: ”جو اس کرتے ہیں۔ تم اب جعفر زاد معنون لکھنے شروع کرو۔“

جعفر زاد معنون تو مجھ سے لکھے نہ گئے۔ لیکن فرانسیسی ناول نگار کی ایک کتاب ناسٹ ڈیز آف کنڈمنڈ ”میری اماری میں ٹپسی مٹی۔ باری صاحب اٹھا کر لے گئے۔ دوسرے روز دوبارہ کے قریب میں ”مساوات“ کے دفتر میں گیا تو کانٹوں سے معلوم ہوا کہ باری صاحب کو سرعام ہو گیا ہے۔ ایک کتاب صبح سے بلند آواز میں پڑھ رہے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد میاں آتے ہیں۔ اور ایک ٹوٹا ٹھنڈے پانی کا سو روٹلا کر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ میں ادھر گیا تو دروازے بند تھے اور وہ خطیبانہ انداز میں انگریزی کی کوئی نہایت ہی زور دار عبارت پڑھ رہے تھے۔ میں نے دھتک دی۔ دروازہ کھلا۔ باری صاحب کو تسبیح پائیے بغیر باہر آئے۔ ہاتھ میں دکن ہوگر کی کتاب تھی۔ اسے میری طرف بڑھا کر انگریزی میں کہا۔

اٹ اٹھو اسے دیری ہوٹ ہوگا اور جب کتاب پڑھنے کی گرمی دودھ ہوئی تو مجھے مشورہ دیا کہ میں اس کا ترجمہ کروں۔“

میں نے کتاب پڑھی۔ لکھنے کا انداز بہت ہی موثر اور خطیبانہ تھا۔ شراب

ہی کو ترجیح کرنے کی کوشش کی۔ مگر نظروں کے سامنے سطریں گزرتی برعکس مہم میں
 ہنگ بھرا کر جتنے کی نئے منہ میں سے کہ اپنی بہن کو ترجمہ سکھوانے کی کوشش کی۔ مگر
 اس میں ناکام رہا تاخیر میں اکیلے بیٹھ کر دس پندرہ دنوں کے اندر اندہ ڈکشنری
 سامنے رکھ کر ساری کتاب کا ترجمہ کر ڈالا۔ باری صاحب نے بہت پسند کیا۔ اس
 کی اصلاح کی۔ اور یسوب حسن مالک اردو بک شال کے پاس تیس روپے میں بکرا
 دیا۔ یسوب حسن نے اسے بہت ہی قلیل عرصے میں چھاپ کر شائع کر دیا۔
 اب میں صاحب کتاب تھا۔

”مسائل؟“ ہند ہو گیا۔ باری صاحب، لاہور کسی اخبار میں چلے گئے بیچے کا
 ہونٹ سٹکا ہو گیا۔ میرے لئے کوئی شغل نہ رہا۔ کھینے کی چاٹ بڑھ گئی تھی۔ لیکن چونکہ
 دو کتنوں سے داد ملتی تھی۔ اس لئے ادھر کوئی ترجمہ نہ دی۔ اب پھر دنیوا بکبار
 کی چیخ تھی۔ جو اذیت تھا۔ مگر اس میں اب وہ پہلا سا لطف اور پہلی سی
 حرارت نہیں تھی۔

ایک دن دارودہ ابراہیم نے غلش کھیلنے کے دوران میں بتایا کہ آغا حشر کرائے
 ہوئے ہیں اور ممتاز کے یہاں سٹہرے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے کہا، کسی روز
 مجھے وہاں لے چلو۔ ابراہیم نے وعدہ تو کر دیا مگر پورا نہ کیا۔ جب میں نے تقاضا کیا
 تو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرایا، ”آغا صاحب لاہور چلے گئے ہیں۔“

میرا ایک دوست تھا بری لکھ، اللہ بخشے خوب آدمی تھا۔ پانچ مکان بیچ کر

دوسرے سارے یورپ کی سیر کر چکا تھا۔ اور ان دنوں چھٹے اور آخری مکان کو آہستہ آہستہ بڑے سینے کے ساتھ کھا رہا تھا۔ فرانس میں صرف چھ بیٹے رہا تھا۔ لیکن فرانسیسی زبان بڑی بے تکلفی سے بول لیتا تھا۔ بہت ہی ڈبلا پیلا، سریل سا انسان تھا مگر بلا کچھ تپلا چرب زبان اور دھانسو یعنی برسنے کی طرح اندر دھنسا جاتا تھا۔ ایک روز میں نے اس سے آغا حشر کا ذکر کیا۔ اس نے فوراً ہی پوچھا: کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا: بہت دیر سے میری خواہش ہے کہ ان کو ایک نظر دیکھوں۔ ہری سنگھ نے فوراً ہی کہا: اس میں کیا مشکل ہے۔ جب سے وہ یہاں امرتسر میں پنڈت مسن کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے، قریب قریب ہر روز صبح اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ میں اچھل چڑا: تو ہری کل شام کو تم مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہری نے اپنا دسکی کا گلاس اپنے پتلے نوٹوں سے لگایا اور بڑی نزاکت سے ایک چوڑا سا گھونٹ بھر کے فرانسیسی زبان میں کچھ کہا۔ جس کا مطلب تھا: ”یقیناً میرے دوست؟“

اور ہری سنگھ دوسرے روز شام کو مجھے آغا حشر کا شمیری کے پاس لے گیا۔ پنڈت مسن جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری پنڈت تھے۔ نام ان کا جاننے کیا تھا۔ مسن ان کا تخلص تھا۔ مشاعروں میں پرانی وقتیا نوی شاعری کے نمونے کے طور پر پیش ہوتے تھے۔ آپ کا اردو باری تعلق کٹھن گھٹیاں کے امرت سبھا سے تھا۔ آغا صاحب سے پنڈت جی کی دوستی معلوم نہیں شاعری کی وجہ سے تھی یا

سینا کی وجہ سے یا کٹرو گھنٹیاں اس کا باعث تھا جس میں امرت سینا اور مختار کا بالاحاقہ بالکل آمنے سامنے تھے بسبب کچھ بھی ہوا، آغا صاحب پنڈت حسن کے ہاں مٹھرے ہوئے تھے اور جیسا کہ مجھے ان کی باہم گفتگو سے پتا چلا، دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔

پنڈت حسن کی بیٹھک یا دفتر کٹرو گھنٹیاں کے پاس پشیم والے بازار سے نکل کر آگے جہاں سبزی کی دکانیں شروع ہوتی ہیں۔ ایک بڑی سی ٹریڈ جی کے اوپر واقع تھا۔ ہری سنگھ آگے تھا میں اس کے پیچھے۔ بیٹھیاں چڑھتے وقت میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں آغا حشر کو دیکھنے والا تھا۔

باہر صحن میں گریسوں پر کچھ آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں تخت پر پنڈت حسن بیٹھے گڑگڑسی پی رہے تھے۔ سب سے پہلے ایک عجیب و غریب آدمی میری نگاہوں سے ٹکرایا۔ جیتتے ہوئے لال رنگ کی چمکدار ساٹن کا لاپا، دو گھوڑے کی بوسکی کی کار والی سفید قیض، کمر پر گہرے نیلے رنگ کا پھند نوں والا آزار بند بڑی بڑی بے سنگم آنکھیں — میں نے سوچا کٹرو گھنٹیاں کا کوئی پیر ہوگا۔ لیکن فوراً ہی کسی نے اس کو آغا صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ مجھے دھکا سا لگا۔

ہری سنگھ نے بڑھ کر اس عجیب و غریب آدمی سے مصافحہ کیا، اور میری طرف اشارہ کر کے اس سے کہا۔ ”میرے دوست سعادت حسن مٹھو۔ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق تھے۔“

آغا صاحب نے اپنی بڑی بڑی بے ہنگم آنکھیں میری طرف گھمائیں اور ہکا کر کہا: "لارڈ مٹو سے کیا رشتہ ہے تمہارا؟"

میں تو جواب نہ دے سکا۔ لیکن ہری سنگھ نے کہا: "آپ مٹو نہیں ہیں مٹو ہیں۔ کشمیری۔"

آغا صاحب نے ایک لمبی اودھکی اور پنڈت حسن سے کشمیریوں کی ان کے متعلق طویل گفتگو شروع کر دی۔ میں بھی کچھ پر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی کو قطعاً آغا صاحب کی اس گفتگو سے دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن وہ بار بار ان سے کہتے تھے: "آغا صاحب! اس کو چھوڑیے یہ بتائیے کہ آپ کب میرے لئے دویریل کا مزاجیئر ڈرلر لے گئے؟" آغا صاحب کو اس مزاجیئر ڈرلر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ گفتگو تو کشمیریوں کی ان کے بارے میں کر رہے تھے۔ مگر ایسا مظلوم ہوتا تھا کہ دماغ کچھ اور ہی سوچ رہا ہے ایک دو بار انہوں نے دورانِ گفتگو میں اپنے نوکر کو موٹی موٹی گالیاں دے کر یاد کیا کہ وہ ابھی تک آبا کیوں نہیں۔

آغا صاحب جب خاموش ہوئے تو پنڈت حسن نے ان سے کہا: "آغا صاحب! اس وقت آپ کی طبیعت موزوں ہے۔ میں کاغذ قلم لاتا ہوں، آپ وہ کوئی سیڑھی، لکھوانا شروع کر دیجئے؟"

آغا صاحب کی ایک آنکھ جیٹکی تھی۔ آپ نے اسے گھما کر کچھ عجیب انداز سے پنڈت جی کی طرف دیکھا۔ "لبے چپ کر۔ آغا حشر کی طبیعت ہر وقت موزوں ہوتی ہے۔"

پنڈت جی خاموش ہو گئے اور اپنی گڑگڑائی گڑگڑانے لگے۔ دفتہ عجیبے عسوس
 ہوا کہ میرا سر چکرا رہا ہے۔ تیز خوشبو کے جبکے آ رہے تھے۔ میں نے دیکھا آغا صاحب
 کے دونوں کانوں میں حلقہ کے چوٹے پھنسے ہوئے تھے۔ اور غائباً سر بھی عطری
 سے چڑا ہوا تھا۔ میں کچھ تو اس تیز خوشبو اور آغا صاحب کے لاپے اور آزار بند کے
 شمع زنگوں میں قریب قریب غرق ہو چکا تھا۔

بازار میں دفتہ ضرور دخل برپا ہوا۔ ایک صاحب نے اٹھ کر یا ہر جہان کا اور
 آغا صاحب سے کہا: "آغا صاحب تشریف لائیے۔ ہندی کا جلوس آ رہا ہے۔"
 آغا صاحب نے کہا: "کہا اس ہے۔ اور حادثہ کربلا پر نہایت ہی تعلق رکھتا ہے۔"
 دینا شروع کر دیا۔ ایسے ایسے نکتے نکالے کہ سب دنگ رہ گئے آخر میں بڑے
 ڈرامائی انداز میں کہا: "دجلے کا منہ بند تھا۔ قرات نکھک پڑی تھی۔ پینے کو پانی کی
 ایک بوتل نہیں تھی۔ ہندی گوندھی کس سے گئی۔ آغا حشر..... اس
 سے آگے کہتے کہتے رک گئے۔ ایک صاحب جو غائباً شیو تھے، جنھل سے اٹھ کر
 چلے گئے۔ آغا صاحب نے موضوع بدل دیا۔

پنڈت حسن کو موقع ملا چنانچہ انہوں نے پھر درخواست کی: "آغا صاحب
 دوریل کی کامیڈی آپ کو کتنی ہو گی؟"

آغا صاحب نے یہ موٹی گالی دینی: "کامیڈی کی..... یہاں ٹیریڈی کی
 باتیں ہو رہی تھیں اور تم اپنی کامیڈی لے آئے ہو، یہ کہہ کر آغا صاحب نے حادثہ کربلا

کناشر سے دو کتابیں

کے بارے میں پھر علامہ انداز میں بحث شروع کر دی۔ کیونکہ وہ جی بھر کے اس موضوع پر اپنی معلومات اور نیالائکات کا اظہار نہیں کر سکے تھے۔ مگر فوراً جانے کیا جی میں آئی کہ ایک دم اپنے نوکر کو گالیاں دینا شروع کر دیں کہ وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں چنانچہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اوصار اوصار کی باتیں شروع ہوئیں۔ کسی نے آغا صاحب سے مولانا ابوالکلام کے تجربہ علم کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اس کا جواب کچھ یوں دیا: ”جی الیہی کے متعلق پوچھتے ہو۔ ہم دونوں اکٹھے امریکی اور عیسائی مبلغوں سے مناظرے کرتے رہے ہیں۔ گھنٹوں پاگلا بھاڑتے تھے عجیب دن تھے وہ بھی!“

یہ کہہ کر آغا صاحب لاپچہ اور آزار بند کے بطر کیلے رنگوں اور کانوں میں اڑے ہوئے چوئے اور سروں میں چڑے ہوئے عطر کی تیز خوشبو سمیٹ جیتے ہوئے دنوں کی یادیں کچھ عرصے کے لئے کھو گئے۔ آپ نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں بند کر لیں جبرئیل آپ نے بنا رکھی تھی۔ اس سے گرا آپ نے دیووں کے پیر دکائی دیتے تھے۔ لیکن ان کا چہرہ بہت ہی بادمب تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھلکے ہوئے پوٹوں کی جھریوں والی پتلی جلد کے نیچے موٹی موٹی کانچ کی گریاں ————— حرکت کر رہی تھیں۔ انہوں نے جب آنکھیں کھولیں تو میں نے سوچا کتنے برسوں کا نشہ ان پر بچھ رہا ہے۔ کس قدر مرضی ان کے ڈوروں میں جذب ہو چکی ہے

آغا صاحب نے پھر کہا: عجیب دن تھو رہا — آزاد ڈھیل کے پیچ لڑانے کا مادی تھالے آنا تھامو کیونچ کے پیچ لڑانے میں ایک ہتھ مارا۔ اور پٹاکاٹ یا عریف منہ دیکھتے رہ گئے۔ ایک دفعہ آزاد بہت بُری طرح گھبر گیا۔ سب بد چار نہایت ہی بہت دھرم عیسائی مشینوں سے تھا۔ میں پہنچا تو آزاد کی جان میں جان آئی۔ اس نے ان مشینوں کو سبے حوالے کیا۔ میں نے دو تین ایسے رنگے دیئے کہ بوکھلا گئے۔ میدان ہمارے ہاتھ میں رہا۔ لیکن میرا حلق سوکھ گیا۔ قیامت کی گرمی تھی مسجد دودھ بنی ہوئی تھی۔ میں نے آزاد سے کہا: وہ بقتل کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا: میری جیب میں ہے۔ میں۔ کہا خدا کے لئے چلو۔ میرا حلق سوکھ کے کھڑی ہو گیا ہے؟ دور جانے کی تار۔ نہیں تھی۔ وہیں مسجد میں ایک محل خانے کے اندر جھک مارنی پڑی۔

استغفر میں آغا صاحب کا نوکر آگیا۔ آغا صاحب نے اپنے مضمون تیار میں اس کو گایا دیں اور وجہ پوچھی کہ اس نے اتنی دیر کیوں کی۔ نوکر نے جو گایا کہ مادی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بنڈل نکالا اور کھول کر آگے بڑھایا۔ اسی چیر لایا۔ ہل کر آپ کی طبیعت خوش ہو جائے۔

آغا صاحب نے کھلا ہوا بنڈل ہاتھ میں لیا۔ شریخ دنگ کے چار ڈار بند تھے آغا صاحب نے ایک نظر ان کو دیکھا اور انھوں کو بہت ہی خوفناک انداز میں اوپر اٹھا کر اپنے نوکر پر گرے۔ یہ چیر لایا ہے تو۔۔۔۔۔ ایسے واہیات ازار بند

آغا حشر سے دو طاق تائیں

تو س شہر کے کھڑے بھی نہیں پہنتے : یہ کہہ کر انہوں نے ہنڈل فرش پر دے مارا۔
کچھ دیر زکر پر برسے، پھر جیب سے غائباً دو تین ہزار روپے کے نوٹ نکالے اور
اسے حکم دیا۔ ”جاؤ، پان لاؤ :“

پنڈت عمن نے گڑگڑی ایک حرف رکھی اور کہا۔ ”نہیں نہیں آغا صاحب،
میں شگرتا ہوں :“

آغا صاحب نے سب نوٹ تلاش جینوں کے انداز میں اپنی جیب میں رکھے
اور کہا۔ ”جاؤ تیارے پاس کچھ باقی بچا ہوا ہے :“
نوکر جلنے لگا تو انہوں نے اسے روکا۔ ”ٹھہرو۔۔۔ وہاں سے پتا بھی پہنتے
کو کر وہ ابھی تک کیوں نہیں آئیں :“

نوکر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سیڑھیوں کی جانب سے جکی سی جھلک آئی پھر
ریشمیں سرسریٹھیں سنائی دیں۔ آغا صاحب کا چہرہ بٹاش ہو گیا۔ متار
جو ہرگز ہرگز حسین نہیں تھی، خوش وضع کپڑوں میں عبوس عمن میں داخل ہوئی۔
آغا صاحب اور عاصیہ کو نیلیمات عمن کی اور اندہ گھر سے میں چلی گئی، آغا صاحب
کی آنکھیں اس کو وہاں تک چوڑے گئیں۔

استخے میں پان آگئے۔ جو اخبار کے کاغذ میں پٹے ہوئے تھے۔ نوکر اندر چلا تو
آغا صاحب نے کہا۔ ”کاغذ پھینکنا نہیں سبھال کے رکھنا :“

میں نے ایک دم حیرت سے پوچھا۔ ”آپ اس کاغذ کو کیا کریں گے آغا صاحب؟“

آغا صاحب نے جواب دیا: پڑھوں گا۔ چپے ہوئے کا غذا کوئی بھی کھڑا ہو
بچے بلا ہے میں نے ضرور چڑھا ہے! یہ کہہ کر وہ اٹھے: معافی چاہتا ہوں اندر ایک
مشق میرا انتظار کر رہا ہے۔

پنڈت عمن نے گرد گزری اٹھائی اور اسے گرد گزائے گئے۔ میں اور ہری سنگھ
تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے چل دیے۔

میں کئی دنوں تک اس ملاقات پر غور کرتا رہا۔ آغا صاحب عجیب و غریب ہزار
پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے ان کے چند دھڑاھے پڑھے جو اعلیٰ طاسے
پڑتے اور نہایت ہی ادنیٰ کا قدر پر چپے ہوئے تھے۔ جہاں جہاں کو میدی آتی تھی
وہاں پکڑ پکڑن مٹاتا۔ ڈرامائی مقاموں پر مقابلہ بہت ہی زوردار تھا۔ بعض اشعار
سوتیلے تھے، بعض نہایت ہی لطیف۔ سب سے پُر لطف بات یہ ہے کہ ان ڈراموں
کا موضوع طوائف تھا۔ جن میں آغا صاحب نے اس کے وجود کو سوسائٹی کے
حق میں ترشہ بہت کیا تھا۔ . . . اور آغا صاحب عمر کے اس آخری حصے میں شراب
چھوڑ کر ایک طوائف سے بہت پڑ جو عشق فرما رہے تھے۔ پنڈت عمن
سے ایک دفعہ ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا: عشق کے تعلق تو میں نہیں جانتا
لیکن ترک شراب خوشی بہت جلد ان کو لے کرے گی!

آغا صاحب تو کچھ دیر زندہ رہے۔ لیکن پنڈت عمن یہ فرمانے کے تقریباً ایک
ماہ بعد اس دنیا سے چلے گئے۔

میں تھے اب مختلف اخباروں میں کتنا شروع کر دیا۔ چند ہفتے گزر گئے۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ آغا حشر لاہور میں 'رستم و سہراب' نام کی ایک فلم بنا رہے ہیں جس کی تیاری پر دو ہفتہ پانی کی طرح بہا یا جا رہا ہے۔ اس فلم کی ہیر و حق جیسا کہ ظاہر ہے متنازعہ تھی۔

اسے دوسرے لاہور صرف ایک 'نقشے' کا سفر تھا۔ آغا صاحب سے پھر ملنے کو جی تو بہت چاہتا تھا مگر غلط معلوم ایسی کون سی رکاوٹ تھی کہ لاہور جانا ہی نہ ہو سکا۔

بہت دنوں کے بعد باری صاحب نے بلایا تو میں لاہور گیا۔ وہاں پہنچ کر کچھ ایسا شغول ہوا کہ آغا صاحب کو بھول ہی گیا۔ شام کے قریب ہم نے سوچا کہ چلو ارد گرد بکسٹل چلیں چنانچہ میں اور باری صاحب دونوں عرب ہوٹل سے چائے پی کر ادھر روانہ ہوئے ارد گرد بکسٹل پہنچے تو میں نے دیکھا آغا صاحب میسج کی میز کے پاس کرسی پر بیٹھے ہیں میں نے باری صاحب کو بتایا کہ آغا حشر ہیں۔ انہوں نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ یہ ہیں آغا حشر باری! آغا صاحب کا لباس اسی قسم کا تھا جسید بوسکی کی قمیض، گہرے نیلے رنگ کا ریشمی لاجپا۔ سر سے نئے بیٹھے ایک کتاب کی روٹی گردانی کر رہے تھے۔ پاس پہنچا تو ایک دم میرا دل دھڑکنے لگا کیونکہ آغا صاحب کے ہاتھ میں میری تحریر کی ہوئی کتاب 'مرکز شہت' ایسز تھی۔

یہ صوبہ نے اٹھ کر میرا اور باری کا آغا حشر سے تعارف کرایا اور کہا: یہ کتاب جو آپ دیکھ رہے ہیں مسٹر منٹو کی تحریر کی ہوئی ہے؟ آغا صاحب نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا میرا خیال تھا کہ وہ مجھے پہچان لیں گے۔ میسج

انہوں نے مجھے دیکھنے کے بعد کتاب کے چند اوراق پلٹے اور کہا: "کیسا کھٹے والا ہے وکٹر ہیوگر؟"

باری صاحب نے جواب دیا: "فرانسیسی ادب میں وکٹر ہیوگر کا رتبہ بہت بلند ہے۔"

آغا صاحب ورق پلٹتے رہے۔ "ڈراماٹ تھا؟"

اب کی بار پھر باری صاحب نے جواب دیا: "ڈراماٹ بھی تھا۔"

آغا صاحب نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

باری صاحب نے انہیں بتایا: "وگٹر ہیوگر اصل میں شاعر تھا، غرض کی رعایت تحریک کا نام۔ اس نے ڈرامے اور ناول بھی لکھے، ایک ناول مصیبت زدہ آتما مشہور ہوا، کہ اس کی شاعری کو لوگ جھوٹ گئے اور اسے ناولسٹ کی حیثیت سے جاننے لگے! آغا صاحب یہ معلومات بڑی دلچسپی سے سنتے رہے، آخر میں انہوں نے میسرے سے کہا: "سرگزشت ایسٹرن بھی ان کتابوں میں شامل کر لی جائے جو وہ خرید رہے تھے میں بہت خوش ہوا۔"

اس کے بعد باری صاحب سے باتیں کرتے کرتے اٹھے اور اندر شوروم میں چلے گئے۔ باری صاحب کی گفتگو سے آغا صاحب متاثر ہوئے تھے، چنانچہ انہوں نے باری صاحب کی سفارش پر کئی کتابیں خریدیں۔ اس دوران میں باری صاحب نے ان سے کہا: "آغا صاحب آپ ہندوستانی ڈرامے کی تاریخ کیوں نہیں لکھتے ایسی

کتاب کی اشد ضرورت ہے ؟

آغا صاحب نے جواب دیا : ایسی کتاب صرف آغا حشر ہی لکھ سکتا ہے اس کا ارادہ میں تھا، مگر وہ کم بخت آج کل قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے ۔ اس کے دروازے پر موت دستک دے رہی ہے ۔

میں نے ان سے پوچھا : آغا صاحب، آپ کے ڈرامے جو بازار میں جکتے ہیں : میں نے ابھی رہنا جلد پورا بھی نہ کیا تھا کہ آغا صاحب نے بلند آواز میں کہا :۔
”لا حول ولا... آغا حشر کے ڈرامے اور... سے چیتروں پر چھپیں ۔۔۔ بغیر اجازت کے، ادھر ادھر سے سن سنا کر چھاپ دیتے ہیں ؟ اس کے بعد انہوں نے بہت ہی موٹی گالی ان پیشروں کو دی۔ جنہوں نے ان کے ڈرامے چھاپے تھے۔

میں نے ان سے کہا : ”آپ ان پر دھڑکیں دائر کیوں نہیں کرتے ؟“
آغا صاحب ہنسے : ”کیا وصول کروں گا۔ ان ٹٹ پرنسیوں سے ؟“
بات درست تھی : میں خاموش ہو گیا۔

آغا صاحب نے باہر آکر میسوب سے بل طلب کیا اور حیب سے تقاضا نہیں کے انداز میں تین چار ہزار روپے کے بالکل نئے نوٹ نکالے۔ ان دنوں دس دس اور پانچ پانچ کے نئے نوٹ نکلتے تھے جو پہلے نوٹوں کی بہ نسبت چھوٹے تھے۔۔۔
آغا صاحب نے بتایا کہ چیک کیش کرانے کے لئے جب بنک گئے تو وقت بوجھتا تھا۔
آپ نے کوک سے کہا : ”آغا حشر کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا۔ جلد ہی چیک کیش کرادو“

اکرمک کرجب معلوم ہوا کہ آغا حشر ہیں تو روہ بھاگتا ہوا بینچر کے پاس گیا۔ فوراً ہی بینچر دوڑا دوڑا ان کے پاس آیا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ نئے نوٹ منگوا کر اس نے بڑے ادب سے آغا صاحب کو پیش کیئے اور کہا "میں آپ کی اور کوئی میوا تو نہیں کر سکتا۔ یہ نئے نوٹ آئے ہیں، سب سے پہلے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

باری صاحب نے ایک نوٹ آغا حشر صاحب سے لیا اور اس کو انگلیوں میں پکڑ کر کہا: "آغا صاحب گرفت کچھ کم ہو گئی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی۔" آغا صاحب نے اسی فقرے کی بہت داد دی: "خوب بہت خوب۔۔۔۔۔۔" گرفت کچھ کم ہو گئی ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح حکومت کی۔ میں ڈرانے میں اسے ضرور استعمال کروں گا۔"

باری صاحب بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں وہ نوکر آیا وہی جو پنڈت من کے دفتر میں ازار بند لایا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چار قند حارمی اندر تھے آغا صاحب نے ایک انار بیا ناک بیجوں چڑھا کر گالی دی۔ نہایت ہی دابھیت اندر میں: "نوکر نے پوچھا: واپس کر آؤں؟"

آغا صاحب بولے: "نہیں بے۔ تو کھائے۔ اس کے بعد انہوں نے ایک وزن ہار گالی دھکا دی۔"

آغا صاحب جانے لگے تو میں نے آؤ گرات تک نکال کر ان کے دستخط لٹے۔

آغا صاحب جب کانپتے ہوئے اٹھتے اپنا نام کھچکے تو کہا: ”ایک زمانے کے بعد میں نے یہ چند حرف لکھے ہیں۔“

میں امرتسر چلا آیا، کچھ عرصے کے بعد یہ خبر آئی کہ لاہور میں مختلف حالات کے بعد آغا حشر کا شمیری کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے کے ساتھ گنتی کے چند آدمی تھے دنیویا لعلو کہا رکی بیٹھک پر جب آغا صاحب کی موت کا ذکر ہوا تو اس نے نال کے پیسے نکال کر اپنی مالی دار ٹرنپی میں رکھتے ہوئے بڑے ہی غصیانہ انداز میں کہا: ”بڑھاپے کا شوق بہت خالص ہوتا ہے۔“

آغا حشر کی

اختر شیرانی سے چند ملاقاتیں

خدا معلوم کتنے برس گزر چکے ہیں۔ حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ نام، بسن اور تاریخ کبھی یاد ہی نہیں رہتے۔ امرتسر میں غازی عبدالرحمن صاحب نے ایک روزانہ ہرچہ مساوات جاری کیا۔ اس کی ادارت کے لئے باری عیگ (مرحوم) اور ابراہیم احمد چشتی (مصطفیٰ حاجی حق) بلائے گئے۔ ان دنوں میری آوارہ گردی سراج پرستی بے مقصد سارا دن گھومتا رہتا تھا۔ دماغ بے مد منتشر تھا۔ اس وقت قریم نے موس نہیں کیا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دماغی انتشار میرے لئے کوئی راستہ تلاش کرنے کے لئے بے تاب تھا۔

جیسے کہ برٹل (شیراز) میں قریب قریب ہر روز گپ باری کی محفل جیتی تھی۔ بالا، انور پٹیل، عاشق نور، ڈیو، فریقہ حسین، سلیس اور ایک صاحب جن کا

نام میں بھول گیا ہوں۔ باقاعدگی کے ساتھ اس فصل میں شریک ہوتے تھے۔ ہر قسم کے روضہ
نیر بہت لائے جاتے تھے۔ بالآخر غرض مگر اور پڑا کسے نوجوان مست
اگر وہ غیر حاضر ہوتا تو فصل سوتی رہتی۔ شعر بھی کہتا تھا۔ اس کا ایک شعر
ابھی تک مجھے یاد ہے۔

اشک شرکوں پر ہے اک سا گیا

نوک سی چھ گئی ہے جہاں میں

بچے سے لے کر اور پندرہ سب موسیقی اور شامی سے شغف
رکھتے تھے۔ وہ صاحب جن کا نام میں بھول گیا تھا۔ کیپٹن وحید تھے نیلی
نیلی آنکھوں والے سبے تڑنگے۔ مضبوط جسم۔ آپ کا محبوب مشعل گروہل سے
لڑتا تھا۔ چنانچہ کئی گورے ان کے ہاتھوں پٹ چکے تھے۔ اگر نیلی بہت
اچھی ہوتے تھے اور طبلہ ماہر بلبلہ کی طرح بجاتے تھے۔

ان دنوں جج کے ہوٹل میں ایک شاعر اختر شیرانی کا بہت چرچا تھا۔
قریب قریب ہر فصل میں اس کے اشعار پڑھے یا گائے جاتے تھے جیجا عزیز، عام
طور پر ہمیں اپنے عشق میں سب کچھ تباہ کر دے گا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ مصرع
خط ہو گا یا کرتا تھا۔ نئے قسم کا جذبہ سب کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا۔ مشرق
کو جو دھکی دی گئی تھی سب کو بہت پسند آئی تھی۔

جیجا تر اختر شیرانی کا دیوانہ تھا۔ کائنات کے پاس کھڑا کہ جس سے بل و سول کر

راہے اور گلخارا ہے: "اے عشق کہیں لے چل"۔ مسافروں کو کمرے دکھا رہا ہے اور ذریعہ گارہ ہے: "کیا بگڑ جائے گا رہ جاؤ یہیں رات کی رات"۔
 عاشق فخر گزرائی کی آواز گو بہت پیلی تھی۔ لیکن وہ اے عشق کہیں لے چل"
 بڑے سڑ سے گھایا کرتا تھا میں نے جب بھی اس کے منہ سے یہ نظم سنی، مجھ پر بہت اثر
 ہوا۔ اس زمانے میں چونکہ طبیعت میں انتشار تھا۔ اس لئے یہ نظم مجھے اپنے کتہوں
 پر اٹھا کر دیکھ۔ بہت دُور اُن دیکھے عزیزوں میں لے جاتی تھی۔

اتنا دانا بیت چکا ہے مگر وہ کیفیت جو اس وقت مجھ پر طاری ہوتی تھی میں
 اب بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ عجیب و غریب کیفیت تھی۔ بیچے کے ہٹل کے بہت
 اندر اندر میری گزشتہ زندگی کو نظری میں بیٹھا میں یوں محسوس کرتا کشتی میں بیٹھا ہوں۔
 پر میں اسے کہے رہی ہیں۔ نازک پردوں والی۔ پر میں۔ رات کا وقت ہے اس
 لئے مجھے ان پردوں کا صرف سایا سا نظر آتا ہے۔ سمندر پر سکون ہے۔ کشتی ہلکے
 کھائے بغیر چل رہی ہے۔ کسی نامعلوم منزل کی طرف۔ پاؤں کی بستی بہت پیچھے رہ
 گئی ہے۔ ہم دینیوی شور و غل سے ہزاروں میل آگے بڑھ گئے ہیں۔

بیچے کے ہٹل میں کچھ عرصے کے بعد باری صاحب اور چشتی صاحب کا آنا جانا
 بھی شروع ہو گیا۔ دونوں کھانا کھاتے یا چائے پیتے اور چلے جاتے۔ مگر جب بیچے کو
 معلوم ہوا کہ وہ اخباری آدمی ہیں تو فوراً ان سے بے تکلف مراسم پیدا کر لیے۔

باری صاحب اختر شیرانی کے کلام سے واقف تھے لیکن ذاتی طور پر شاعر کو نہ

جانتے تھے چشتی صاحب ایک مدت کے بعد بغداد اور مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد تازہ آثار واپس آئے تھے۔ اس لئے وہ یہاں کے شرار کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے۔ پھر بھی جب انہوں نے مجھے سے اختر شیرانی کا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔

اس دوران میں باری صاحب کے ساتھ مکمل مل گیا۔ اُن کی سنجیدگی اور ثبات بھری طرافت مجھے بہت پسند آئی۔ میرے ذہنی اخبار کو بھانپ کر انہوں نے مجھے صحافت کی طرف مائل کیا۔ آہستہ آہستہ ادب سے روشناس کرایا۔ پہلے میں تیرتھ رام فیروز پوری کے مائل پڑھا کرتا تھا۔ اب باری صاحب کی وجہ سے اسکروائلڈ اور وکٹر یوگرسے زیر مطالعہ رہنے لگے۔ جو کہ مجھے بہت پسند آیا۔ بعد میں میں نے محسوس کیا کہ اس فرانسیسی مصنف کا خلیبانہ انداز باری صاحب کی تحریروں میں موجود ہے۔ آج کل میں جو کچھ بھی ہوں۔ اس کو بتانے میں صبر سے پہلا ہاتھ باری صاحب کا ہے۔ اگر امرتسر میں اُن سے ملاقات نہ ہوتی اور متواتر تین مہینے میں نے اُن کی صحبت میں نہ گزارے ہوتے تو یقیناً میں کسی اور ہی راستے پر گامزن ہوتا۔

چونکہ اب میں کسی حد تک ادب سے روشناس ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے اختر شیرانی کے کلام کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا شروع کیا۔ اس کی شاعری ابھی پھٹکی اور مدافعی تھی۔ میں اب غور کرتا ہوں تو اختر شیرانی مجھے کالج کے لڑکوں کا شاعر معلوم ہوتا ہے۔ ایک خاص عمر کے نوجوانوں کا شاعر، جن کے دل و دماغ

پر ہر وقت روانہ کی کڑی نہیں نہیں جالے تھی رہتی ہے۔ مجھے اس وادہ میں قدم رکھے زیادہ دیر نہ ہوئی تھی کہ ایک دوست سے معلوم ہوا، اختر شیرانی آئے ہوئے ہیں اور شیرازہ ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ اسی وقت وہاں پہنچا مگر معلوم ہوا کہ وہ مجھ کے ساتھ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیر تک ہوٹل میں بیٹھا انتظار کرتا رہا، مگر یہ لوگ واپس نہ آئے۔

شام کو پہنچا تو ہوٹل کے مندرجہ بالا درجی نے کہا کہ سب اوپر کونٹے پر بیٹھے ہیں۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں اوپر گیا۔ چڑکے دھڑکے چارپائیاں بچائی گئی تھیں۔ کچھ کرسیاں بھی تھیں۔ ویسی شراب کا درد چل رہا تھا۔ دس بارہ آدمی بیٹھے تھے جو میرے جانے پہچانے تھے۔ صرف ایک صورت اجنبی تھی اور وہ اختر شیرانی کی تھی چپٹا چہرہ، سپاٹ پیشانی، موٹی ناک، موٹے ہونٹ، گہرا سانولا رنگ چھترے بال، آنکھیں بڑی بڑی اور پگڑشش، ان میں تھوڑی سی اداسی بھی تھی۔ بڑی شستہ و رفتہ آدمیوں میں حاضرین سے گفتگو کر رہے تھے۔

میں پاس پہنچا تو باتے نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ بڑی خندہ پیشانی سے ہمیش آئے۔ اور مجھ سے بیٹھے کے لئے کہا۔ میں چارپائی کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اختر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے: عزیز زمیری طرف اشارہ کر کے (ان کے لئے گلاس منگواؤ۔

گلاس آیا تو اختر صاحب نے مجھے ایک پیگ بنا کر دیا جو میں نے مشکریے

کے ساتھ قبول کیا۔ دو تین دور ہوئے تو کسی نے اختر صاحب سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی اس پر انہوں نے کہا: "نہیں بھائی میں کچھ نہیں سناؤں گا۔ میں سنوں گا۔" پھر جیسے مخاطب ہوئے: "عزیز سناؤ"۔ رسیل انکھڑوں سے تندرہ مارتے ہوئے آئے یہ کہا اور ایک ٹھنڈا سانس دیا۔ جیسے پیتے ہوئے محلات یاد آگئے ہیں۔ جیسے کراٹکار نہیں تھی۔ گلا صاف کیا اور اختر صاحب کی ایک مشہور غزل گانا شروع کر دی۔ سرتال سب ٹھیک۔ مگر آواز پیٹی پیٹی سی سی تھی۔ پھر بھی رنگ جم گیا۔ اختر صاحب پیتے پیتے سہ اور جھومتے رہے۔

دوسرے روز دوپہر کے وقت میں شیراز ہوٹل میں بیٹھا اختر صاحب کا انتظار کر رہا تھا کہ کسی دعوت پر مدگئے تھے کہ ایک برقعہ پوش خاتون مانگے میں آئیں آپ نے ایک دم سے اختر صاحب کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا کہ میں بلبر تشریف لے گئے ہیں آپ اپنا نام بتا دیجئے۔ برقعہ پوش خاتون نے اپنا نام نہ بتایا اور چلی گئی۔

اختر صاحب آئے تو میں نے اس خاتون کی آمد کا ذکر کیا۔ آپ نے بڑی شاعرانہ دلچسپی سے ساری بات سنی اور مسکرا دیئے۔ یوں وہ خاتون ایک امرائین لگئی۔ کھانا کھانے سے پہلے شام کو جب ٹہرے کا دور شروع ہوا۔ تو جیسے نے اس برقعہ پوش خاتون کے منتقلی اختر صاحب سے پوچھا: "حضرت وہ کون تھیں جو آج دوپہر کو تشریف لائی تھیں۔"

اختر صاحب مسکرائے اور جواب گول کر گئے۔ بالے نے ان سے کہا: کہیں
سنی صاحبہ تو نہیں تھیں؟

اختر صاحبہ نے ہولے سے ہاتھ کے گال پر ٹانچہ مارا اور صرف اتنا کہا
شریہ۔ بات اور بھی زیادہ پڑا سر ہر ہو گئی۔ جو آج تک صیفہ ناز میں ہے معلوم
نہیں وہ برقعہ پوش خاتون کون تھیں۔ اس زمانے میں صرف اتنا معلوم ہوا تھا کہ اختر
صاحب کے جانے کے بعد وہ ایک بار پھر شیراز ہوٹل آئی تھی اور اختر صاحب
کے بارے میں اس نے پوچھا کہ کہاں ہیں۔

سب باری باری اختر صاحب کی دعوت کو چکے خنے۔ وہیں شیراز ہوٹل
میں۔ دولت دینے کا یہ طریقہ تھا کہ دن اور رات میں ٹوکے کی عین بوتلیں ختم ہوں۔
ان کے دام ادا کر دیئے جائیں۔ میں نے یہ طریقہ بھونڈا سمجھا اور دو بوتلیں اسکا
دنگی کی لے کر ایک شام وہاں پہنچا۔ ایک بوتل پر سے کاغذ بٹایا۔ تو
اختر صاحب نے کہا: بھائی، یہ تم نے کیا کیا۔ ویسی شراب ٹھیک رہتی۔ ایک
کے بدلے دو آجائیں۔

میں نے عرض کی: اختر صاحب۔ یہ ختم ہو جائے تو دوسری موجود ہے؟
اختر صاحب مسکرائے: وہ ختم ہو گئی تو
میں نے کہا: اور آجائے گی؟

آپ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”زندہ رہو۔“

دنوں تو نہیں ختم ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اختر صاحب اسکاچ سے مطمئن نہیں تھے۔ چنانچہ ملازم سے امر تسرڈ مشنری کے کشید کردہ خطرے کی ایک برقی شگوائی۔ اس نے اختر صاحب کے نشے میں جو خالی جگہیں تھیں پُر کر دیں۔

چونکہ یہ غفلیں خالص الہی نہیں تھیں اور ان کے پیچھے صرف وہ عقیدت تھی جو ان لوگوں کو اختر صاحب سے تھی۔ اس لیے زیادہ تر ان ہی کا کلام پڑھا یا گایا جاتا۔ مشرود سخن کے متعلق کوئی بصیرت افزا بات نہ ہوتی، لیکن اختر صاحب کی گفتگوؤں سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اردو شاعری پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔

چند روز کے بعد میں نے گھر پر اختر صاحب کی دعوت کی، مگر یہ صرف چاء کی تھی جس سے اختر صاحب جیسے زندہ بانوش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن انہوں نے قبول کی اور میری خاطر ایک پیالی چائے بھی پی۔

ان محفلوں میں باری صاحب بہت کم شریک ہوتے۔ البتہ چشتی صاحب جو بچنے کے معاملے میں اختر صاحب سے بھی چند بیگ آگے ہی تھے، اکثر ان محفلوں میں شریک ہوتے اور اپنا کلام بھی ساتھ جو عام طور پر بچے روح ہوتا تھا۔

اختر صاحب غالباً دس دن امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں جیسے کے بہم اصرار پر آپ نے شیرازہ بڑل پر ایک نظم کہی، جیسے نے اسے باری صاحب کی دستاویز سے بڑل کاغذ پر خوشخط لکھوایا اور قریم میں جڑوا کر اپنے بڑل کی زینت بنایا۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ نظم میں اُس کا نام موجود تھا۔

اختر صاحب چلے گئے ترجمے کے ہوٹل کی رونق غائب ہو گئی۔ باری صاحب نے اب میرے گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ میرا شراب پینا ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ شک و غلط نہیں تھے۔ اشاروں ہی اشاروں میں کئی دفعہ مجھے اس عفت سے باز رہنے کے لئے کہا، مگر میں باز نہ آیا۔

باری صاحب تین بیٹے امرتسر میں رہے۔ اس دوران میں انہوں نے مجھ سے دو کتابوں کی ایک کتاب منگوا کر پیش کی۔ نام سے ترجمہ کرائی، جب وہ چھپ کر پریس سے باہر آئی، تو آپ لاہور میں تھے۔ میں نے بنی خد کتاب دیکھی، تو اس کا سٹ پیدا ہوئی کہ اور ترجمہ کروں۔ چنانچہ میں نے آسکر وائلڈ کے اس شاعر کی ڈرامے دیو کا ترجمہ شروع کر دیا، جب ختم ہوا تو باری صاحب کو اصلاح کے لئے دیا مگر مصیبت یہ تھی کہ وہ میسروری تحریروں میں بہت ہی کم کانٹ بھانٹ کرتے تھے، زبان کی کئی غلطیاں رہ جاتی تھیں۔ جب کوئی ان کی طرف اشارہ کرتا تو مجھے بہت بے کوفت ہوتی چنانچہ میں نے سوچا کہ باری صاحب کے بعد اختر صاحب کو ترجمے کا مسودہ دکھاؤں گا۔

عرب ہوٹل میں آنے جانے سے متفرح حسین شمیم صاحب سے اچھے خاصے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ میں نے ان سے اصلاح کی بات کی تو وہ مجھے اسی وقت اختر شیرانی صاحب کے پاس لے گئے چوٹا سا غلیظ کمرو تھا۔ آپ چارپائی پر تکیے بیٹنے کے ساتھ دبائے بیٹھے تھے۔ ایک سبک ہوئی، اختر صاحب بچے

مجھے فرشتے

پہچان گئے — یاہان شیراز ہسٹل کے بارے میں پوچھا۔ جو کچھ مجھے معلوم تھا میں نے ان کو بتا دیا۔

شیم صاحب اور اختر صاحب کی گفتگو بہت پر تمشع اور پر تکلف تھی حالانکہ مجھ سے کسی شخص نے کہا تھا کہ وہ دونوں کسی زمانے میں ایک جانی و دوہ قالب تھے بہر حال شیم صاحب نے میرے آنے کا مدعا بیان کیا۔ اختر صاحب نے کہا: میں حاضر ہوں، آج رات ہی سارا سوادہ دیکھ لوں گا:

اختر صاحب نے بیسے کے ساتھ حکمت اس لیے دہلایا تھا تھا کہ ان کے جگر میں تھوڑے تھوڑے دفتے کے بدٹیس سی اٹھی تھی۔ اس زمانے ہی میں ان کا جگر قریب قریب ماڈرن ہو چکا تھا — میں نے ان سے رخصت لی اور شام کو حاضر ہونے کا کہہ کر شیم صاحب کے ساتھ واپس عرب ہسٹل چلا آیا۔ انہوں نے مجھ سے اشارتاً کہا کہ اگر تم اختر سے اپنا کام جلدی کرنا چاہتے ہو تو ساتھ وہ چیز لیتے جانا۔

میں جب شام کو اختر صاحب کے پاس پہنچا تو وہ چیز میرے پاس موجود تھی جو میں نے بڑے سلیطے سے پیش کی۔ بوتل ڈرتے ڈرتے باہر نکالی اور اس سے کہا: ”یہ یہاں اس کی اجازت ہے صاف کیجئے گا یہ پوچھنا ہی بڑی بدتمیزی ہے۔“

اختر صاحب کی آنکھیں تھما اٹھیں، میرا خیال ہے وہ صبح کے پایا سے تھے۔ مسکرائے اور میرے سرو پر بڑی شفقت سے اتھ پیرا: ”شراب پینا کوئی بدتمیزی نہیں: یہ کہہ کر بوتل میرے اتھ سے لی اور کچھ فرش پر رکھ کر اس پر بوتل کا نچا جھٹ

شوکتنا شروع کیا۔ تاکہ کارک باہر نکل آئے ۔

ان دنوں چتا تھا گھر میں کبھی کوڑیا وہ پنی نہیں سکتا تھا۔ چارگیب کافی تھے مقدس سے اگر ڈیرہ جاتی۔ تربیت خراب ہو جاتی اور سارا لطف غارت ہو جاتا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور پیتے کافی دیر ہو گئی۔ اختر صاحب کا کھانا آیا اور جس طریقے سے آیا اس سے میں نے یہ جانا کہ ان کے گھروالوں کے تعلقات ان سے کثیدہ ہیں۔ بعد میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ان کے والد محرم حافظ محمود شیرانی صاحب (موجودہ وزیر) ان کی شراب نوشی کے باعث بہت نالاں تھے۔ شک بار کر انہوں نے اختر صاحب کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

رات زیادہ گزر گئی تو میں نے اختر صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسودہ دیکھنا شروع کر دیں۔ آپ نے یہ درخواست قبول کی اور مسودے کی اصلاح شروع کر دی۔ چند صفحات دیکھے تو اسکو وائلڈ کی رنگین زندگی کی باتیں شروع کر دیں جو غالباً انہوں نے کسی اور سے سنی تھیں۔ اسکو وائلڈ اور لارڈ ایفرڈ ڈگلس کے مہاشے کا ذکر آپ نے بڑے مزے سے لے لے کر بیان کیا۔ وائلڈ کیسے قید ہوا یہ بھی بتایا پھر ان کا ذہن ایک دم لارڈ بائرن کی طرف چلا گیا۔ اس شاعر کی ادا انہیں پسند تھی اس کے مہاشے جو کہ لاتعداد تھے اختر صاحب کی نگاہوں میں ایک جہاں گانہ شان رکھتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ لارڈ بائرن کے نام سے انہوں نے کئی غزلیں

اور نظمیں بھی لکھی تھیں ۔

لارڈ بائرن ایک سنگدل بے رحم اور بے پروا انسان تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ہیٹ بڑا فوٹاب تھا جس کے پاس دولت تھی۔ اختر صاحب تلاش تھے بڑے رحم دل اور انسانیت دوست۔ بائرن کو بڑھیا سے بڑھیا شراب پیسرخن، اختر کو بشکل محظوظ تھا۔ بائرن کے ملک کی فضا اور تھی، اختر کے ملک کی فضا اور وہ کسی صورت میں بھی لارڈ بائرن نہیں بن سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے دل کی تسکین کیلئے دو مشوق اختر کا کر لیے تھے۔ سلمیٰ اور خدیجا ۔

سلمیٰ کے تعلق کی کہانیاں مشہور ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ سلمیٰ حقیقتاً کوئی سلمیٰ تھی۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو مگر جو سلمیٰ ہیں اختر کے کلام میں نظر آتی ہے یکسر تخیلی ہے۔ اس کا رجم اس قدر شفاف ہے کہ صاف ایترونی معلوم ہوتا ہے ایک اور بات بھی ہے۔ اگر سلمیٰ کوئی گوشت پرست کی زندہ عورت ہوتی تو شاید اس سے اتنی دلہانہ محبت کہیں نہ کرتا۔ مگر چونکہ وہ اس کی اپنی تخیلی خلق تھی۔ اس لئے وہ اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا ۔

لارڈ بائرن کی باتیں سنتے سنتے مجھے نیند آگئی اور وہی سو گیا۔ صبح اٹھا۔ تو دیکھا۔ اختر صاحب فرش پر بیٹھے مسودہ دیکھنے میں مصروف ہیں۔ بوتل میں تھوڑی سی بچی ہوئی بڑبڑاتی تھی۔ یہ آپ نے پی اور آخری صفحات دیکھ کر مسودہ میرے حوالے کیا اور کہا۔ ترجمہ بہت اچھا ہے کہیں کہیں زبان کی غلطیاں تھیں۔ وہ میں نے درست

کر دی ہیں :

میں سے مناسب و موزوں الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کیا اور امرتسر روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد میں جب کبھی لاہور جاتا، اختر صاحب کے نیاز ضرور حاصل کرتا۔ ایک بار گیا تو دیکھا کہ آپ کے سر پر ٹپیاں بندھی بندھی ہیں، ان سے دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا، مجھے تو قطعاً یاد نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کل رات میں نے مانگے میں سوار ہونے کی کوشش کی مگر گر پڑا اور چوڑیں اس وجہ سے آئیں۔

اختر صاحب کی اپنی ذات کے بارے میں یہ صاف گوئی مجھے بہت پسند آئی۔

بعض اوقات وہ بالکل بچہ بن جاتے تھے۔ ان کی گفتگو اور حرکات بالکل بچوں کی سی ہوتیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ بچہ بن کر وہ بچکانہ قسم ہی کی مسرت عکس کر دیتے۔ کچھ عرصے کے بعد میں بمبئی چلا گیا۔ اختر صاحب سے اتنے براجم نہیں تھے کہ

خط و کتابت ہوتی۔ لیکن جب انہوں نے رسالہ ”روان“ جاری کیا تو میں نے انہیں مبارک باد کا خط لکھا۔ اب میں افانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکا تھا۔ ترجمے کا دور وہیں لاہور اور امرتسر میں ختم ہو گیا تھا میں نے طبع زاد افانے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ جو مقبول ہوئے تھے ”روان“ میں احمد ندیم قاسمی کا ایک افانہ

مجھے بہت پسند آیا۔ بمبئی کے ہفتہ وار ”مصور“ میں ”روان“ پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے اس کی تعریف کی۔ اختر صاحب کو علیحدہ خط لکھا تو اس میں بھی افانے کو بہت سراہا۔ چند دنوں کے بعد احمد ندیم قاسمی کا محبت بھرا خط موصول ہوا جو

ایک طویل سلسلہ خط و کتابت کا پیش خیر تھا۔

کچھ عرصے کے بعد دورانِ بند ہو گیا اور آخر میری نظروں سے مکمل طور پر باہر چل ہو گئے۔ کئی برس گزر گئے۔ ملک کی سیاست نے کئی رنگ بدلے۔ حتیٰ کہ بھوارہ اُن پہنچا۔ اس سے پہلے جو بڑھ چھا اس سے آپ سب واقف ہیں۔ اس دوران میں اخباروں میں خبر چھپی کہ اختر صاحب ٹونک سے پاکستان آ رہے تھے کہ راستے میں بلایوں نے ان کو شہید کر دیا۔ بہت افسوس ہوا۔ میں، عصمت اور شاہد لطیف دیر تک ان کی باتیں کرتے اور افسوس کرتے رہے۔

کئی اخباروں میں ان کی موت پر مضمین شائع ہوئے۔ اُن کی ہمرانی تنظیمیں چھپیں۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد ان کی موت کی خبر کی تردید ہو گئی معلوم ہوا کہ وہ بغیر دعا و قیامت لاہور پہنچ گئے ہیں۔ اس سے بھی کے ادبی حلقے کو بہت خوشی ہوئی۔

تقسیم کے پانچ بیسے بعد میں بمبئی چھوڑ کر لاہور چلا آیا کیوں کہ سب عزیز و اقارب یہیں جمع تھے۔ خراط و تفریط کا عالم تھا۔ اختر صاحب سے ملنے کا خیال تک دماغ میں نہ آیا۔ بڑی مدت کے بعد یومِ اقبال کے جلسے میں ان کو دیکھا مگر نہایت ہی ابتر حالت میں۔

رات کے جلسے کی صدارت اختر صاحب کو کرنا تھی یونیورسٹی ہال میں حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔ جلسے میں شرکت کے لئے عبادت سے علیٰ سردار جعفری

اور کبھی انھیں آئے ہوئے تھے۔ وقت ہو چکا تھا مگر صاحب صدر موجود نہیں تھے میں نے ساحر لہیا نوی سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ اختر شیرانی صاحب ڈال کے باہر پی رہے ہیں۔ ان کی حالت بہت خیر ہے۔ اس لئے ہم گردش کر رہے ہیں کہ وہ صدارت نہ کریں مگر مصیبت یہ ہے کہ وہ ٹھہر چکے ہیں۔

میں باہر گیا تو دیکھا وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہیں اور پی رہے ہیں۔ ظہیر کا شیریں کے ہاتھ میں بوتل ہے۔ آپ نے گلاس ختم کیا اور ظہیر سے کہا: "چلو اجلاس کا وقت ہو گیا۔" ظہیر نے ان کو روک دیا۔ "جی نہیں۔ ابھی کہاں ہوا ہے۔" مگر اندر ڈال سے قلم پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ نے روکڑا تے ہوئے الف ظ کے اپنے منہ میں کئی کئی ٹکڑے کہتے ہوئے کہا: "جلد شروع ہو چکا ہے۔ مجھے آواز آ رہی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ظہیر کو دھکا دیا۔ اس وقت پر میں آگے بڑھا اختر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے مجھے بالکل نہ پہچانا۔ نشے سے ان کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے ان کو جھنجھوڑا اور اپنا نام بتایا۔ اس پر انہوں نے ایک ایسی "آہ" کی اور مجھے گلے لگا لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ الفاظ چونکہ ان کے منہ میں ادھر بڑے ہمارے ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے۔ اس لئے میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ ظہیر نے میرے کان میں کہا کہ میں انہیں اندر ڈال میں نہ جانے دوں۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ اختر صاحب سے یہ کہا: "اتنی دیر کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی ہے۔ کیا اس کی خوشی میں بوتل میں سے مجھے کچھ نہ ملے گا؟"

آپ نے ظہیر کا شیریں سے کچھ کہا۔ جس کا نابا یہ مطلب تھا کہ سعادت کو ایک گلاس بنا کر دو۔ ظہیر گلاس میں آتش بیاں اندھینے لگا کر اختر صاحب شیریں سے لڑکھڑاتے ہوئے ہال کے اندر داخل ہو گئے اور یہیں اس کی اس وقت خبر ہوئی حیب ان کو باہر نہیں جاسکتا تھا۔ پھر جس میں دوڑ کر اندر گیا اور چوتھے پرچٹنے سے پہلے ان کو روک لیا۔ مگر وہ میری گرفت سے نکل کر کمرٹی صدارت پر جا بیٹھے جیسے کہ تسلیں بہت پریشان ہوئے۔ کیا کریں کیا نہ کریں سب اسی غصے میں گرفتار تھے ان کی حالت بہت بُری تھی۔ کچھ دیر تو وہ خاموش بیٹھے کرسی پر جھولتے رہے۔ لیکن ۱۱ بجے انہوں نے اٹھ کر نقر بر کرنا چاہی تو معاملہ بڑا لگیں ہو گیا۔ باگروہن کے سامنے آپ بار اپنی ڈھیلی تلون ٹھیک کرنے اور ثابت قدم رہنے کی ناکام کوشش میں بار بار لڑکھڑاتے تھے آپ کی گنت زدہ زبان سے خلا معلوم کیا نکل رہا تھا۔

حاضرین میں سے کسی شخص نے بلند آواز میں کہا یہ خرابی ہے۔ اسے باہر کاٹو۔ بس طنان برپا ہو گیا۔ ایک نے چوہوں پر کھڑے ہو کر بڑے غصے میں کہا یہ پاکستان میں کیا بھی کچھ ہوگا۔ دوسرا چلایا۔ اور جیسے میں خواتین میں موجود ہیں۔

اختر صاحب برابر بولتے رہے۔ ایک تو ویسے ہی ان کی کوئی بات سمجھ میں آتی تھی۔ شور میں تو وہ شور کا ایک حصہ ہی گئی تھی۔ جب معاملہ بڑھ گیا تو دوست احباب اختر صاحب کو زبردستی ہال سے باہر لے گئے۔ منہ بہت خراب ہو گئی تھی۔ لیکن غوربش کا شیریں کی بروقت تقریر نے مدد کی اور ہال پر سکون ہو گیا۔

اختر شیرانی سے خدائات

اس کے بعد اختر صاحب سے آخری ملاقات یہاں ہسپتال میں ہوئی۔
 میں نے پرویز پروڈکشنز کے لئے ایک فلمی کہانی لکھنے میں مصروف تھا کہ
 احمد ندیم قاسمی آئے۔ آپ نے بتایا: "میں نے کسی سے سُننے کے لئے اختر صاحب کو
 تین روز سے خطرناک طور پر علیل ہیں۔ اور یہ ہسپتال میں پڑے ہیں جبری کیمپری
 کی حالت میں۔ کیا ہم اُن کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟"

ہم سب نے آپس میں مشورہ کیا۔ مسعود پرویز نے ایک راہ نکالی جو یہ تھی
 کہ ان کی دو تین غزلیں یا نظمیں فلم کے لئے لے لی جائیں اور پرویز پروڈکشنز کی
 طرف سے پانچ سو روپے بطور معاوضے کے ان کو دے دیئے جائیں۔ بات
 مقبول تھی چنانچہ ہم اسی وقت موٹر میں بیٹھ کر یہ ہسپتال پہنچے۔

مریضوں سے ملنے کے لئے ہسپتال میں خاص اوقات مقرر ہیں۔ اس لئے
 ہمیں وارڈ میں جانے کی اجازت نہ ملی۔ ڈیوٹی پر اس وقت جو ڈاکٹر مقرر تھے، اُن
 سے ملے جب آپ کو معلوم ہوا کہ ہم اختر شیرانی سے ملنا چاہتے ہیں تو آپ نے
 مجھے اخترناک بلے میں کہا: "ان سے ملاقات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"
 میں نے پوچھا: "کیوں؟"

ڈاکٹر صاحب نے اس بلے میں جواب دیا: "وہ یہہوش ہیں جب سے یہاں
 آئے ہیں، ان پر غشی طاری ہے۔ یعنی الکوہک کوما۔"
 یہ سن کر ہمیں اختر صاحب کو دیکھنے کا اور زیادہ اشتیاق پیدا ہوا۔ ہم نے

اس کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھے اور ہمیں وہاں لے گئے جہاں ہمارا رومانی شاعر، سلمیٰ اور عذرا کا خالق ہے ہوش پڑا تھا۔ بیڈ کے ارد گرد پکڑا تھا۔ ہم نے دیکھا اختر صاحب اُنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ بچے بچے ناہموار سانس لے رہے ہیں۔ ہونٹ آواز کے ساتھ کھلتے اور بند ہوتے تھے۔ ہم تینوں ان کو اس حالت میں دیکھ کر ہڑ مر رہے ہو گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: ”کیا ہم ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں۔“
ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا: ”ہم اسکان جبر کوکشن کر چکے ہیں۔“

انٹریاں بھی جواب دے چکی ہیں۔ ایک صرف دل ابھی حالت میں ہے۔ گھپ اندھیرے میں امید کی بس یہی ایک چوٹی سی کرن ہے۔ جب ہم نے خواہش ظاہر کی کہ اختر صاحب کے اس وقت میں کسی دیکھی طرح کام آنا چاہتے ہیں۔ تو ڈاکٹر صاحب نے کہا: ”اچھا تو میں آپ کو ایک دوا کا نام بتاتا ہوں۔ آپ اسے حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ یہاں پاکستان میں تو بالکل نایاب ہے۔“

ڈاکٹر صاحب سے دوا کا نام بکھوا کر میں فیض صاحب کے پاس پہنچا۔ اور ان کو ساری بات بتائی۔ آپ نے اُسی وقت امرتسر ٹیلی قرن کرایا۔ اور اپنے اخبار کے ایجنٹ سے کہا کہ وہ دوا

انحرشیرانی سے چند لائنیں

حاصل کر کے فوراً لاہور بھجوا دے۔ لیکن انفرس دوا نہ ملی۔
سود پرویز نے دلی قرن کیا۔ وہاں سے ابھی جواب نہیں آیا تھا
کہ اختر صاحب بے ہوشی کے عالم میں اپنی سسلی اور فذرا کو
پیدرے ہو گئے۔

بہادر عمر ملاقات دوستداران است
چہ خط برد خضر از عمر جاوداں تنہا

را حشر شیرانی

۱۸/۴/۲۲

حسن بڈنگز کے فلیٹ نمبر ایک میں تین گولے میرے سامنے میز پر پڑے تھے۔ یہ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور میرا جی کی باتیں سن رہا تھا۔ اس شخص کو پہلی بار میں نے یہیں دیکھا تھا۔ سن چالیس تھا۔ بچے چھوڑ کر مجھے دہلی آئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا مجھے یاد نہیں کہ وہ فلیٹ نمبر ایک والوں کا دوست تھا یا ایسے ہی چلا آیا تھا۔ لیکن مجھے آنا یاد ہے کہ اس نے یہ کہا تھا کہ اس کو ریڈریشن سے پتا چلا کہ میں علس روڈ پر سعادت حسن بڈنگز میں رہتا ہوں۔

اس ملاقات سے قبل میرے اور اس کے درمیان معمولی سی خط و کتابت ہو چکی تھی۔ میں بھی اس میں تعجب اس نے اہل دنیا کے لئے تجھ سے ایک افسانہ طلب کیا تھا۔ میں نے اس کی خواہش کے مطابق افسانہ بھیج دیا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا

کہ اس کا معاون نہ مجھے ضرور ملنا چاہیے۔ اس کے جواب میں اس نے ایک خط لکھا کہ میں افسانہ واپس بھیج رہا ہوں۔ اس لئے کہ ”ادبی دنیا“ کے مالک محنت خور قسم کے آدمی ہیں۔ افسانے کا نام ”موسم کی شرارت“ تھا۔ اس پر اس نے اعتراض کیا تھا۔ کہ اس شرارت کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لیے اسے تبدیل کر دیا جائے میں نے اس کے جواب میں اس کو لکھا کہ موسم کی شرارت ہی اس افسانے کا موضوع ہے مجھے حیرت ہے کہ یہ تمہیں کیوں نظر نہ آئی میرا جی کا دوسرا خط آیا۔ جس میں اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ اور اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ موسم کی شرارت وہ ”موسم کی شرارت“ میں کیوں دیکھ نہ سکا۔

میرا جی کی لکھائی بہت صاف اور واضح تھی۔ مرنے کے خط کے نب سے نکلے ہوئے جیسے صحیح نشست کے حروف ہلکوں کی سی آسانی سے بنے ہوئے ہر جوڑ نمایاں ہیں اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے اس میں مولانا حامد علی خان مدیر جلیوں کی خطاطی کی جھلک نظر آئی۔ یہ بھی سی گر کافی مرنے کی طاقت و مشابہت اپنے اندر کیا گہرائی رکھتی ہے۔ اس کے متعلق میں اب بھی غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا کوئی شورش یا نقطہ سجھائی نہیں دینا۔ جس پر میں کسی مفروضے کی بنیادیں کھڑی کر سکوں۔ حسن بڈگن کے فیڈٹ فبرا ایک میں تین گزے میرے سدنے میں پر پڑے تھے اور میرا جی تم ترنگے اور گول مثالی شعر کہنے والا شاعر مجھ سے بڑے صحیح تدوین مست اور بڑی صحیح نوک و پلک کی باتیں کر رہا تھا۔ جو میرے افسانوں کے متعلق تھیں وہ

گئے فرستے

قرین کر ساقا تفتیش۔ ایک مقررہ تہذیب تھا۔ ایک سرسری سی تنقید تھی۔ مگر اس سے پتا چلتا تھا۔ کہ میراجی کے دماغ میں کٹری کے جانے نہیں۔ اس کی باتوں میں الجھاؤ نہیں تھا۔ اور یہ چیز میرے لئے باعث حیرت تھی۔ اس لئے کہ اس کی اکثر نظمیں بہیم اور الجھاؤ کی وجہ سے ہمیشہ میری فہم سے بالاتر رہی تھیں۔ لیکن شکل و صورت اور وضع قلم کے اعتبار سے وہ باطل ایسا ہی تھا۔ جیسا اس کا بے قافیہ بہیم کلام۔ اس کو دیکھ کر اس کی شاعری میرے لئے اور بھی پیچیدہ ہو گئی۔

نہم۔ راشد بے قافیہ شاعری کا امام مانا جاتا ہے۔ اس کو دیکھنے کا اتفاق بھی دہلی ہی میں ہوا تھا۔ اس کا کلام میری سمجھ میں آ جاتا تھا۔ اور اس کو ایک نظر دیکھنے سے اس کی شکل و صورت بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ چنانچہ ایک بار میں نے ریڈیو سیشن کے برآمدے میں پڑی ہوئی بیئرڈ گارڈوں کی سائیکل دیکھ کر اس سے اصرام مذاق کہا تھا۔ تو۔ یہ تم ہو اور تمہاری شاعری؟ لیکن میراجی کو دیکھ کر میرے ذہن میں سوائے اس کی بہیم نظموں کے اور کوئی شکل نہیں بنی تھی۔

میرے سامنے میز پر تین گولے پڑے تھے۔ جن میں آہنی گولے۔ سگرٹ کی پیڑوں میں پٹے ہوئے۔ دو بڑے ایک چھوٹا۔ میں نے میراجی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ارمان کے اور اس کا بڑا بھروسہ بالوں سے اٹا ہوا سر۔۔۔

یہ بھی تین گولے تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے۔ ایک بڑا میں نے یہ ثالث صوفی کی توس کا رد عمل میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ میں نمودار ہوا۔ میراجی دوسروں کا رد عمل ٹانگتے

میں بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے تو اپنی شروع کی برائی بات اور صوری چور کرکے سے پرچھا : کیوں بیٹا، کس بات پر سکرالے ؟

میں نے میز پر ہرے ہوئے ان تین گولوں کی طرف اشارہ کیا۔ اب میرا تھی کی بادی تھی۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹ بہین بہین صوری مونچھوں کے نیچے گول گول انداز میں سکرالے ۔

اس کے گلے میں موڑے موڑے گول شکلوں کی مالا تھی۔ جس کا صرف بالائی حصہ قیصر کے کھلے ہوئے کالہ سے نظر آتا تھا ۔ میں نے سوچا : اس انسان نے اپنی کیا ہیئت کنڈائی بنا رکھی ہے ۔ بے بے غلیظ بال جو گردن سے نیچے لٹتے تھے ۔ فروج کٹ سی ڈرھی میل سے بھرے ہوئے ناخن سردیوں کے دن تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہینوں سے اس کے بدن نے پانی کی شکل نہیں دیکھی ۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاعر ادیب اور ایڈیٹر عام طور پر لائڈری میں ننگے پیڈ کرڈل ریڈ پر اپنے کپڑے دھلایا کرتے تھے۔ اور بڑی میلی کھلی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے سوچا۔ شاید میرا تھی بھی اسی قسم کا شاعر اور ایڈیٹر ہے۔ یہی سن اس کی غلاظت، اس کے بے بال، اس کی فروج کٹ ڈرھی گلے کی مالا اور وہ تین آہنی گورے ۔ معاشی حالات کے منظر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ان میں ایک دردِ شانہ پن تھا۔ ایک قسم کی راہبیت جب میں نے راہبیت کے تعلق سوچا تو میرا داغ دھس کے دیوانے راہب لاسپوٹین کی طرف چلا گیا۔ میں نے کہیں

پڑھا تھا کہ وہ بہت غلاظت پسند تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ غلاظت کا اس کو کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ اس کے ناخنوں میں بھی ہر وقت میل بھرا رہتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد اس کی انگلیاں تھوڑی ہوتی تھیں۔ جب اُسے ان کی صفائی مطلوب ہوتی تو وہ پاس بیٹھی شہزادیوں اور رئیس ناداروں کی طرف بڑھا دیتا۔ جو ان کی تمام آلودگی اپنی زبان سے چاٹ لیتی تھیں۔

کیا میراجی اسی قسم کا درویش اور ماہب تھا —؟ یہ سوال اس وقت اور بعد میں بھی کئی بار میرے دماغ میں پیدا ہوا۔ میں امرتسر میں سائیں گھوڑے شاہ کو دیکھ چکا تھا۔ جو اعلیٰ ننگا رہتا تھا۔ اور کبھی نہانا نہیں تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی سائیں اور درویش میری تلوار سے گزر چکے تھے جو غلاظت کے پتے تھے۔ مگر ان سے مجھے گھسی آتی تھی۔ میراجی کی غلاظت سے مجھے نفرت کہیں نہیں ہوئی۔ البتہ بہت ہوتی تھی۔

گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیں عام طور پر بعد ر تفریق منقذات کہتے ہیں مگر میراجی کے منہ میں سے میں نے کبھی کوئی غلیظ کلمہ نہ سنا۔ اس قسم کے سائیں بظاہر جلد و گرد پر وہ ہر قسم کے جنسی فعل کے ترکیب ہوتے ہیں۔ میراجی بھی غبرو تھا مگر اس نے اپنی جنسی تسکین کے لئے صرف اپنے دل و دماغ کو اپنا شریک کار نہ لیا تھا۔ اس لحاظ سے گرائس میں اور گھوڑے شاہ کی قبیل کے سائیلوں میں ایک گروہ مماثلت تھی مگر وہ ان سے بہت مختلف تھا۔ وہ سین گرے تھا۔ . . . جن کو لٹکانے کے لئے

اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہاتھ کی فدا سی حرکت اور تخیل کی
 لکھی سی جنبش سے وہ ان تین اجسام کو اور بھی سے اونچی طبقہ کی اونچی چچی گہرائی کی سیر
 کرا سکتا تھا اور یہ گڑ اس کو انہی تین گویوں نے بتایا تھا جو غالباً اس کو کہیں پڑے ہوئے
 ملے تھے۔ ان خارجی اشاروں ہی نے اس پر ایک ازلی وابدی حقیقت کو منکشف
 کیا تھا جن حقائق اور موت..... اس تثلیث کے تمام اقلیدسی زاویے صرف
 ان تین گویوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے۔ لیکن حسن اور مشق کے انجام کو
 جو علم اس نے شکست خوردہ مینک سے دیکھا تھا۔ جس کے شبیہوں میں بال پڑے
 تھے اس نے اس کو سب شکل میں اس نے دیکھا تھا یہ صحیح نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ اس
 کے مدد سے وجود میں ایک ناقابل بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا۔ جو ایک نقطے سے شروع
 ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطہ آغا نہ ہے
 اور وہی نقطہ انجام ہی وجہ ہے کہ اس کا ابہام نہ کیلا نہیں تھا۔ اس کا نسخہ موت کی
 طرف تھانہ زندگی کی طرف، اربعائیت کی سمت، از قنوطیت کی جانب اس نے آغاز
 اور انجام کو اپنی مٹھی میں اس دور سے بچھ رکھا تھا۔ کہ ان دونوں کا بہو نچوڑ چڑو کر
 اس میں سے ٹپکتا رہتا تھا۔ لیکن سادیت پسندوں کی طرح وہ اس سے مسوؤ نظر
 نہیں آتا تھا۔ یہاں پھر اس کے جذبات گول ہو جاتے تھے۔ ان تین آنہی گویوں کی طرح
 جن کو میں نے پہلی مرتبہ حسن بڑے گنیز کے فلیٹ قبر ایک میں دیکھا تھا۔
 اس کے شعر کا ایک مصرع ہے ۔

گھری گھری ہوا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا

مسافر کو رستہ بھولنا ہی تھا۔ اس لئے کہ اس نے چلتے وقت نقطہ آمد نہ پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا۔ اپنے بنائے ہوئے دائرے کے خط کے ساتھ ساتھ گھومتا وہ یقیناً کئی بار ادھر سے گزرا، مگر اسے یاد نہ رہا کہ اس نے اپنا یہ طویل سفر کہاں سے شروع کیا تھا۔ اور میں تو سمجھتا ہوں کہ میرا جی یہ بھول گیا تھا کہ وہ مسافر ہے سفر ہے یا راستہ، یہ تثلیث ہیں اس کے دل دماغ کے خلیوں میں دائرے کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

اس نے ایک روکی میرا سے محبت کی۔ اور وہ شاد و اشد سے میرا جی بن گیا۔ اسی میرا کے نام کی رعایت سے اُس نے میرا پانی کے کلام کو پسند کرنا شروع کر دیا جب اپنی اس محبوبہ کا جسم میرے آیا۔ تو کوزہ گھر کی طرح چاک گھما کر اپنے تخیل کی مٹی سے شروع شروع میں اُسی شکل و صورت کے جسم تیار کرنے شروع کر دیئے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس جسم کی ساخت کے تمام جزئیات، اس کی تمام نمایاں خصوصیات تیز رفتار چاک پر گھوم گھوم کر نئی ہیئت اختیار کر گئیں۔ اور ایک وقت ایسا آیا۔ کہ میرا جی کے ہاتھ اس کے تخیل کی نرم نرم مٹی اور چاک، تھوڑا تر گردش سے بالکل گول ہو گئے۔ کوئی بھی ٹانگ میرا کی ٹانگ پر نہیں تھکتی تھی کوئی بھی چپتر میرا کا پیرا بن بن سکتا تھا۔ ہر گھنڈ میرا کی رگھنڈ میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ اور اتنا ہی ہوئی کہ تخیل کی نرم نرم مٹی کی سونہری سونہری باس مٹا دی گئی اور وہ شکل دیکھنے سے پہلے

ہی اس کو چاک سے اُٹارنے لگا۔

پہلے میرا بلند بام جلوں میں رہتی تھی۔ میرا جی ایسا بٹکا کر مانتا بٹول کر اُس نے نیچے اُترنا شروع کر دیا۔ اس کو اس گراؤٹ کا مطلقاً احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ اُترائی میں ہر قدم پر میرا کاحیل اس کے ساتھ تھا۔ جو اُس کے جُوتے کے تلووں کی مسدود گھستا گیا۔ پہلے میرا عام صوبائوں کی طرح بڑی غلبہ و تہمت تھی۔ لیکن یہ غلبہ و تہمت ہر سواری پر شک میں جلو کس دیکھ دیکھ کر کچھ اس طور پر اس کے دل و دماغ میں مسخ ہو گئی تھی۔ کہ اس کے میج تعزیر کی المناک بدائی کا بھی میرا جی کو احساس نہ تھا۔ اگر احساس ہوتا تو اتنے بڑے ایسے کے جلوس کے چند غیر مبہم نشانات اس کے کلام میں یقیناً موجود ہوتے۔ جو میرا سے محبت کرتے ہی اس کے دل و دماغ میں مختلف شروع ہو گیا تھا۔

حسن، عشق اور موت۔ یہ تھون پچپ کر میرا جی کے وجود میں گول ہو گئی تھی صرف یہی نہیں دنیا کی ہر شے اس کے دل و دماغ میں تکرار ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ارکانِ شہاد کچھ اس طرح آپس میں گڈھ ہو گئے تھے۔ ان کی ترتیب —

دہم برہم ہو گئی تھی۔ کبھی موت پہلے حسن اور عشق درمیان میں۔ کبھی عشق پہلے موت اس کے بعد اور حسن آخر میں۔ اور یہ چکر تمام عموں طور پر چلتا رہتا تھا۔

کسی بھی صورت سے عشق کیا جائے مگر ایک ہی قسم کا بنتا ہے۔ حسن، عشق اور موت۔ عاشق، معشوق اور وصل۔ میرا سے شہداء اللہ کا وصال جیسا کہ جانے والوں

کہ معلوم ہے، انا ہوا نہ ہو سکا۔ اس نہ ہونے یا نہ ہونے کا مدخل میرا ہی تھا۔ اس نے اس حالت میں شکست کھا کر اس تخلیق کے ٹکڑوں کو اس طرح جوڑا تھا کہ ان میں ایک سالمیت تو آگئی تھی، مگر اصیت مسخ ہو گئی تھی۔ وہ زمین تو کس جن کا رخ خط مستقیم میں ایک دوسرے کی طرف ہوتا ہے۔ دب گئی تھیں۔ وصال غیب کے لئے اب یہ لازم نہیں تھا کہ محبوب موجود ہو۔ وہ خود ہی عاشق تھا خود ہی معشوق اور خود ہی وصال۔

مجھے معلوم نہیں اس نے کسے کہا کہ یہ گولے کہاں سے لیے تھے۔ خود معاملہ کئے تھے۔ یا کہیں پڑے ہوئے لی گئے تھے۔ مجھے یاد ہے، ایک مرتبہ ان کے متعلق میں نے بیٹی میں اس سے استفادہ کیا تھا۔ تو اس نے سرسری طور پر اتنا کہا تھا میں نے یہ خود پیدا نہیں کئے اپنے آپ پیدا ہو گئے ہیں۔

پھر اس نے اس گولے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو سب سے بڑا تھا۔ پہلے یہ وجود میں آیا تھا۔ اس کے بعد یہ دوسرا جو اس سے چھوٹا ہے۔ اس کے نیچے یہ کوچک؟

میں نے مسکرا کر اس سے کہا تھا: بڑے تر باوا آدم علیہ السلام ہوئے خدا ان کو وہ جنت نصیب کرے جس سے وہ نکالے گئے تھے۔ دوسرے کو ہم اتنا حرا کہہ لیتے ہیں اور تیسرے کو ان کی اولاد۔!

میری اس بات پر میرا بیوی خوب کھل کر ہنسا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو مجھے

مجھے فرشتے

ان تین گروں پر ساری دنیا گھومتی نظر آتی ہے۔ تخلیق کیا تخلیق کا دوسرا نام نہیں وہ تلم شلثیں جو ہماری زندگی کی تقدیس میں موجود ہیں۔ کیا ان میں انسان کی تخلیق قوتوں کا نشان نہیں ہے۔

خدا، بیٹا اور روح القدس، عیسائیت کے آفانیم — ترسول جبار یوکار
شاخ جبالائین دیوتا۔ برہما، وشنو، ترلوک — آسمان زمین اور پاتال —
نخلی، تری اور ہوا — تین بنیادی رنگ، سرخ، نیلا اور زرد پھر ہمارے
رسم اور مذہبی احکام، یہ تیجہ، سوئم اور تیفٹیاں، دھرم میں مرتبہ اتحاد مزدھرنے
کی شرط تین طلاقیں اور سرگودہ مہلتے۔ اور جرنے میں نرد بازی کے تین پنوں
کے تین نقطے یعنی تین کائنات، موسیقی کے تینے — حیات انسانی کے بنے
کو اگر کھود کر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے، ایسی کئی شلثیں مل جائیں گی، اس
لئے کہ اس کے توالد و تاسل کے افعال کا محور بھی اعضائے ثلاثہ ہے۔

اقلیدس میں مثلث بہت اہم حیثیت رکھتی ہے۔ دوسری اشکال کے
تقابلے میں، ایسی کثرت اور بے لپخ شکل ہے۔ جسے آپ کسی اور شکل میں تبدیل
نہیں کر سکتے۔ لیکن میرا جی نے اپنے دل و دماغ اور جسم میں اس ٹکون کو جس کا
ذکر اربہ ہر جگہ ہے۔ کچھ اس طرح دیا کہ اس کے رکن اپنی جگہوں سے ہٹ
گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پاس کی دوسری چیزیں بھی اس ٹکون کے ساتھ
سج ہو گئیں اور میرا جی کی شاعری ظہور میں آئی۔

پہلی ملاقات ہی میں میری اس کی جتنی تکلف ہو گئی تھی اس نے مجھے وہی میں بتایا تھا کہ اس کی جنسی حاجت عام طور پر ریڈیو پیش کے اسٹوڈیوز میں ہوتی ہے۔ جب یہ کمرے خالی ہوتے تھے۔ تو وہ بڑے اطمینان سے اپنی حاجت رفع کر لیا کرتا تھا۔ اس کی یہ جنسی ضروریات ہی جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کی صمیم ضروریات کا باعث ہے۔ ورڈ جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں عام گفتگو میں وہ بڑا واضح دماغ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس پر چلتی ہے اشار میں بیان ہو جائے۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ جو مصیبت اس پر ٹوٹی تھی۔ اس کو اس نے بڑے بے ڈھنگے طریقے سے جوڑ کر اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا تھا۔ اس کو اس کا علم تھا۔ اس ضمن میں وہ اپنی بے چارگی ابھی طرح محسوس کرتا تھا۔ لیکن عام آدمیوں کی طرح اس نے اپنی اس کمزوری کو اپنا خاص گنگ بنانے کی کوشش کی اور آہستہ آہستہ اس میرا کو بھی اپنی گمراہی کی سُرلی پر چڑھا دیا۔ بحیثیت شاعر کے اس کی حیثیت وہی ہے جو گنگے مٹھے تھوں کی ہوتی ہے۔ جیسے کھاد کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس کا کام بڑی عمدہ کھاد ہے۔ جس کی افادیت ایک نہ ایک دن ضرور ظاہر ہو کے رہے گی۔ اس کی شاعری ایک گمراہ انسان کا کام ہے۔ جو انسانیت کی عمیق ترین پستیوں سے متعلق ہونے کے باوجود دوسرے انسانوں کے لیے اُنہی فضاؤں میں سرخ باد فغا کا کام دے سکتا ہے۔ اس کا کام ایک 'چنگ ساہزل' ہے جس کے طعنے بڑے اطمینان اور سکون سے جوڑ کر دیکھنے چاہیئیں۔

بیمشیت انسان کے وہ بڑا دلچسپ تھا۔ پہلے دیکھنے کا غصہ جس کو اپنی اس قریب قریب نایاب صفت کا مطلقاً احساس نہیں تھا۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ شخص جو اپنی خواہشات جہانی کا فیصلہ اپنے ہاتھوں کو سونپ دیتے ہیں، عام طور پر اسی قسم کے غصے پہنچتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خود کو صریحاً دھوکا دیتے ہیں مگر اس قریب دہی میں جو خلوص ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔

میرا جی نے شاعری کی، بڑے خلوص کے ساتھ، شراب پی، بڑے خلوص کے ساتھ، ہنسک پی، وہ بھی بڑے خلوص کے ساتھ۔ لوگوں سے دوستی، اور اُسے بنایا۔ اپنی زندگی کی ایک عظیم ترین خواہش کو پھل دینے کے بعد وہ کسی اور سے دھوکا قریب کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا۔ اس اہلیت کے اخراج کے بعد وہ اس قدر بے مزرہ ہو گیا تھا کہ بے معرفت ماسلوم ہوتا تھا۔ ایک ہلکا ہوا مسافر جی کی نگری چمکا رہا ہے۔ متر بے قدم قدم پر اپنی آغوش اس کے لئے داکرتی ہیں۔ مگر وہ ان کی طرف دیکھے بغیر آگے نکلتا جا رہا ہے۔ ... کسی ایسی جگہ، جس کی کوئی صحت ہے نہ رتبہ۔۔۔۔۔ ایک ایسی نگہ کی جانب جس کے ارکان اپنی جگہ سے ہٹ کر تین دائروں کی شکل میں اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔

میں نے میرا جی سے اس کے کلام کے متعلق دو تین جملوں سے زیادہ کبھی گفتگو نہیں کی ہیں اسے بکواس کہا کرتا تھا۔ اور وہ اسے تسلیم کرتا تھا ان میں گزریں اور مرے مسٹے دانوں کی انا کو میں اس کا فراڈ کہتا تھا۔ اسے بھی وہ تسلیم کرتا تھا۔

حالانکہ ہم دونو جانتے تھے کہ یہ چیزیں قراڑ نہیں ہیں۔

ایک دفعہ اس کے ہاتھ میں تین کے بیکٹے دو گولے دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ میں نے جب اس کا اظہار کیا تو میرا جی نے کہا: برغور دار کا انتقال ہو گیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور پیدا ہو جائے گا!

میں جب تک بھنی میں رہا۔ یہ دوسرا برغور دار پیدا نہ ہوا۔ یہ تو ماں حوا عظیم ہو گئی تھی یا باوا آدم مروجہ خیز نہیں رہے تھے۔ یہ رہی سہی خارجی شکلیت بھی ٹوٹ گئی تھی۔ اور یہ بُری خال تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرا جی کو اس کا احساس تھا چنانچہ جیسا کہ سننے میں آیا ہے، اُس نے اس کے باقی کے وہ اقنوم بھی اپنے ہاتھ سے جیلندہ کر دیئے تھے۔

مجھے معلوم نہیں میرا جی گھومتا گھسٹا کب بھی پہنچا۔ میں ان دنوں فلسطین میں تھا جب وہ مجھ سے ملنے کے لئے آیا بہت نختہ حالت میں تھا۔ ہاتھ میں تین گولے بدستور موجود تھے۔ بوسیدہ سی کاپی بھی تھی۔ جس میں غالباً میرا بانی کا کلام اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا تھا۔ ساتھ ہی ایک عجیب شکل کی توہل تھی جس کی گردن مڑی ہوئی تھی، اس میں میرا جی نے شراب ڈال رکھی تھی۔ بوقت طلب وہ اس کا گال گھومتا اور ایک گھونٹ چڑھاتا تھا۔

دائمی غائب تھی، سر کے بال بہت ہلکے تھے۔ مگر بین کی غلاظت بدستور موجود چہل کا ایک پیر درست حالت میں تھا۔ دوسرا مرست طلب تھا۔ یہ کمی

اس نے پاؤں پر دسی باندھ کر دھک کر رکھی تھی۔ ستوڑھی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں ان دنوں غالباً آٹھ دن کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ اس کی کہانی میری تھی۔ جس کے لیے دو ایک گاڑوں کی ضرورت تھی۔ میں نے اس خیال سے کہ میرا جی کو کچھ روپے مل جائیں اس سے یہ گانے کھنے کے لئے کہا۔ جو اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے لکھ دیے۔ مگر کھڑے کھڑے قسم کے، نہایت دواہیات جو یکسر غیر علمی تھے۔۔۔ میں نے جب اس کو اپنا فیصلہ سنایا تو وہ خاموش رہا۔ واپس جاتے ہوئے اس نے مجھ سے سات روپے طلب کئے کہ اسے ایک ادھانا تھا۔

اس کے بعد بہت دیر تک اس کو ہر روز ساڑھے سات روپے دینا میرا فرض ہو گیا۔ میں خود بوتلی کا رسیا تھا۔ یہ منہ نہ لگے تو جی پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا مجھے بخوبی علم تھا۔ اس لیے میں اس رقم کا انتظام کر رکھتا۔ سات روپے میں دھکا ادھانا تھا، باقی آٹھ آنے اس کے آنے جانے کے لئے ہوتے تھے۔

بارشوں کا موسم آیا۔ تو اسے بڑی دقت محسوس ہوئی۔ یہی میں اتنی شدید بارش ہوتی ہے کہ آدمی کی ہڈیاں ٹپک بھینگ جاتی ہیں۔ اس کے پاس فالٹو کمپڑے نہیں تھے۔ اس لیے یہ موسم اس کے لیے اور بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ اتفاق سے میرے پاس ایک برساتی تھی۔ جو میرا ایک شاکٹا قرچی دوست صرف اس لیے میرے گھر بھول گیا تھا۔ کہ وہ بہت وزن کی تھی۔ اور اس کے کندھے شل کر دیتی تھی۔ میں نے اس کا ذکر میرا جی سے کیا۔ اور اس کے وزن سے بھی اس کو آگاہ کر دیا میرا جی نے

کہا: کوئی پروہان نہیں، میرے کندھے اس کا بوجھ برداشت کر لیں گے، چنانچہ میں نے وہ برساتی اس کے حوالے کر دی۔ جو ساری برسات اس کے کندھوں پر ہی مرحوم کو سند سے بہت دھپسی تھی۔ میرا ایک دوست دار اشرف ہے۔ وہ ان دنوں پاٹ تھا۔ جو ہو میں سند کے کنارے رہتا تھا۔ یہ میرا جی کا دوست تھا۔ معلوم نہیں ان کی دوستی کی بناء کیا تھی۔ کیونکہ اشرف کو شعر و شاعری سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ بہر حال میرا جی اس کے ہاں رہتا تھا۔ اور دن کو اس کے حساب میں بیٹا تھا۔

اشرف جب اپنے جھونپڑے میں نہیں ہوتا تھا۔ تو میرا جی ساحل کی نرم زم اور گلی گلی ریت پر وہ برساتی بچا کر لیٹ جاتا اور مبہم شعر فکر کیا کرتا تھا۔

ان دنوں ہر اتوار کو جو ہرجانا اور دن بھر چائیا میل معمول سا ہو گیا تھا۔ دو تین دوست اکٹھے ہو کر صبح مل جاتے اور سارا دن ساحل پر گزارتے۔ میرا جی وہیں مل جاتا۔ اوٹ پٹا لگ قسم کے مشاغل رہتے۔ ہم نے اس دوران میں شاید ہی کبھی ادب کے بارے میں گفتگو کی ہو۔ مردوں اور عورتوں کے تین چوتھا ٹیٹھے جسم دیکھتے تھے۔ دہی بڑے اور چاٹ کھاتے تھے، ناریل کے پانی کے ساتھ شرب لاکھ پیتے تھے۔ اور میرا جی کو وہیں چھوڑ کر واپس گھر چلے آتے تھے۔

اشرف کچھ عرصے کے بعد میرا جی کا بوجھ عموماً کرنے لگا تھا۔ وہ خود بیٹا تھا اگر اپنی حقیر مدد سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن میرا جی کے متعلق اسے شکایت تھی۔

کہ وہ اپنی حد سے گزر کر ایک اور حد قائم کرتا ہے۔ جس کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ بے ہوش پڑا ہے، غما اور مانگے جا رہا ہے۔ اپنی اس طلب کا دائرہ بناتا ہے۔ اور بھول جاتا ہے کہ یہ کہاں سے شروع ہوئی تھی اور اسے کہا ختم ہونا تھا۔

مجھے اس کی شراب نوشی کے اس پہلو کا علم نہیں تھا۔ لیکن ایک دن اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ جس کو یاد کر کے میرا دل آج بھی افسردہ ہو جاتا ہے۔

سخت بارش ہو رہی تھی۔ جس کے باعث برقی گاڑیوں کی نقل و حرکت کا سلسلہ ہم پر ہم ہو گیا تھا۔ خشک دن، بھونے کی وجہ سے شہر میں شراب کی دکانیں بند تھیں۔ مصافحات میں صرف باغیہ ہی ایک ایسی جگہ تھی۔ جہاں سے مقررہ دہلی پرے چنبرل سکتی تھی۔ میرا جی میرے ساتھ تھا۔ اس کے علاوہ میرا پرانا سگوریا من جہاں جو دہلی سے میرے ساتھ چند دن گزارنے کے لئے آیا تھا۔ ہم تینوں باغیہ اتر گئے۔ اور ڈیڑھ بوتل روم خرید لی۔ واپس اسٹیشن پر آئے تو راجہ دہدی علی خان مل گیا۔ میری بیوی لاہور گئی ہوئی تھی۔ اس لئے پروگرام یہ بنا کر میرا جی، اور راجہ دہدی میرے ہی ان رہیں گے۔

ایک بجے تک روم کے دور چلتے رہے، پھر بوتل ختم ہو گئی۔ راجہ کے لئے دو گپ کافی تھے۔ ان کو ختم کر کے وہ ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ اور فلمی گیت گانے کی پریکٹس کرتا رہا۔ میں عباس اور میرا جی بیٹھے اور فضول فضول باتیں کرتے رہے۔ جن کا سر تھا۔ پیر کر فریڈ کے باعث بازو مسٹان تھا۔ میں نے کہا اب سنا چاہیے۔ عباس اور راجہ

میرے اس فیصلے پر صا د کیا۔ میرا جی نہ مانا۔ اقداس کی موجودگی اس کے علم میں تھی۔ اس لیے وہ اور پتہ چاہتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں، میں اور عباس صند میں آگئے اور وہ ادا کا کھونٹے سے انکار کر دیا۔ میرا جی نے پہلے مفتیش کیس۔ پھر حکم دینے لگا۔ میں اور عباس دونوں انتہا درجے کے سٹیف ہو گئے۔ ہم نے اس سے ایسی باتیں کہیں کہ ان کی یاد سے عجیب غریب محسوس ہوتی ہے۔ لڑ جیگر تاکہ ہم دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میں صبح خیز ہوں سب سے پہلے اٹھا اور ساتھ والے کمرے میں گیا۔ میں نے رات کو راجہ سے کہہ دیا تھا۔ کہ وہ میرا جی کے لئے اسٹریچر بچھا دے۔ اور خود صوفے پر سو جائے۔ راجہ اسٹریچر میں با لب بھرا تھا۔ مگر صوفے پر میرا جی موجود نہیں تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی۔ غسل خانے اور باورچی میں دیکھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے سوچا شاید وہ نالامنی کی حالت میں چلا گیا ہے چنانچہ وفادات معلوم کرنے کے لئے میں نے راجہ کو جگایا۔ اس نے بتایا کہ میرا جی موجود تھا۔ اس نے خود اُسے صوفے پر لٹایا تھا۔ ہم یہ گفتگو کر ہی رہے تھے کہ میرا جی کی آواز آئی: "میں یہاں موجود ہوں۔"

وہ فرش پر راجہ ہمدی علی خان کے اسٹریچر کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ اسٹریچر اٹھا کر اس کو باہر نکالایا۔ رات کی بات ہم سب کے دل و دماغ میں عود کر آئی لیکن کس نے اس پر تبصرہ نہ کیا۔ میرا جی نے مجھ سے آٹھ آنے لیے اور بھاری بھر کم

برساتی اشاکر چلا گیا مجھے اس پر بہت ترس آیا۔ اور اپنے پر بہت خستہ چنانچہ میں نے دل ہی دل میں خود کو بہت لعنت لعنت کی کہ میں رات کو ایک ٹکمی می بات پر اس کو دیکھ پہنچانے کا باعث بنا۔

ایس کے بعد بھی میرا جی مجھ سے متا رہا۔ علم اندیشی کے حالات متغلب ہو جانے کے باعث میرا تھنگ ہو گیا تھا۔ اب میں ہر روز میرا جی کی شراب کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا لیکن اس کو علم ہو گیا تھا چنانچہ ایک دن مجھے اس سے معلوم ہوا کہ اس نے شراب چھوڑنے کے قصد سے جنگ کھانی شروع کر دی ہے۔

جنگ سے مجھے سخت نفرت ہے ایک دوبارہ استعمال کرنے سے میں اس کے ذات آفریں نشے اور اس کے رد عمل کا تجربہ کر چکا ہوں۔ میں نے میرا جی سے جب اس کے بارے میں گفتگو کی تو اس نے کہا: "نہیں... میرا خیال ہے۔" "نشہ بھی کوئی بڑا نہیں، اس کا اپنا رنگ ہے۔ اپنی کیفیت ہے۔ اپنا مزاج ہے۔"

اس نے جنگ کے نشے کی خصوصیات پر ایک الیکٹرک سا شروع کر دیا۔ افسوس ہے کہ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ اس نے کیا کہا تھا۔ اس وقت میں اپنے دفتر میں تھا اور آٹھ دن کے ایک شکل باب کی نظر نویسی میں مشغول تھا۔ اور میرا داخل ایک وقت میں صرف ایک کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ باتیں کرتا رہا اور میں مناظر سوچنے میں مشغول رہا۔

ہنگ پینے کے بعد دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ مجھے اس کے تعلق صرف اتنا ہی علم تھا کہ گردشِ پیش کی چیزیں یا تو بہت چھوٹی ہوجاتی ہیں۔ یا بہت بڑی آدمی حد سے زیادہ ذکی الحق ہوجاتا ہے۔ کانوں میں ایسا شور مچتا ہے۔ جیسے ان میں روہے کے کارخانے کھل گئے ہیں۔ دریا پانی کی ہلکی سی لکیریں جاتے ہیں اور پانی کی لکلی سی لکیریں بہت بڑے دریا۔ آدمی ہنسا شروع کرے تو ہنسا ہی جاتا ہے۔ روئے تو روتے نہیں تھکتا۔

میراجی نے اس نئے کی جو کیفیت بیان کی وہ میرا خیال ہے اس سے بہت مختلف تھی۔ اس نے مجھے اس کے مختلف مدارج بتائے تھے۔ اس وقت جبکہ وہ ہنگ کھائے ہوئے تھا۔ غالباً بہروں کی بات کر رہا تھا۔ روہ کچھ گراڑے سی ہوئی۔۔۔ کوئی چیز اور سے اُدھر کی چیزوں سے مل کر اُدھر پر کو اٹھی۔۔۔ نیچے آگئی۔۔۔ پھر گراڑے سی ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔۔۔ دماغ کی نایوں میں بیتنے لگی، سرسراہٹ محسوس ہورہی ہے۔۔۔ پر نرمی نرم نرم۔۔۔ پہلے نرم تھا۔۔۔ پورے اعلان کے ساتھ۔۔۔ اب یہ غصے میں تبدیل ہو رہا ہے۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔ ہوئے ہوئے۔۔۔ جیسے آبی گدگدے پتھریں پر چل رہی ہے۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ زور سے میاؤں ہوئی۔۔۔۔۔ لہر ٹوٹ گئی۔۔۔۔۔ غائب ہو گئی۔ اور وہ چومک پڑتا۔

خوڑے وقفے کے بعد وہ پھر یہی کیفیت نئے سرے سے محسوس کرتا۔ لا

اب پھر نون کے اعلان کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گڑ بڑ شروع ہو گئی ہے۔۔۔۔۔
 اس پاس کی چیزیں یہ اعلان سنتے کے لئے جمع ہو رہی ہیں۔ کانا پھوسیاں بھی
 ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ ہو گیا۔۔۔۔۔ اعلان ہو گیا۔۔۔۔۔ نون اور پرگراٹھا۔۔۔۔۔
 آہستہ آہستہ نیچے آیا۔۔۔۔۔ پھر وہی گڑ بڑ۔۔۔۔۔ وہی کانا پھوسیاں۔۔۔۔۔
 اس پاس کی چیزوں کے ہجوم میں نون نے انگڑائی لی اور دینگئے لگا۔۔۔۔۔ غنہ
 کھج کر لمبا ہوتا بار رہا ہے۔۔۔۔۔ کوئی اسے کوٹ رہا ہے، روٹی کے ہتھوڑوں سے
 ۔۔۔۔۔ ہنر میں سنائی نہیں دیتیں، لیکن ان کا نھانا، پر سے بھی ہکا مس
 محسوس ہو رہا ہے۔۔۔۔۔ نون، نون، نون۔۔۔۔۔ جیسے بچہ ماں کا دودھ پیتے
 پیتے سو رہا ہے۔۔۔۔۔ ٹھہرو، دودھ کا جیلد بن گیا ہے۔۔۔۔۔ لودھ پھٹ بھی
 گیا۔۔۔۔۔ اور وہ پھر چمک پڑتا۔

مجھے یاد ہے، میں نے اُس سے کہا تھا کہ وہ اپنے اس تجربے، اپنی اس
 کیفیت کو اشعار میں من و عن بیان کرے۔ اس نے وعدہ کیا تھا، معلوم نہیں اس
 نے ادھر توجہ دی یا مبول گیا۔

کرید کرید کر میں کسی سے کچھ بڑھ چھا نہیں کرتا۔ سرسری گفتگوؤں کے دوران
 میں سراجی سے مختلف موضوعوں پر تبادلہ خیالات ہوتا تھا، لیکن اس کی ذاتیت
 کبھی سرزنش نگویش نہیں آئی تھی۔ ایک مرتبہ معلوم نہیں کس سلسلے میں اس کی
 اجابتِ جنسی کے خاص ذریعے کا ذکر آگیا۔ اُس نے مجھے بتایا، اس کے لئے

اب مجھے خارجی چیزوں سے مدد دینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر ایسی ٹہانگیں
 جن پر ٹیل آتا رہا جو اسے خون میں قطرہ پڑتی خاموشیاں
 یہ سُن کر میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا جی کی ضلالت اب اس انتہا کو پہنچ گئی
 ہے کہ اسے خارجی ذرائع کی امداد طلب کرنا پڑ گئی ہے۔ اچھا ہوا جو وہ جلد ہی مر گیا
 کیونکہ اس کی زندگی کے خرابے میں اور زیادہ خراب ہونے کی گنجائش باقی نہیں
 رہی تھی۔ وہ اگر کچھ دیر سے مرقا تو یقیناً اس کی موت بھی ایک دردناک پہام
 بن جاتی۔

باری صاحب

ستبد اور جابر حکمرانوں کا عبرت نامہ انجام
دوس کے لگی کوجوں میں سدائے انتقام
زاریت کے تابوت میں آہنری کیل

ان تین علی سرخوں کے قد آدم اشتہار امرتسر کی متعدد دیواروں پر
چسپاں تھے۔ لوگ زیادہ تر صرف یہ سرخیاں ہی چڑھتے تھے۔ اور آپس میں چہ میگوئیاں
کرتے چلے جاتے تھے۔ معلوم نہیں سن کر نہ تھا۔ مگر موسم گرما یوں کا تھا اور ایسے
موسم امرتسر میں گتے ہی رہتے تھے۔ غالباً ان دنوں بموں کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں
خط ڈالنے والے لال لال بیگلوں میں آگ لگنے والی چیزیں ڈالنے کا شغل بھی جاری
تھا۔ نفا خاص بھی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ اشتہار جو امرتسر کی دیواروں پر عجب

جہاں تھے۔ پاس سے گزرنے والوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے تو حقے مگر وہ جلدی جلدی نظروں سے اشتہار کی عبارت کے چند نواسے اٹھا کر اپنا راستہ پکڑتے تھے کہ کہیں اسی جرم میں نہ دھریے جائیں۔

یہ اشتہار آسکر ولڈ کے ایک گھٹیا سے ڈرامے دیڑا کے اردو ترجمے کا تھا جو میں نے اور میرے جگر بیٹے حسن عباس نے مل کر کیا تھا۔ اور اصلاح اختر شیرانی سے لی تھی۔ باری صاحب نے جو میرے اور حسن عباس دونوں کے گرو تھے اس ترجمے میں ہماری ٹبری مد کی تھی۔ کتاب ہم نے خود شنائی، برقی پریس میں چھپوائی تھی باری صاحب اس کے تمام قسطے خود اپنے کندھوں پر لا دلا کر گٹر لائٹس خفے تاکہ محفوظ رہیں۔ ان کو خط لکھا کہ پولیس چھاپہ مار کر پریس میں سے مادی کتاب اٹھائے جائے گی۔ میرے اور حسن عباس کے لئے یہ سب سلسلہ بڑا دلچسپ اور حیرت بخش تھا۔ جیل میں کیا کیا صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں، تھانوں میں کیا دنگت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق ہم سے پوچھو اور کھنڈلے سے داغ کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر قید ہو گئے تو یہ وطن کے لئے بڑی قربانی ہوگی۔ رہا ہو کر آئیں گے تو لوگ ہر پہنائیں گے اور مجلس نہ لیں گے۔

ڈراما، درس کے دہشت پسندوں اور نوجوانوں کی سرگرمیوں کے متعلق تھا۔ جن کے پاس ہر قسم کے تجویز موجود تھے۔ اس قسم میں ان دنوں اگر کوئی ہولائی بندوق سے بین سلج ہونا چاہتا تو یقیناً اُسے توپ دم کر دیا جاتا۔ کہاں اسکو، کہاں اتلسز

گرمیں اور حسن لباس نئے نئے باقی نہیں تھے دوسری جماعت میں دنیا کا نقشہ نکال کر ہم کئی بار خشکی کے رستے روس پہنچنے کی ایکسپیں بنا چکے تھے حالانکہ ان دنوں قیصر و زلیخا منصور بھی کامریڈ ایف۔ ایس۔ منصور نہیں بنے تھے۔ اور کامریڈ سجاد ظہیر سرٹائیڈ بنے میاں ہی تھے ہم نے امرتسری کو داسکو منصور کر دیا تھا۔ اور اسی کے گلی کوچوں میں مستبد اور جابر حکمرانوں کا انجام دیکھنا چاہتے تھے۔ بکثرت وہ جیل سنگے، کمرے، قیود و ضوابط، چوک فریڈ میں زارت کا تابوت گھسیٹ کر اس میں آخری کیل ٹھونکنا چاہتے تھے۔ کیل ٹیڑھی ہوجاتی یا تھوڑے کی ضرب اُس کے بجائے ہماری کس انگلی کو زخمی کر دیتی۔ اس کے متعلق سوچنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ — باری صاحب —

۱۰ اشتر کی ادیب باری ہمارے گرد تھے۔ سوچنا ان کا کام تھا۔ لیکن بچے بار بار عکس ہوتا تھا کہ یہ آدمی جس کو ہم نے اپنا رہنا بنایا ہے۔ بڑے کمزور دل کا آدمی ہے۔ ذرا سا پتا کھڑکتا تھا۔ قرودہ چونک پڑتے تھے پر ہماری پُر خلوص گرجویشی ان کے مترنزل قدوں کو ہمیشہ مضبوط بنا دیتی تھی۔

اب سرجا جانے تو اس زمانے کی سب حرکتیں چھوٹے چھوٹے کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت یہ کھونے ہی عظیم المیہ اور فزیکل تھے۔ ان سے بچہ لڑانا گویا کسی دیر سے زور آزمائی کرنا تھا۔ ہمارے غیظ صاحب یعنی باری اگر بزدل نہ ہوتے تو یقیناً ہم چاروں (کچھ مرے کے بعد ابو سید قریشی بھی ہمارے تگڑے سے) میں شامل ہو گیا تھا، اسی زمانے میں ان کھونوں سے اپنا ہی بھٹانے کے جرم میں

پھانسی پانگئے، جیسے اللہ امرنسر کی پادی تاریخ میں ایسے شہیدوں کے نام کا اضافہ ہو گیا ہرنا جو اب غموس دل سے کہہ سکتے ہیں کہ اُن کو اس وقت اپنے اس عرش کے رُخ کا بھی صبحِ علم نہیں تھا۔

میں نے بادی صاحب کو بزدل کہا ہے ان کی شخصیت پر کسی محلے کی غرض سے نہیں، اصل میں ان کی شخصیت کی ترقیب و تمدن میں اس بُزدل کا پست مقام تھا۔ یہ تھا اگر کسی وجہ سے ان کے ماضی اور جہانی نظام سے یہ کمزوری نکل جاتی تو وہ، وہ بادی نہ ہوتے جو رہتے۔ ان کا شخص باطلِ مجہادِ انتم کا ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ الکی کے مشہور عالم کھٹاری جیسے اور دوسرے نامور کھٹاریوں کی طرح اُن کی عمر کسی ریاست کی نوکری میں گزرتی رہے، ہو سکتا تھا کہ وہ پرائمری اسکول کے استاد سے ترقی کرتے کرتے کسی یونیورسٹی کے ریڈر ہو جاتے اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ جگت سنگھ کی طرح بباڑہ جتنے جگت سنگھ اپنی کے ضلع یعنی لاہور کا رہنے والا تھا۔ اللہ بادی صاحب اُس کو اچھی طرح جانتے تھے۔ یہ صرف بُزدلی ہی کا باعث ہے کہ وہ ہمیشہ ادھر کے رہے، نہ اُدھر کے، ساری عمر جہاں رہے ملحق رہے اور میں تو سمجھتا ہوں اس عدوان میں اُن کے بلا کے نیز داغ میں جو خیال بھی پیدا ہوا۔ بزدلی کی کھونٹی سے لٹکا رہا۔

بادی صاحب بڑی بڑی نرالی باتیں اور اُسکیں سوچتے رہے ایسی جو کسی اور کے ذہن میں آسانی کے ساتھ نہیں آ سکتیں۔ مگر یہ اتنی مرحمت سے غائب ہو جاتی تھیں

کہ ان کے آثار تک بھی نہ رہتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ انہوں نے زندگی کے مسند میں اچانک کس دلچسپ ٹاپر کی موجودگی کا انکشاف کیا، اس کو سر کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر عمل میں لائی جانی چاہئیں۔ سب کی سب سمجھا دیں۔ وہاں پہنچ کر جو نعمتیں اور گڑھی ہوتی وہ تیس تیس کرائیں گی، ان کی تصویر کشی بھی کر دی۔ سننے والے کربند کر اس ہم کے لئے تیار ہو گئے۔ ان میں سے کچھ رخصت سفر باندھ کر روانہ بھی ہو گئے لیکن جب ٹرک کے دیکھا تو باری صاحب غائب۔۔۔۔۔ واپس آکر ان سے استفسار کرنا چاہا۔ تو انہوں نے کسی اور دلچسپ جزیرے کا ذکر چھڑ دیا۔ جو وہ اس دوران میں دریافت کر چکے تھے۔

مذکورہ مسند اشتہار چپاں کرنے کے بعد چنانچہ یہی ہوا۔ میں اور عباس دونوں مات بھر گرفتار پڑنے کی سسکی کے ساتھ آدھے سوئے، آدھے جاگتے رہے۔ دوسرے روز نئے نوے دو لہروں کی طرح ہم تھرکا رہا باری کو ڈھونڈتے رہے کہ ان سے پوچھیں۔ آگے کیا ہوگا۔ مگر وہ غائب تھے۔ دو تین جگہیں تھیں جہاں وہ جاتے تھے۔ مگر اندس سے کسی ایک پر بھی وہ موجود نہیں تھے۔ چند روز بعد کے بعد اچانک نووار ہوئے تو انہوں نے ایک تھقہ دار پرچہ جاری کرنے کی اسلیم سے ہمیں اپنے مخصوص انڈاز میں مطلع کیا: میں آپ کی طرح بیکار نہیں تھا۔ سارے انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ بس ٹرانزیشن داخل کرنا ہے۔ معنوں میں آج ہی سے کھانا شروع کر دوں گا۔

آخر سر کی دیواروں پر نذرانیت کے تابوت میں آخری کیل شونہ کھنے والے ختم ہو چکے

تو کھڑ گئے۔ اور کچھ قوتِ مردمی کی دوائوں کے پوسٹروں سے دب گئے اور ہمارا جوش اور محسوس متعلق ہو کر ہفتہ وار سوچے کی ابتدائی کارروائیوں میں داخل ہو گیا۔

”دیر“ ناقص کتابت اور واہیات طباعت کے باعث میرے گھر میں مقفل پڑی رہی۔ لیکن ”خلق“ کے صوری صحیح کے لئے ہم نے اپنی پہلی فروگزاشتوں سے فائدہ اٹھایا۔ جب اس پرچے کا پہلا شمارہ ثنائی برقی پریس سے میں اور باری صاحب کندھوں پر اٹھا کر گھولائے تو اس کی گزرا کتابت و طباعت سے ہم بہت مطمئن تھے۔

باری صاحب کے ایک کرم فرما تھے۔ میں ان کا نام بھول گیا ہوں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ سیاحہ ڈاڑھی والے ایک صاحب تھے جو غائب چھوٹے کے سوداگر تھے۔ ”خلق“ کے اجراء میں مالی ہاتھوں کا تھا۔ وہ اور بھی سربراہ لگنے کے لئے تیار تھے۔ مگر باری صاحب میدان چھوڑنے کے بھاگ گئے۔

پہلے شمارے میں سرورق پرائی کا ایک مسنون تھا ”ہنگل“ سے لے کر کابل مارکس تک۔ ایک محترم سا خا کر تھا۔ اشتراکی فلسفے کے ارتقاء کے بارے میں جو میسر ہی تھی۔ حسن عباس کی فہم سے بالاتر تھا۔ اصل میں ہم ہنگل سے واقف تھے دکھارل مارکس سے آخر الذکر کا نام باری صاحب سے کئی مرتبہ سنا تھا۔ جس سے ہم کو اتنا معلوم تھا کہ وہ مزدوروں کا بہت بڑا حامی تھا۔ اس کا فلسفہ کیا تھا۔ اور اس کے ڈانڈے حکیم ہنگل سے کہاں اور کیوں کرتے تھے۔ ایمان کی بات ہے۔ اس کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ اچھے افسانوں کے تدریسن کی رپسی کے لئے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ کہ

میرا سب سے پہلا طبعیزاد افسانہ "قاتلہ" کے عنوان سے "خلق" کے اسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ میں نے اس پر اپنا نام نہیں دیا تھا۔ اس گزرتے کہ لوگ مذاق اڑائیں گے۔ ان دنوں میرے جاننے والے ان دنوں قاتلہ میری سقیم تحریریں پر خوب ہنسا کرتے تھے لیکن عجیب بات ہے کہ باری صاحب نے جن کو میری عمدہ عظمت کا پتہ تھا میری ہیشہ حوصلہ افزائی کی۔ یہاں تک کہ مجھے میری افراط سے بھی کبھی روشناس نہ کیا وہ کہا کرتے تھے: "سب ٹھیک ہے؛"

بات میں سے بات نکل آتی ہے۔ مجھے باری صاحب کے میدان چھوڑ کر جاگ جاتے کے شوق کچھ کہنا تھا: "خلق" کا پہلا شمارہ شائع ہوا، تو چند روز بڑے جوش و خروش میں گزرے۔ میں اور ہماس یوں محسوس کرتے تھے، جیسے ہم سے کوئی بڑا کارنامہ سرزد ہو گیا ہے۔ کئی روز جیل سنگے اور ال بازار میں ہم ایک نئی شان سے چلتے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ہمیں محسوس ہوا کہ امرتسر کی نظروں میں ہم ویسے کے ویسے آوارہ گرد ہیں۔ ہاں سگڑت والے بستر پر اپنے پیروں کا تھکا کرنا اور خاندان کے بندگان برابر اپنا وہی فیصلہ سنا دیتے تھے کہ ہمارے تھکن اچھے نہیں۔ تھکن داتی کچھ اچھے نہیں تھے۔ اس لئے کوئٹہ پولیس نے پوچھ گچھ شروع کر دی اور اسی سلسلے میں کوچہ دکیلاں تک پہنچ گئی۔ میرے بہنوئی خواجہ عبدالحمید صاحب ان دنوں نئے نئے ریٹائر ہوئے تھے۔ آپ ایک سرے تک پھلور کے پولیس اسکول میں اسکو روکے تھے۔ اس لئے پنجاب پولیس کے قریب قریب تمام آدمیوں کو جانتے تھے۔

خیز پولیس کے سپاہی جب باری صاحب کا آنا پتا معلوم کرنے کے لئے کوچ و کیلاں میں پہنچے تو ان کی خواجہ صاحب سے ملے بیٹھ رہے تھے۔ وہ باری صاحب کا وہ خلقِ پاک معنوں کیلئے سے کارل مارکس تک نہ پڑے چکے تھے۔ اس کے علاوہ باری صاحب کو بھی اچھی طرح جانتے تھے اور تاریخ سے جہاں کو دلچسپی تھی۔ اس کی قدر کرتے تھے۔ ان کا انداز بیان جو خطیبانہ ہوا کرتا تھا۔ انہیں پسند تھا۔ اس لئے انہوں نے خیز پولیس کے سپاہیوں سے کہا: ”جاؤ! کوئی اور کام کرو۔ یہاں کارل مارکس باری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ غریب باری بھی ابھی تک ان کے تھکنے کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔

خواجہ صاحب نے جب اُن کو یقین دلایا کہ معنوں میں کوئی بغاوت انگیز چیز نہیں جس سے سرکارِ برطانیہ کا تختہ اٹھنے کا اندیشہ ہو۔ تو وہ چلے گئے۔ لیکن جب باری صاحب کو اس کا پتہ چلا کہ حکومت کی مشینری حرکت میں آگئی ہے۔ تو انہوں نے ”خلق“ کا صرف دوسرا پرچہ نکالا اور اسے میرے پاس چھوڑ کر کہیں غائب ہو گئے اور بہت دیر تک معلوم نہیں کیا کہ کہاں گھومتے رہے مجھے یاد ہے کہ ان کا ایک کارڈ ملایا تھا۔ جس میں کچھ اس قسم کا معنون تھا: ”ملتان کی روڈ گاہوں میں اپنے ستاروں کا مطالعہ کرو رہو“۔

یہ عجیب بات ہے کہ گردش کے دوران میں جب کبھی اُن کا خط کسی شہر سے آتا تھا تو اس میں یہ اطلاع انہی الفاظ میں ضرور ہوتی کہ وہ اس کی روڈ گاہوں

اپنے ستاروں یا نجوم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ مطالعہ میرا خیال ہے۔ وہ ہراسٹس لگی ہراسٹس کو پچے کی رصدگاہ میں کستے ہے جہاں انہوں نے کچھ عرصے کے لئے قیام کیا قبر کی تاریک رصدگاہوں میں بھی وہ یقیناً ان ہی ستاروں کے مطالعے میں مصروف ہوں گے۔ مگر انوس ہے کہ وہ یہاں سے نیچے کوئی ٹاک کارڈ نہیں بھیج سکتے۔

مرحوم کو ٹاک کارڈ بہت پسند تھے۔ اس نے کوفوں کے مقابلے میں ان پر خرچ کم ہوتا ہے۔ اس کا جواب دینے کے معاملے میں وہ بہت سست تھے۔ یاد ہے۔ ایک بار میں نے انہیں اسٹریٹ پے وہ پے کی خط لکھے۔ جب کوئی جواب نہ آیا۔ تو میں نے پانچ پانچ پیسے کے ڈسٹکٹ ان کو روانہ کئے اور یہ تاکید کی کہ وہ اب جواب ضرور دیں۔ ان کا جواب آیا۔ مگر ٹاک کارڈ پر لکھا تھا کہ ہمارے بھیجے ہوئے ڈسٹکٹ میں نیچے ٹالے۔ ایک کارڈ خرید کر تمہیں مکھڑا ہوں کہ تمہارے سب خط مجھے مل چکے ہیں۔

مجھے بہت غصہ آیا۔ فوراً لاہور پہنچا۔ ارادہ تھا کہ ان کی طبیعت صاف کر دوں گا۔ مگر جب ہم عرب ہوٹل میں بیٹھے اور میں نے ان کی فریمل حرکت کے متعلق بات کرنا چاہی تو انہوں نے لاہور کی رصدگاہوں میں میرے ستاروں کا مطالعہ شروع کر دیا اور آخر میں فیصلہ ہوا۔ تم گھر کے معاملات ٹھیک ٹھاک کر کے لاہور چلے آؤ اور کسی اخبار میں ملازمت کر لو۔

ایسے کئی مرتبے آئے کہ میں نے بڑی سنجیدگی سے باری صاحب پر اپنی

مجھے فرشتے

خفگی و ناراضی کا اظہار کیا اور وہ بھی اس امارے کے ساتھ کراہی میری کُتی ہوئی
مگر اُن کی باتیں کچھ ایسی تھیں کہ مجھے غیر مسلح کر دیتی تھیں، مٹا مٹا گول چہرہ، سیاہی
مائل گندمی رنگ، بہت بڑا سر، قد متوسط، کالے کالے ہونٹ، مسوڑھے بھی کالے
مگر جب ان کے چہرے پر سکراہٹ نمودار ہوتی تھی، تو اس پاس کے تمام خط وصال
اپنی سیاق و سباق پر چھیلے۔ جو عدالتوں کی ہی خشک سنجیدگی اور ستائش کا باعث ہوتی
تھی صرف ان سکراتے ہوئے لمحات کی رصدگاہوں میں وہ اپنے ستاروں کا مطالعہ
نہیں کرتے تھے اور میں سمجھتا ہوں کہ صرف انہی لمحات میں ان کے مسلسل مطالعے سے
اکٹائے ہوئے یہ ستارے بھی غموؤں کی دیر کے لیے سکرا جیتے تھے۔

باری صاحب بزدل تھے، خدا کی قسم بہت بزدل تھے۔ زیادہ کہا جیتے تو ڈرتے
رہتے تھے کہ ان کی تو نہ نکل آئے گی۔ حالانکہ فاتح کے زمانے میں بھی ان کے جہم کا یہ
حصہ بڑھتا رہا، زیادہ تیز نہ لگے نہیں تھے کہ ان کے دل پر اس کا اثر پڑے گا۔
حالانکہ ان کے جہم کے اسی ریش عنصر نے ان کا ساتھ چھوڑا۔ بڑی بڑی سرخ جہادوں
کے نیلے نقشے تیار کرتے تھے۔ اور پٹانے کی آواز سن کر زرد ہوجاتے تھے۔ ان کو ایک
ڑکی سے محبت تھی، لیکن ماں باپ کسی اور سے ان کا رشتہ پکا کر چکے تھے جب انکو
معلوم ہوا کہ مشق فرما رہے ہیں تو انہوں نے شادی کی تاریخ پتلی کر دی۔ باری صاحب
اُن دنوں میرے ساتھ رہتے تھے۔ جب تاریخ نزدیک آئی، تو غائب ہو گئے۔ لیکن
کمرے کی ماں زیادہ دیر تک خیر نہ ماسکی۔ اُن کی ہونے والی دوا میں نے ایک بڑا مگر

کا خط لکھا جس میں یہ دھکی دھج مٹی کو اگر انہوں نے اس سے شادی نہ کی تو وہ ان کو پھٹ میں پھری بھونک دے گی۔ باری صاحب ڈونگئے اور شادی کر لی۔

برہ کی رسدگاہوں میں اپنے ساروں کا مطالعہ کرنے کے لئے نیچے تو وہاں ایک برہی ہوئی کا ستارہ ان کے ستاروں سے ٹکرا کر ان میں الجھ گیا۔ آپ نے اپنی بیوی کو وہاں بٹایا لیکن ساروں کا الجھاؤ بدستور قائم رہا۔ آخر جنگ چھڑنے پر ان کو ایک برہو ملا اور وہاں سے بھاگ آئے۔

چلے رن چھوڑ قسم کے آدمی تھے۔ اقبال کی خودی کا فلسفہ ان کو اس قدر پسند آ گیا تھا کہ اس کو اپنا اور صابھونا بنا لیا۔ مگر سردیوں میں معلوم ہوا کہ یہ کام نہیں دے سکتا اقبال کے ارشاد کے مطابق انہوں نے اپنی خودی کو متحد و برابر ادب کر کے کی گمشدگی کی بجائے باری تعالیٰ نے ان سے کبھی یہ پوچھنے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ اے باری تیرا فیضان کیا ہے آخر ایک دن وہ خود ہی اقبال سے پوچھنے لگے کہ یہ گڑ بڑ کیا ہے۔

ان دنوں باری صاحب کی اپنے اخبار کے دفتر میں رات پالی ہوتی تھی آخری کالی پریس بھیج کر حب فارغ ہوتے تو علامہ اقبال مرحوم کی قبر پر چلے جاتے اور پیر تک ان کی روح سے فلسفہ خودی پر بات چیت کرتے رہتے، بہت تنگ حال تھے تنہا کبھی مہمیں ملتی تھی اور وہ بھی فسطوں کی صورت میں اخباروں کے مالک یہ سمجھتے تھے کہ ان کے لئے کسے آدمی بار بردار حیوان ہیں جسکو جو کچھ دے دیا جائے۔ وہی بہت ہوتا ہے باری صاحب حساس آدمی تھے۔ قرض لیتے تھے مگر بوجھ عموماً

کرتے تھے۔ خودی کو وہ کافی ہندسی پرلے گئے تھے۔ مگر اب اس میں اور زیادہ ہلنکا
 ٹمک پنچے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی چنانچہ تینا کو مٹا کر قبر پر گئے اور ان کی روح
 سے بڑے باغیاز سوال کرتے شروع کر دیئے۔ میرا خیال ہے اگر علامہ زندہ ہوتے تو
 انہیں ان سوالوں کا جواب دیتے وقت بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔

جنودت کا یہ جوش بھی ان کے دل و دماغ میں ٹھنڈا ہو گیا۔ اگر بزدل نہ ہوتے تو
 میرا خیال ہے کہ عام انسانی زندگی پر اقبال کے فلسفہ خودی کے تطبیق و اطلاق کے
 شے پر یقیناً بصیرت افروز روشنی ڈال سکتے۔ مگر وہ تمام کونہیں جو ان کے حساس
 دل و دماغ کی شاخوں سے جوش کے باعث پھوٹی تھیں، اس بزدلی کے باعث جھا
 گئیں معلوم نہیں، ان کے دوسرے دوست چھوٹے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن میں
 سمجھتا ہوں۔ اگر وہ ثابت قدم ہوتے اور گرد و پیش کی مخالفت قوتوں کا مقابلہ ڈٹ
 کر کرتے تو ان کے قلم سے "انقلاب فرانس" کے بجائے "انقلاب ہندوستان" نکلتی اور
 یہ بھی ممکن ہے کہ اٹھارہ سو ستاون کا تاتاریا ٹوپی ان کے غالب میں دوسرا جنم لیتا۔
 اقبال کی طرح وہ بھی خدا سے یہ کہتے رہے۔ "کارو جہاں دراز ہے، اب میرا آتما
 کز۔ مگر اس وقت جب کہ ان کو خدا کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آتا تھا۔ بس کہ
 جب بلاوا آیا تو وہ کارو جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر دکہہ سکے، اور اقبال
 کے مانند چل دیے۔ وہ گنجشک، فردا یہ کو شاہین سے لڑانے کے لئے تیار کرتے
 رہتے۔ مگر جب اسے پانی میں آنا نہ کے کامر حل آتا تو بجز وہیں چھوڑ کے بھاگ جاتے

اس غریب کو دو دو چھپیں لینے اور شکست کھانے کا بھی موقع نہ ملتا۔

باری صاحب خیالی پلاؤ پکانے کے مسئلے میں اول درجے کے بکا دل تھے ایسے ایسے لکڑی پلاؤ اور بریاں تیار کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ دیر تک دمنوں کے دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا تھا مجھے یاد ہے جب "خلق" دو اشاعتوں کے بعد انہوں نے بند کر دیا۔ اور چند اخباروں میں کام کرنے کے بعد انہیں کچھ حاصل حصول نہ ملا۔ تو انہوں نے ایک ہفتہ دار اخبار "موج" نکالنے کا ارادہ کیا اس کی سرخیاں کیسی ہوں گی۔ مضامین کس نوعیت کے ہوں گے۔ اس کے متعلق انہوں نے گفتگوں کے ذریعے سے ایسی تصویر کشی کی کہ اس مجوزہ پرچے کے کئی شمارے آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے اور دیر تک فصلکے آسمانی سے ہم چوس رہے تھے موجوں کی بارش ہوتی رہی ایک بداد و مصافحہ کے پچھے سے تنگ آئے تو جنگ کا یہ رشتہ نکالا کہ وہ اسے چھوڑ چھاڑ کے چارہ کاشنے کی شین لگائیں گے اور مزے کی زندگی بسر کریں گے اس مزے کی زندگی کو انہوں نے تصود کی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنا شروع کر دیا جو میرے ذہن پر مرقم ہو گیا۔ چنانچہ بہت بعد میں جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا میں نے ایک ریڈیائی ڈرامہ "جہنم" نے عنوان سے لکھا۔ اس کے مرکزی کردار کا نام باری ہی تھی جب یہ نشر ہوا تو ایک جنگ مر پا ہو گیا ہندوستان کے قریب قریب ہزار دو اخبار نے اس کے خلاف نوٹ لکھے اس لئے کہ اس سے اخبار کے مالکوں کی توہین ہوتی تھی لیکن ٹریڈ ہی سیہ

تھی کہ ان صحافیوں سے اس کے خلاف اکھڑایا گیا جن کی ناگفتہ بہ حالت کی عکاسی اس مین کی گئی تھی۔

یہاں پر اس ڈرنے کے چند امتیاس نقل کرنے شاید بے عمل نہیں ہوں گے۔
جورنلسٹ ہادی صحافت چھوڑ کر چارہ کٹنے کی مشین لگا لیتا ہے اور بہت خوش ہے
اس کی خود کلامی ملاحظہ ہو۔

جادوئی: رومنڈریچم دودھ کے آئین ہو جاتی ہے۔ سارا دن یہاں دکان پر
گھومتا ہوں۔ شام کو ٹیکے پر چلا جاتا ہوں اور گیس ٹانگہ کر پھر شہنشاہیہاں
آ جاتا ہوں۔ خبریں ترجمہ کرنا پڑتی ہیں دکانی جڑنا پڑتی ہے شیمنون کی بک
بک دھڑا سلوں کی بکواس کاتب ڈرامٹیکس سروں۔ والٹڈیا گڑ بتایا ہے میرے
دوست نے۔ سرویاں آئیں گی کہ اندکھاس کے پاس چار پانی بچا لیا کروں گا۔
کتنی اچھی زندگی ہے۔ میری قریب مرضی ہے کہ سب ایڈیٹروں کو جو اخباروں میں
اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں ایہ گڑ بتا دوں۔ اپنے اپنے شہر میں ایسے مشین لگوا
لیں اعلیٰ دعامیں دیں۔

زندگی بڑی سہوار گزرد رہی تھی کہ اچانک دوسری جنگ عظیم چھوٹ گئی اس کی
اطلاع باری کو شراب خانے میں ملتی ہے اور اس کے دل و دماغ میں سوبہا ہوا آسمانی
جاگ پڑتا ہے اس کو بہت کوفت ہوتی ہے۔ جب وہ اس پاس بیٹھے ہوئے ٹراپیوں
کی گنت گوستا ہے جو بیروں سے متعلق ہے تنگ آمدہ چلا آٹھتا ہے۔

باری: خاموش۔ یہ تمہنے کیا بکواس شروع کر دی ہے۔ تم لوگ راتوں رات نکل جاؤ
 ہو لہو پ میں ایک ایسی جنگ شروع ہوئی ہے جو سنی ملکوں کو دنیا کے
 نقشے سے ہمیشہ کے لئے مٹا دے گی۔ لاکھوں کروڑوں آدمی ہلاک ہو
 جائیں گے۔ دنیا میں ایک غولان پھج جائے گا اور تم لوگ بیروں کی لڑائی
 کا حال بیان کر رہے ہو؟ تو تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

ایک ششرا بی: کیا کہتا ہے یہ۔

دوسرا ششرا بی: قہقہہ لگا کر میں تو کچھ دیکھا — (بدی سے) باری
 — یہ کئی نکالیں باتیں بے بیجا ہے۔

پہلا ششرا بی: زیادہ پی گیا ہے۔

دوسرا ششرا بی: بڑی نامراد چیز ہے۔

بدی: تم بکواس کرتے ہو۔ میں بالکل جھش میں ہوں۔ تم بے ہوش ہو رہے ہو۔
 جو کچھ میں اس وقت سوشل دماغ ہوں کہہ رہا ملک میں نہیں سوشل سکتا۔

پہلا ششرا بی: ارے ارے وہ ارے میرے مولوی۔

باری: تم میری باتوں کا مضحکہ نہ اڑاؤ رہتا ہے، مگر یہ تمہارا مقصد نہیں،
 میرا اپنا ہے۔ میں نے اب ملک اپنی اصلیت تم سے چھپائے دکھ ہے۔

————— تم نہیں جانتے میں کون ہوں اور سیاسی دنیا میں میری کس

قدر اہمیت ہے۔

پہلا شرابی :- میں تم رستم ہونے پس اب جانے دو۔ کوئی ادب بات کرو۔
 بادی :- تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم نہیں ہوگی، تم میرا منکر اڑاتے
 رہو گے۔ جانتے ہو میں کون ہوں۔ میرا نام عبد البادی ہے۔ — مولانا
 عبد البادی روزنامہ "خلق" کا ایڈیٹر۔

اس آخری جلیں جہالمیہ پر شیدہ ہے وہ کسی تبصرے کا مستحق نہیں بادی درجہ
 نے باآخر صافست چھوڑ دی تھی اور چارہ کاشے کی مشین لگالی تھی گو یہ مشین ان کی نہیں
 سرکار برطانیہ کی ملکیت تھی وہ آخری دنوں میں برٹش انفرمیشن ڈیپارٹمنٹ میں حکم
 ہو گئے تھے اور ان کا منکر اڑاتے تھے اس لئے کہ صدی عمر انگریز کو گالیاں دینے
 کے بعد انہوں نے اس کی نوکری قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ یقیناً دل ہی دل میں یہ ضرور کھپتے
 رہے ہوں گے :- تمہیں جب تک میری اصل شخصیت معلوم ہوگی تم میرا منکر
 اڑاتے رہو گے۔ — مگر یہ تمہارا قصور نہیں میرا پاشا ہے۔ — میں نے
 اب تک اپنی اصلیت تم سے چھپائے رکھی!

یہ میری اپنی تاویل و تعبیر ہے کہ بادی صاحب نے اپنی زندگی میں ہمیشہ فرار
 کے واسطے اختیار کئے اور ان ماستوں پر بھی انہوں نے ہمیشہ پھونک پھونک کر قدم
 دکھائی ہیں وجہ ہے کہ ان کی روح لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہی اور اس میں
 قصور سراسر ان کا پاشا تھا۔ وہ جی جی چٹائی سے ٹکر لینے کے لئے لگے رہتے
 تھے۔ لیکن ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا تھا اور یہ سب کچھ ان کے اپنے دماغ میں

ہر تانتا۔

اس ڈرامے میں باری ایک جگہ اپنی رو میں یہ کہتا ہے۔
 باری :- پہلی جنگ سے لے کر اس جنگ کے آغاز تک کے واقعات
 کما کر ہم پیش نظر کہیں تو یہ معلوم کر کے بڑا دکھنا ہے کہ مہذب
 دنیا ذلت کی دلدل میں دھنس گئی ہے۔ سائنس کی ترقی جلدی رہی ہے
 لیکن اخلاقی ذمہ داری کا احساس کم ہوتا چلا گیا ہے۔ نوع انسانی جہاں
 تھی وہیں کی وہیں کھڑی ہے۔ نسل امتیاز اور مذہبی حدود پرستی
 گھٹی ہے۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ پیچھے جنگ خاصہ صلح پر
 صلح نا جنگ — میں چھپتا ہوں آخر یہ مہدی مہذب دنیا کدھر جا
 رہی ہے۔ کیا ہم پھر صلیب کے زمانے میں جا رہے ہیں۔ کیا ایک بار پھر
 انسان کا خون پانی سے بھی اڑاں بنے گا — کیا پھر ہمارا گوشت
 پوست دوسری اجناس کی طرح بازاروں میں بیچا جائے گا — ؟
 — کیا ہونے والا ہے ؟ کوئی مجھے بتائے کیا ہونے والا ہے
 بے اصول نے سیکڑوں اصول اور تفرقہ پر وادی لے ہزاروں
 جماعتیں پیدا کر دی ہیں۔ انسان انسان کے خلاف۔ ملت ملت سے
 نیر و آزار — ملک ملک سے ستیرو کار — یہ ہے انیسویں
 صدی کی داستان :-

یہ خیالات ہر ٹرینڈرسل کے میں جریں نے باری صاحب کے مخصوص خلیانہ انداز میں مکالمے کی شکل میں تبدیل کر دیئے تھے باری صاحب کا دماغ ہر ٹرینڈرسل کے دماغ سے کم نہیں تھا لیکن وہ ایک ایسے ملک میں پیدا ہوئے تھے جس کے اخباروں کے مالکوں سے تنگ آ کر انہیں کٹ باریہ کہنا پڑا تھا۔

باری صاحب آپ قوم کی خدمت کرتے ہیں میں قوم کی اور اخبار کی خدمت کرتا ہوں لیکن اس خدمت کا معاوضہ مجھے وقت پر کبھی نہیں ملتا بلکہ میں کہیے کہتا ہی نہیں۔ چار بجنے میں آپ نے صرف سولہ روپے دیئے ہیں۔ خدا کا خوف کیجئے۔ میں انسان ہوں پتھر نہیں ہوں مجھے جھوک بھی لگتی ہے کبھی کبھی مٹھان کاٹنے کو بھی جی چاہتا ہے مجھے آپ نے اس اخبار کا ایڈیٹر بنایا تھا۔ سیاسی یا سادھو نہیں بنایا تھا جو میں نے دنیا تیگ دی ہو۔

چار ماہ کے عرصے میں صرف سولہ روپے! مگر ہے یہ مبالغہ آرائی ہو مگر واقع ہے کہ جب وہ روزنامہ احسان میں کام کرتے تھے تو انہیں دفتر سے دی چکر کراپنے اظہار جات پر دے کرنے پڑتے تھے۔ ان دنوں راجہ سہدی علی خاں بھی وہیں ملازم تھے۔ باری صاحب آدمی بڑے غلص تھے جب انہوں نے دیکھا کہ روٹی بیچ کر کچھ کچھ وصول ہو جاتا ہے تو انہوں نے راجہ کو بھی اس ویسے سے آگاہ کر دیا باری صاحب طبعا امداد پسند اور محتاط تھے لیکن رویہ دھڑے کا آدمی تھا اس نے ایک دو بار تو صرف ہنڈل چرائے اس کے بعد اس نے باری صاحب سے

کہا: یہ خوردہ فردغی غلط ہے مولانا — میں کل دو بوریوں لادوں گا انہیں بھر کر لے جائیں گے!

باری صاحب ٹھگے، لیکن راجہ صاحب نے ان کو اس جڑی ٹوکیٹی پر آمادہ کر لیا۔ باری صاحب پہرہ دیتے رہے اور راجہ بوریوں میں دوسری بھرتیوار ڈالے۔ مزدور بلوائے گئے اور انہیں اٹھوا کر اپنے ساتھ لے گئے۔ راجہ کا بیان ہے کہ اسی وقت انہوں نے سینا دیکھا تھا۔

راجہ صاحب دی علی خاں سے روایت ہے کہ ان دونوں کو ایک دفتر بازروں میں بھیک مانگتی بھی پڑی تھی۔ اسیکم باری صاحب نے بنائی تھی لوگوں کے آگے دست سوال کیوں کروا دیا جائے گا۔ مسکین اور قابل جسم شخص و صورت کیسے بنائی جائے گی اپنا دکھڑا کس انداز سے اور کن الفاظ میں سنایا جائے گا یہ سب باری صاحب نے خود سوچا اور مرتب کیا تھا۔ لیکن جب جھولی پھیلائے کا موقع آیا تو باری صاحب جھینپ گئے اور ہشک و دودھائی آنے لگے۔ اس کے برعکس راجہ نے پونے تین روپے اکٹھے کئے۔

یہاں راجہ کے بیان کے جوڑے ایک لطیفے کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

خالیاً انارکلی میں راجہ بھیک مانگ رہا تھا سانسے ایک گوبر سُریر دودھ کا بہت بڑا دلٹوٹا اٹھائے چلا آ رہا تھا راجہ نے جو باری صاحب سے انسانی نفسیات پر کچھ ٹیکرٹن چکا تھا اندازہ لگایا کہ اسامی مالدار ہے اگر میں اس سے اپنی حالت زار

بیان کروں گا تو اس کا دل ضرور پیسج جائے گا۔ راجہ کا خیال تھا کہ اس سے کم از کم ایک دو پیسہ تو ضرور مل جائے گا۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا۔ باری صاحب نے جو کچھ بتایا تھا بڑے غلوں کے ساتھ گوجر کو بتایا اس کے راجہ سے کہا: "ڈرا نا تم دینا میسے دلچسپ کو" راجہ نے کافی زور صرف کر کے اس کے سر کا بوجھ اتارنے میں معدی جب اشرا انگریز تو گوجر نے اپنے تہند کا ڈب کھولا۔ اس میں کئی نوٹ اور بیت ساکریا نہ تھا لیکن اس نے ان میں سے صرف ایک پیر نکالا اور راجہ کی ہتھیلی پر دکھ دیا اور ستم باجٹ ستم اس سے یہ کہا: "نوٹ جو ان اب دلچسپ دکھو اور میسے سر پٹ"

اور یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ باری صاحب اور حسن عباس ہفتیس کے زمانے میں پیٹ میں کچھ واسطے کے لئے اس پھلوں کی دوکان سے رات کے وقت اکثر کیلے اور سیب چرایا کرتے تھے جس کے اوپر انہوں نے ایک گھوکرائے پر لے رکھا تھا۔ اس میں بھلی کا نگلشن نہیں تھا مگر باری صاحب نے حسن عباس کو پانا۔ بھلی گمراہ بنانے کی ترکیب سمجھا دی تھی۔ چنانچہ وہ ایک زمانے تک سیوہستی کے سارے اپنا کاروبار کر یہ کمزور دشمن کرتے رہے۔

مجھے ایک اور لطیفہ یاد آگیا جو پرانی انارکلی کے اسی کمرے سے متعلق ہے جہاں باری صاحب اور حسن عباس اکٹھے رہتے تھے یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں غالباً سات برس کے بعد میٹھی سے آیا تھا اس دوران میں معمولی خط و کتابت رہی تھی حسن عباس مجھے امرتسر کے اسٹیشن پر مل گیا تھا ان دنوں ٹرلر پر کوئی پابندی

نہیں تھی۔ اسپنسر والے ربرٹ مارٹن گاڈویل پر اسے عام چتے پھرتے تھے عباس سے جڑی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی، چنانچہ اس خوشی میں ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ صبح ہی سے شروع کر دینی چاہیے تاکہ جذبات گھٹے گھٹے ذرا میں جو بات کی جائے کھل کے کی جائے یہ فیصلہ ہوتے ہی ہم نے اپنے دل کی چامیاں جرنی واکر کے حوالے کر دیں۔

خیال تھا کہ باری صاحب ٹیشن پر موجود ہوں گے، مگر قبول حسن عباس، وہ حسب معمول ذلیل الہ ہر منگلے، تاہم لے کر ہم نے انہیں ادھر ادھر تلاش کیا اور آخر ڈھونڈ نکلا وہ اس لئے چھپ گئے تھے کہ انہوں نے میری آمد کے ساتھ ہی شراب کا سیلاب دیکھ لیا تھا اور بند باندھنے میں مصروف تھے میں نے اور عباس نے انہیں بہت لمن طعن کیا اور پانی صحبتوں کا حوالہ دے کر ان کے عارضی زہد کی خوب شنی پلید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک دم غم کے غم اندھینے پر آمادہ ہو گئے۔

معلوم ہے ان دنوں ابرسید قریشی ج۔ اسے کا قلعہ سر کر کے لئے اپنے آخری حملے کی تیاری کر رہا تھا یا اس قلعے کو فتح کرنے کے بعد ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ بہر حال وہ جیسے کسی ذکی طرح فرمایا — اس میں اور پرانے سید قریشی کے باپ میں کوئی فرق نہیں تھا اسی طرح وہ اب بھی عمرِ نیاں کی رہا عیاں خریدتا تھا اور نہ کہ کندھے چاندنی رات اور گل غدار مشرق کے خواب دیکھتا تھا۔ باری صاحب نے تجویز پیش کی کہ اس مجرم کی سزا اس کو یہ دی جائے کہ وہ ایک حد جرنی واکر خریدے جو ہم نے یہ سزا قبول کی اور فوراً جگت لی۔

پرائی انارکلی کے اس تاج پر مہکے ہوئے میں ہم سب جمع تھے میں 'باری صاحب
الوسید قریشی، حسن عباس اور عبداللہ ملک رحمان کی زبیدہ خوبصورت ہے، تھوڑے
عرصے کے لئے راجندر سنگھ بیدی بھی آیا۔

باری صاحب حسب توفیق صفائی پسند تھے اپنے میز کی جھاڑ پونچھ اور اس کے
بناؤ سنگھار میں کافی وقت صرف کرتے تھے لیکن اس معاملے میں وہ بالکل بچوں کے مانند
تھے۔ ناخن کتنے کی چھوٹی سی تیغی ہے۔ وہ بھی اپنے تلمیذان کے ساتھ سہاوت
کے طہ پر دٹاں دکھ دیتی ہے، ساتھ ہی شیو کرنے کا سٹرا پڑا ہے کہیں سے گول بٹ
مل گیا ہے تو اسے آپ نے میپر ویٹ بنالیا ہے کتابوں کے اوپر کاغذ کے گرد پورش
چومے ہوئے ہیں ان کے اوپر سوئی دھاگہ دکھا ہے ایک خاتی ہے اس میں مختلف
رسالوں سے کافی ہونٹ تصویریں جمع ہیں — باری صاحب کو تھنپی استعمال کرنے
کا بہت شوق تھا، معلوم نہیں کیوں، ہو سکتا ہے اس لئے کہ وہ اخبار کی کاپی خود ہی
جوڑا کرتے تھے یہ کام نیوز ایڈیٹروں کے فرائض میں اب بھی داخل ہے لیکن یہ سمجھ
میں نہیں آتا کہ اخبار کی کاپی جوڑنے سے پہلے ان کو اس اوتار سے کیوں اتنی دغبت تھی
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امرتسر میں روزنامہ "ساوات" کے دفتر میں وہ انگلیوں میں
یقینی چٹا کر جب کاپی جوڑنے بیٹھتے تھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی بہت دل پسند
کام شروع کرنے والے ہیں۔

ان کا میز عام طہ پر دیوار کے ساتھ لگا ہوتا ہے اس طرح کہ جب باری صاحب

لکھنے بیٹھیں تو دیوان کے سامنے ہو۔ کھتے وقت کوئی روک ان کی آنکھوں کے سامنے ہونی ضروری تھی جیسے یاد ہے ایک بار میں نے گھر میں اپنے میز کا رخ بدل دیا۔ باری صاحب کو کچھ لکھنا تھا کسی پر بیٹھے تو بے چینی محسوس کرنے لگے میں نے وجہ دریافت کی تو کہا: جب تک میری آنکھوں کے سامنے کوئی روک نہ ہو۔ میں نہیں لکھ سکتا۔ اور یہ کہہ کر ورلڈ ٹالسٹاس اٹھاٹھ اور اپنے سامنے رکھ لی۔

بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے، لیکن میں مجبور ہوں، پرانی انادکلی کے کمرے سے نکل کر خدا معلوم کہاں جا رہا ہوں۔ لیکن آپ مجھے معاف کر دیجئے جو بات ذہن میں اُسُبرتی ہے، میں اُسی وقت قلم بند کر دیتا ہوں کہ بھول نہ جاؤں ابھی ابھی جب میں نے تصور میں انہیں لکھتے دیکھا تو وہ اپنے دانت دگر رہے تھے یہ باری صاحب کی حدت تھی۔ لکھنے کے دوران میں وہ اپنے دانت ضرور کٹکتے تھے جیسے غصے میں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گول گول حروف لکھتے تھے — اتنے گول کہ بعض اوقات میرے لئے ان کی عبارت کے اکثر لفظ ایک دوسرے کے توڑا جاتے تھے۔

پرانی انادکلی کے اس تاریخی کمرے میں ان کے میز کے ساتھ بال دیوار پر وہ تاریخی گروپ بھی آویزاں تھا جو ہم نے اُنتر قس میں اتر دیا تھا اس میں عباسی ہے۔ میں ہوں، باری صاحب ہیں، درالہو سعید قریشی بھی موجود ہے۔ باری صاحب

نے اس فرٹو کے نیچے شاید "امرت سر اسکول آف تھٹ" لکھا ہوا تھا یہ باری مرحوم کو بہت عزیز تھا۔ "طاپ" یا پتھاپ کے دفتر میں کام کرتے ہوئے اپنا کوٹ کھونٹی سے ٹکا کر جب آپ سگرٹ لینے کے لئے باہر نکلے تھے اور سیدھے براہ راست اپنے ٹیے تو اپنے ساتھ یہ گروپ بیٹھ گئے تھے۔

میں جب اس کمرے میں جو عباس اور باری صاحب کا گھر تھا، داخل ہوا تو سب سے پہلے باری صاحب نے مجھے یہ گروپ دکھایا اور اپنے مخصوص انداز میں جس میں بچوں کی تالیاں پٹینے والی خوش گھسی ہوئی تھیں، کہا: "خواجہ صاحب یہ دیکھئے۔" اس سے آگے وہ اور کچھ نہ کہے، لیکن ان کے چہرے کے تمام خود حال اپنی سیاہ تباہکار پکے تھے اور سکرا رہے تھے۔

مرحوم کو مجھ سے بہت محبت تھی ان کو مجھ پر ناز بھی تھا مگر اس کا اظہار انہوں نے میرے سامنے کبھی نہیں کیا۔ اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ انہوں نے کبھی کسی سے اس انداز سے کہا ہر کہ منٹو میرا بھائی ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مجھے تحریروں تصنیف کے راستے پر ڈالنے والے وہی تھے اگر امرتسر میں ان سے میری ملاقات نہ ہوتی تو ہو سکتا ہے کہ میں ایک غیر معروف آدمی کی حیثیت میں سرکھپ گیا ہوتا۔ یا چھدی ڈیکٹی کے جوم میں اپنی قید کاٹ رہا ہوتا۔

میں اور عباس بقول باری صاحب کافی "گٹ" تھے ایک شراب کا دوسرا اتنی طویل مدت کے بعد ملنے کا نشہ ہم سب مجھم رہے تھے۔

ابو سعید قریشی کی بوتل کھول گئی اور وہ شروع ہو گئے۔ باری صاحب ہاں کر بہت دلیپ ہو جاتے تھے وہ جو کچڑوں کے جزدان میں پیٹے اور کرسی کے سبائے وصل پر بیٹھے ہونے کا تصویر پیش کیا کرتے تھے۔ شراب کے چند گھونٹوں کے بعد ایک مختلف شکل اختیار کر لیا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں وہ مزاحیہ اور فرحیہ عنصر جو اکثر شرعی پیغام پہنچاتا تھا ہے ریش و بروٹ ہو کر سٹنے آجاتا تھا اس وقت ہی چاہتا تھا کہ وہ بڑے زمین الہم سنتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ ایسے وقتوں میں کسی اور کو بولنے کا موقع بھی دشوار و نادر ہی دیتے تھے۔

راجندر سنگھ بیدی، روسی ناول نویس شہرلو خوف کے "انڈیکوٹ نفوذی ڈون" کے متعلق بات چیت کر رہا تھا۔ یہ ناول ہم میں سے کسی نے بھی نہیں پڑھا تھا لیکن بیدی کچھ اس انداز سے گفتگو کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ اس میں شریک ہونا اور بیٹا ہر کرنا پڑا کہ ناول میلر پڑھا ہوا ہے جب میں نے اس کا اظہار کیا تو بیدی کو کھلا سا گیا باری صاحب تاڑ گئے کہ معاملہ کیا ہے اور شہرلو خوف کی ناول نویسی پر ایک ٹیکر شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیدی کو تھوڑی دیر کے بعد بڑے مینڈے پن سے اس بات کا اقرار کرنا پڑا کہ اس نے شہرلو خوف کا زیر تبصرہ ناول نہیں پڑھا میں نے بھی حقیقت کا اظہار کر دیا۔ باری صاحب خوب ہنسنے اور انہوں نے انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں حاضرین کو بتایا کہ شہرلو خوف کا نام انہوں نے پہلی مرتبہ بیدی صاحب کے منہ سے سنا ہے اور اس کی ناول نویسی پر جبریکہ انہوں نے

پڑایا ہے، ان کی دماغی اختراع ہے ————— راجندر سنگھ بیدی کی سمیت مورچانا تھا اس لئے وہ اجازت لے کر چلا گیا۔

غالباً دسمبر کے دن تھے۔ سنت سرودی تھی۔ میں چونکہ ایک مدت تک باہر رہا تھا اس لئے یہ سرودی خاص طور پر مجھے بہت زیادہ محسوس ہوا ہی تھی۔ لوہے کی انگلی مثل موجود تھی۔ باری صاحب نے فرما "آگ" کا انتظام کر دیا دروازہ کھول کر باہر گئے اور تھوڑی سی کڑیاں لے آئے۔ ان کو انگلی مثل میں قریب سے رکھ کر انہوں نے جونی داکر کی ہڈی کھول اور کچھ چھینے کڑیوں پر مارے پھر "نذرشت" "درشت" کہتے ہوئے ان کو باہر دکھا دی جب آگ سلگ اٹھی تو سجدے میں چلے گئے۔

سجدے کا ذکر آیا تو مجھے یاد آگیا کہ وہ بڑے سجدہ گزار تھے ایک زمانہ تھا کہ وہ امرتسر میں پانچ کے بجائے کبھی آٹھ بجیں دس وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔ وہ بیٹھک جہاں ہم بیٹھا کرتے تھے اس کا نام انہوں نے "دارالاحمر" رکھا ہوا تھا۔ یہاں جب بھی ان کو نماز ادا کرنے کی حاجت محسوس ہوتی، بی بی جان دھیری والدہ مرحومہ کو آواز دیتے اور بانی کا لٹنا اور جانماز منگوا لیتے یہ تو ان کے من کی صدا کا قصہ ہے لیکن جب کہیں ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو میں یا عباس اس کو پکڑ لیتے تو وہ خدائے اپنے کان ان فیٹھنا شروع کر دیتے تھے۔ اور سہو کئے ایک دو سجدے بڑے خلوص کے ساتھ ادا کرتے تھے۔

مجھے ایک اپنا سجدہ یاد آگیا جو اب تک میرے ماتھے میں تھک رہا ہے۔

یہ بھی امر تسری کی بات ہے باری صاحب کو میری شراب نوشی پسند نہیں تھی میں سمجھتا تھا کہ وہ بگتے میں ایک شام کو وہ میرے ساتھ تھے سیر کرتے کرتے دیو سے اسٹیشن کے ویفر لٹینٹ روم میں پہنچ گئے میں نے میرے کو سمجھا دیا کہ وہ میرے لئے دسک لائے اور باری صاحب کے لئے جنبر میں ایک پیگ جن کا شامل ہو۔

باری صاحب کو کوئی نہ کوئی اور خاص طور پر پیٹ کا عارضہ ضرور لاحق رہتا تھا میں نے ان سے کچھ پینے کے لئے پرچھا تو کہنے لگے یہ نہیں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ میرا مددہ خراب ہے۔

باری صاحب صندی نہیں تھے۔ تھوڑی سی لیکچر بازی کے بعد انہیں کئی بات پر بھی آمادہ کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے ادراک کے فائدے بتائے اور کہا کہ جنبر کا پانی ان کے معدے کی تمام خرابیاں دور کر دے گا۔ آپ راضی ہو گئے میرے نے ان کے سامنے بوتل گلاس میں انڈیل میں نے دسک پینا شروع کر دی اور باری صاحب نے جنبر جس میں جن اشیاں تھیں یہ مملول جب ان کے حلق سے اترا تو ان کو فرمت حاصل ہوئی، میں نے اپنی دسک ختم کر کے جب دوسرا پیگ طلب کیا تو انہوں نے بھی خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک جنبر اور پیشیں گے۔ میرا اسی قسم کا ایک اور مشروب تیار کر کے لے آیا۔

باری صاحب کو بہت لطف آیا مجھ سے کہا کہ ادراک کے فائدے میں نے

طلب کی کسی کتاب میں پڑے تھے۔ واقعی بڑے مصر کے کی چیز ہے وہ بوجھ سا وہ الجھن سی جو میں صبح سے محسوس کر رہا تھا، بالکل غائب ہے۔

میں ہنس پڑا۔ اس کے بعد مجھے ان کو بتانا پڑا کہ مصر کے کی چیز کون سی تھی وہ بہت تخفایا بڑے جگہ یوں کہنے کہ ان کو بہت دکھ ہوا۔ میری غفلت حکمت انہوں نے صاف تو کر دی مگر میں محسوس کر رہا تھا کہ انہیں سخت دومان کو فتنہ سرٹ ہے چنانچہ میں نے ان سے صدق دل سے وعدہ کیا کہ میں آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ برا بھی لایا تو باری صاحب نے پنس سے اس پر اقبال کا یہ مصرعہ لکھ دیا۔

یاد ب دہن سینہ دل بانجریہ

بم پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا۔ اتنا اثر کہ جب میں مات کو گھر لوٹا تو لگی کے فرش پر میں نے سجدہ کیا اور خدا سے دعا مانگی وہ مجھے اپنے امادے میں ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس گناہ کو جو مجھ سے سرزد ہوا ہے معافی کر دے اس سجدے سے طبیعت کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا مگر ایک اور بوجھ اس پر لد گیا کہ اب میں پی نہیں سکتا تھا کئی دن گلد گئے ہر وقت اداسی چھاٹ رہتی تھی۔ لیکن مل کو پر جانے کے لئے یہ بات مرحد تھی کہ میں اپنے وعدے پر قائم ہوں اور ایک لعنت سے بچنے کی کامیاب کوشش کر رہا ہوں۔

ایک دن شام کو باری صاحب آئے میں کھڑکی میں بیٹھا تھا انہوں نے باہر لگی میں کھڑے کھڑے میل مزاج پوچھا میں نے مسکرا کر کہا کیا پوچھتے ہیں۔

بس ٹھیک ہے اُ

باری صاحب نے ایک لمحے کے لئے سوچا اور کہا: میں ابھی آتا ہوں! جب وہ آئے تو ان کے پیچھے میں خراب کا اڑھا اڑھا ہوا تھا۔ مجھے سخت حیرت ہوئی میں نے ان سے کچھ کہا جانا۔ مگر انہوں نے سٹخ سے آنکا رک دیا۔ اور جوتل کھوٹا شروع کر دی۔ اسٹخ میں عباس آگیا۔ باری صاحب کے کہنے پر سب ہڈ دلوڑے بند کر دیے گئے۔ اندر سے روٹی منگوائی گئی جو کسی نے بھی نہ کھائی۔ سامن دھیرہ الگ رکھ لیے گئے۔ اور گلاس چھوڑ کر باقی برتن واپس بیچ دیے گئے۔ عباس کنویں سے لٹٹے میں پانی لایا اور ہم سب نے پی۔ وہ مسجدہ جو میں نے گھی کے ٹھنڈے فرش پر اس رات خدا کے حضور ادا کیا تھا میری پیشانی میں تر پتا رہا۔

ہم پی رہے تھے تو حسن عباس نے چھوڑنے کی خاطر باری صاحب سے کہا: — ”آپ کی بیاں سب عزت کرتے ہیں۔ لی بی جان آپ کو نمازی اور پرہیزگار کی حیثیت سے جانتی ہیں۔ ان کے دل میں آپ کا اتنا احترام ہے — اگر وہ یہاں آجائیں تو کیا ہو؟“

باری صاحب نے کہا: میں کھڑکی کھول کر باہر کود جائوں گا۔ اور پھر کبھی ان کو اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔

باری صاحب ہمیشہ اپنی زندگی کی کوئی نہ کوئی کھڑکی کھول کر باہر کود جاتے رہے

عباس نے باری صاحب کو دھڑکایا کہ اگر ملک مکان کو علم ہو گیا کہ وہ جنگل جلا
 ہلا کر لگ تاپتے دہتے ہیں تو وہ کیا باب ہو جائے گا۔ اور بیک جی ردد گوش
 اُن کو نکال باہر کرے گا۔ باری صاحب جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں بہت ٹڈی پوک
 تھے۔ عباس نے جب ان کو اس غیر راجب حرکت سے آگاہ کیا تو وہ کھسپا سے
 سے ہمدئے۔ بات کو نہیں میں اڑانے کی بجوڑی کرکشی کی۔ مگر ناکام رہے آخر
 میں عباس سے کہا: ہم اُس کو خبر ہونے سے پہلے ہی نکل جائیں گے۔

لیکن مصیبت یہ ہے کہ نکل جانے سے پہلے اُن کے علاوہ ہر ایک کو خبر ہو جاتی
 تھی۔ وہ جب ٹاپ یا پرتاپ کے دفتر سے کھونٹی سے اپنا کوٹ ڈساکر گرٹ
 لینے کے لئے باہر نکلے اور برہان پہنچ گئے۔ تو ان کا یہی خیال تھا کہ کسی کو خبر تک
 نہ ہوگی اگر جاننے والے جانتے تھے کہ وہ کمر کاؤنچ کیئے ہیں۔

باری صاحب نے مختلف چھوٹے بڑے شہروں کی رصدگاہوں میں اپنی قسمت
 کے ستاروں کا مطالعہ کیا۔ لیکن گھوم پھر کر آخر انہیں لاہور ہی کی رصدگاہ میں آنا
 پڑا جو کسی زمانے میں عرب ہوش میں تھی۔ اور بعد میں انگینہ سیکری میں اپنے
 جلد سازو سامان کے ساتھ آئی تھی۔ یہاں اور وہاں بڑے بڑے مہندس
 اور ستارہ شناس جمع ہوتے تھے۔ ان میں سے کچھ ان کی زندگی میں اپنے ستاروں
 سے آگے دوسرے جہانوں میں چلے گئے اور کچھ اپنے بے نور ستاروں کے لئے
 بند نشیمنوں کی چمک دمک جھیک کے لوہ پرمانگتے رہے۔

باری صاحب کو جب کہیں میں نے ان مخلوق میں دیکھا مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ گرم گرم کالی کوئی کاپیاد ہیں جس میں سے بھاپ کا دھواں اٹھ رہا ہے جو صرف چند لمحوں کے لئے فضا میں بہرانا بل کھاتا ہے اور پھر اس کی نمی کی آغوش میں سو جاتا ہے۔ ان مخلوق میں ان کشتی، گرم دوسرے محبتوں میں ان کے ذہنی سر کی ہڈیاں سے طرح طرح کے ذہنی ماکولات کی خوشبودار بھاپ اٹھتی مگر ان بو محسوس اور بیکریوں کی کثیف فضا میں تھوڑی دیر اپنی نزاکت اور ندرت پر اترتا اترتا کر دیں سو جاتی۔

باری صاحب! باتوں کے بارشاد تھے۔ کوچہ و کیلاں کے دارالاحمر میں جب وہ ولی اللہ (گاجی) کو وہ ولی اللہ کہا کرتے تھے۔ اکا سہارا لے کر بیٹھتے تو دلپ باتوں کے دیا پہنے شروع ہو جاتے تھے۔ اُن دنوں سرور صاحب (آفاق کے مُیر) بھی کبھی کبھی تشریف لاتے تھے۔ آپ میری حرکات و سکنات میں گہری دلچسپی کا اظہار فرمایا کرتے تھے۔ باری صاحب کی طرح وہ بھی میری حوصلہ افزائی فرمایا کرتے اور باتوں باتوں میں مجھے یقین دلاتے تھے کہ میں بہت جلد تحریر و تصنیف کے قابل ہو جاؤں گا۔

اس ترسکا ذکر آیا تو مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آ گیا۔ میں، باری صاحب، حسن عباس اور ابوسعید قریشی اپنی محفل میں کسی اور کی شمولیت پسند نہیں کرتے تھے کامرٹ

فیروز الدین منصور سے ہم سب کی صاحب سلامت تھی۔ کبھی کبھی وہ بھی دارالافتخار لایا لے آتے تھے، مگر ان کی تشریف آوری ہم سب کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ باری صاحب انرا وہ خانہ کا کرتے تھے کہ کامریٹ صاحب پڑھتے پڑھتے سے ہم بندے ہیں عباس انکو فرار الدین منصور کہتے تھے۔ کچھ دیر ہم ان کا آنا بجا نہ برداشت کرتے رہے۔ آخر باری صاحب کو ایک ترکیب سوچی۔ کامریٹ ایف ڈی منصور دیکرے میں داخل ہوئے تو باری صاحب نے جسے بھونٹے طریقے سے آنکھ مار کر عباس سے کہا "خواجہ صاحب — چلے پھر کہیں دیر نہ ہو جائے، اور آنکھ کو کھلایاں بند کرنا شروع کر دیں۔" منصور صاحب جو بیٹھے کا ارادہ ہی کر رہے تھے، ہمارے ساتھ چل پڑے بازار میں نکل کر باری صاحب نے ان سے معذرت طلب کی اور ہم ایک چکر کاٹ کر پھر دارالافتخار واپس آ گئے۔ باری صاحب بہت خوش تھے۔ اتنے خوش کہ وہ دینک بنس بنس کر دوہرے ہوتے رہے۔

باری صاحب بہت معمولی معمولی باتوں پر غرض ہو جایا کرتے تھے ان کی خوشی جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں، بالکل بچوں کی سی خوشی ہوتی تھی۔ اس میں تاہم پچھلے کا شور ہوتا تھا۔ ان کی توند بڑھی ہوتی تھی۔ جس کے متعلق وہ ہمیشہ فکر مند رہتے تھے جب وہ ہنستے تھے تو یہ بھی ہنسا کرتی تھی۔

بہت غصے آدمی تھے، اتنے غصے کہ انہوں نے اپنی آنے والی موت سے بھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ کیا۔ اصل میں وہ لڑائی بھڑائی سے ہمیشہ گھبراتے تھے۔

اُن کی طبیعت صلیح کُن تھی۔ دل کا عارضہ ان کو بہت دیر سے تھا۔ مگر اس کا علاج انہوں نے جب بھی کیا۔ مسالحت آمیز طریقے سے کیا۔ اس کی مداخلت میں ان سے کبھی جارحانہ قدم نہ اٹھا۔

مجھے یاد ہے۔ مرنے سے دو روز پہلے میری ان سے ٹریسٹر سولڈیئر ہوئی۔ برسرِ رازے چوک سے دائیں ہاتھ کو ان کا ہانگہ مار رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو اُسے دُکھ آیا۔ میں ان سے ناراض تھا۔ سخت ناراض، اس لئے کہ وہ دُور دُور رہتے تھے۔ انگریزوں کے انی کسٹرز کے دفتر میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد وہ کچھ ایسے کچھ گئے کہ اپنے بے تکلف دوستوں سے اگر ان کی ملاقات محض اتفاقیہ طور پر ہو جاتی، تو عجیب و غریب سا حجاب محسوس کرتے۔

میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ تانگے سے اُترے۔ مجھ سے مصافحہ کیا۔ اور میری خیریت دریافت کی۔ یہ رسوم مجھے بہت بُری معلوم ہوئیں۔ میں نے اُن سے کہا — باری صاحب آپ بہت ذلیل ہو گئے ہیں۔ اتنے ذلیل کہ آپ نے مجھ سے ملنا جتنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے انگریز کی نوکری کیا کی ہے، اپنا سلا کیئر کیئر تباہ کر لیا ہے۔

میری سن سن کے جواب میں گٹھی گٹھی، بیدار بیدار سی مسکرائیں۔ ان کے اردے ہونٹوں پر بھرتی رہیں۔ ان کے چہرے کا رنگ کسی قدر زرد تھا اور آنکھیں خوب تھیں۔ نسا کی سے پرچھا: خیر چھوڑیے اس فتنے کو، بتائیے آپ کا مزاج کیسا ہے

میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے ٹہری سنجیدگی سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ ایک مرحے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہیں سینیٹریوں علاج کر چکے ہیں مگر کوئی افادہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھے بتایا کہ میو روڈ پر کوئی ہوسپتال ہے، اب وہ اس سے رجوع کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے انکا وفاق کیا۔ یہ رسلگاہ باقی رہ گئی تھی۔ جہاں آپ اپنے تئیں کا ملاحظہ فرماتے جا رہے ہیں۔ چھوڑیے باری صاحب، آپ کو کوئی عارضہ وارفتہ نہیں۔ آپ کو صرف وہم کی بجائی ہے۔ جس کا علاج اساتذہ حکیم کے پاس بھی نہیں تھا۔۔۔ آپ زیادہ کھاتے ہیں، اس لئے آپ کا معدہ خراب رہتا ہے۔ تغیر کے باعث جو بیماریاں اٹھتی ہیں آپ کے دل پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے جسے آپ نے بشگڑ بنا رکھا ہے!

میری بات ان کے دل کو لگی۔ (اُن کے دل کو ہر بات لگ جاتی تھی) کہنے لگے! میرا خیال ہے آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ تغیر کی شکایت تو مجھے ہے..... اور صبر و تحمل کی تشنیں بھی ہی کہتی ہے!

بہت دیر تک میری ان کی باتیں سُنیں مجھے انہوں نے بتایا کہ وہ تاریخ عالم (کئی جلدوں میں ایک جھوٹا کتاب جو مرحوم مغل ذکر کئے) دوبارہ پھیلانے لگا رہا ہے میں اور ترکی زبان میں پنجابی الفاظ تلاش کر رہے ہیں۔

مرحوم کو پنجابی زبان سے بہت محبت تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پنجابی کو پنجاب

کی قومی زبان جس نے برائے ہوئے تھے۔ اُن دنوں وہ غالباً سکھوں کے اخبارِ اجیت کے اڈیٹر تھے جہاں بیٹھتے تھے اپنی نت نئی اسکیوں کا ذکر جھڑیتے تھے۔ جن کے ذریعے سے وہ اردو کے بجائے پنجابی رائج کرنا چاہتے تھے۔ ہر لٹنے والے کو تلقین کرتے کہ اردو کی بجائے اپنی مادری زبان پنجابی میں لکھا کسے۔ ان کا کہنا تھا کہ صرف وہی زبان جاندار ہوتی ہے۔ جس میں دی ہوئی گالی وزن دار ہو اور انفرادیت در رکھتی ہو۔ ان کا ایمان تھا کہ دنیا کی کوئی زبان گالیوں کے معاملے میں پنجابی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے اور بڑے لطف بات یہ ہے کہ خود باری صاحب نے اپنی زندگی میں ایک سطر ہی پنجابی زبان میں دیکھی۔

تقسیم سے پہلے انارکلی میں ایک کیلاش ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس میں بار بھی تھی منقشات کے حلقے میں جب لاہور آتا تو چہ بہ چہ ہی تذیبر کے ساتھ اس ہوٹل میں دو تین مجلس ضرور جیتی تھیں۔ جن میں باری صاحب کو شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ ہم بالائی منزل پر پہلے جاتے اور دوسرے کے دور شروع ہو جاتے۔ ایک سکہ بھرا تھا۔ باری صاحب جب دو پیگ پی لیتے تو اس سے ٹھیٹھ پنجابی میں گشتگر شروع کر دیتے۔ اس وقت ان کے دل و دماغ میں صرف پنجابی زبان کی ترمیم کا خیال ہوتا لیکن چار پیگ کے بعد وہ کانٹا بدل کر اردو کی طرف آ جاتے اور اس کی عالمی پیر کے تسلی تقریر شروع کر دیتے اور کہتے کہ پنجابی تختہ دوں اور فٹنگوں کی زبان ہے، بہت غیر مذہب ہے۔ جو سماعت برگراں گزرتی ہے۔ پانچویں اور چھٹے

پگ کے دوران میں اُردو سے اُن کی راہ باز محبت کھڑتی رہتی جب ہانپوں پگ اپنا کام کر جاتا تو وہ فارسی کی مٹھاس کے گردیدہ نظر آتے۔ ٹھیٹا اڑاتی جیسے میں خادسی برسنے کی کوشش کرنے۔ مگر چٹا اور ساتراں پگ انہیں پشت کے تھروں میں لڑا مکنا شروع کر دیتا۔ آنھویں اور نویں پگ میں پنجابی، اُردو، فارسی پشتراں اور عربی اُن کے داغ میں، لاکھیل، مین کر چھپنے لگتی ۔

مخوم برسنے اور اپنی آواز آپ سننے کے بہت شائستہ تھے۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ کسی جیسے میں تقریر کرتے، لیکن بار دوستوں کی محفل میں اپنا حقوق پورا کر سہا کرتے تھے۔ دہلی مسلم ہوٹل میں سے ایک دفعہ آپ ایک چھپ اڑا لائے، آدمی رات کا وقت تھا جب ہم اُنا رکن کے وسط میں پہنچے تو آپ تے یہ چھپ نکال کر پیچھے کے ہانڈ اپنے کان سے پر دمک یا اور چپ راست، چپ راست، کرتے ایک دکان کے قافلے پر چڑھ گئے۔ اور خاک روں کی تحریک پر ایک عدد تقریر اُنک کے رکھ دی۔ بے شمار آدمی جمع ہو گئے۔ لیکن باری صاحب جوش و خروش کے ساتھ بولتے رہے۔ اس کے بعد ہم سب نے جو کہ میں کمرے ہو کر علامہ مشرق زندہ باد کے صرے لگائے پھر مرتبے کے بار خریدے اور اپنے اپنے گگے میں مثال بیٹے۔ باری صاحب نے ایک بار اپنی کلائی کے گرد پیٹ یا اور تھپ سے کہا۔ "خواہر صاحب، چلو میرا منڈی چلیں"۔ سوتیے کے ان پھوٹوں کی خوشبو کا رُخ اُسی طرف ہے ۔

ہم سب میرا منڈی پہنچے۔ باری صاحب کے سر دغوب گھٹے ہوئے تھے بہت

دیر تک ہم اس منڈی کی تنگ دھار گلیوں میں گھومتے رہے اس دوران میں باری صاحب نے کئی چٹان ٹکیوں سے پشتوں میں بات چیت کی۔ ایک ایسی ٹکیائی سے صرف گفتگو تھے کہ ان کی جان بچان کا ایک آدمی اذکور سے گزرا۔ باری صاحب نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اُس آدمی نے پوچھا۔ "سوال کیا ہےں کیا ہو رہا ہے۔"

باری صاحب نے چٹان کسی کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "اس ٹکی سے سیاست حاضرہ پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔"

صبح عباس نے باری صاحب کو رات کے تمام واقعات سنائے خوب مریج لگا کہ اس انداز میں کہ وہ خدمت محسوس کریں۔ باری صاحب نے ٹھجڑے سے تصدیق چاہی تو میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا: "باری صاحب، یہ واقع ہے کہ آپ نے کل رات بڑی فریل حرکتیں کیں۔ یہ آپ کی شایان شان نہیں تھیں؟"

باری صاحب بہت نادم ہوئے۔ اس قدر نادم کہ آپ نے فوراً وضو کر کے نماز پڑھنا شروع کر دی۔

باری صاحب کو صبح بننے کا شوق تھا، ان کی جلی آرزو تھی کہ وہ ایک بہت بڑے رہ نمائین بنائیں۔ ہر چ کہ میں ان کا بٹ نصب ہو۔ وہ کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیں کہ اُن سے والی تمام نیسیں انہیں یاد رکھیں۔ مگر اس کے لئے جرات اور بے باکی کی ضرورت تھی۔ اچھی قسم کی جرات اور بے باکی جس کا مظاہرہ وہ کبھی کبھی پی کر سیرا منڈی کی گلیوں میں چٹان ٹکیائیوں سے سیاست حاضرہ پر تبادلہ خیالات

کے دوران میں کیا کرتے تھے۔ لیکن جب کہیں ان سے ایسی جہالت اور بے باکی سرزد ہو جاتی تو وہ دمنور کے نماز پڑھنا شروع کر دیتے اور اس کی آلائشوں سے خود کو پاک صاف کر لیتے۔

وہ قہنجی کو انکیوں میں پھنسا کر اپنے خیالات و افکار کے زرد زرد کتابت شدہ کاغذوں کو کاٹ کاٹ کر ساری عمر اپنی زندگی کی کاپی جوڑتے رہے مگر اسے پتہ نہ تھا کہ یہ کبھی متعلق نہ ہو سکتے۔ شاید اس خیال سے کہ وہ ان کے بوجھ تلے پس جائیں گے۔ ان کو ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کے پس جانے کا خدشہ لاحق رہتا تھا حالانکہ وہ تمام کڑی پس کر سفوف بنا دینا چاہتے تھے اور اس سفوف کو نوار کے طور پر استعمال کرنے کے خواہشمند تھے۔

وہ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ لیکن یہ طرز تا شاہ ہے کہ جب انگریز چلا گیا تو وہ اُسی کے ذکر ہو گئے۔ انہوں نے کہیں کی حکومت، جیسی باغیاد کتاب کہیں لیکن اس کہیں کے سابق ٹیکہ داروں کی عازمت میں انہوں نے اپنی زندگی کے چند آخری اور بڑے قیمتی دوس گزاریے۔

باری مرحوم سے میں اپنی آخری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا جب وہ کسی ہریس پتھر سے اپنے دل کے عارضے کا علاج پوچھنے جا رہے تھے۔ اس دل کا بخڑوں سے سمور تھا۔ جو اس قدر شریف تھا کہ اس نے باری صاحب کی بزدلی کا ساتھ دیا اور دھڑکن بند کر دیا۔

میں نے انہی دنوں میں آغا حشر کے متعلق ایک مضمون لکھا تھا (جو اس کتاب میں شامل ہے) اس میں مجھے کے ہوٹل میں باری صاحب سے پہلی ملاقات کرنے کا ذکر بھی تھا۔ باری صاحب نے یہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا تھا جس میں اس کے اُن ایتام کی یاد تازہ کی تھی جب میں ابو سعید، عباس، عاشق، نور و گرانتر اور باری صاحب مل کر بالکل جھپٹیلوں کی طرح بازاروں میں گھومنا کرتے تھے۔

یہ مطلب یہ مقصد۔ جب ہم نے 'فری فنکٹر' جیسی آرٹسٹ ٹیماگ جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس کے قواعد و ضوابط میں نمبر ایک پر یہ چیز تھی کہ فری فنکٹر جو بھی چاہے کرے کسی کو اس کا استحقاق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اُس سے اس کے کسی فعل کے متعلق استفسار کرے۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ ہم چاروں جا رہے ہیں کہ اچانک باری صاحب موڑ مڑے اور ہم سے جدا ہو گئے۔ بڑی گراگرم باتیں ہوتی رہی ہیں کہ اچانک عباس خاموش ہو گیا اور واپس چلا گیا۔

اس خط کے بارے میں باری صاحب سے مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے باری صاحب سے کہا کہ یوں تو انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان کا حافظہ بہت تیز ہے لیکن وہ ان ایتام کی بہت سی باتوں کا ذکر بھول گئے ہیں۔ باری صاحب نے خیف آواز میں صفت چاہی اور کہا کہ انہوں نے یہ خط بڑی رواداری میں لکھا ہے۔ حکایت بہت دلنہ تھی، لیکن انہیں سکون قلب تیر نہیں تھا۔

انہوں نے سکون قلب کا ذکر کیا تو میں پھر ان کے پیچھے پڑ گیا کہ وہ کیوں اپنے

قلب کے پیچھے چڑے ہوئے ہیں جو اچھا بھلا ہے۔ لیکن تیسرے روز صبح چھ بجے چادر کی پہلی پیالی پی کر میں نے سگرٹ سلگایا اور تازہ امروز کھولا تو پہلے صفحے پر یہ سُرخی نظر آئی کہ اشتراکی ادیب باری کا انتقال ہو گیا۔ کچھ عرصے کے لئے میں بالکل گم گم ہو گیا۔ میں نے پھر خبر کی طرف دیکھا۔ تین کامی سُرخی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جڑتے وقت یہ سُرخی باری صاحب نے پیچی سے کاٹ کر خود اپنے ہاتھوں سے بڑے قرینے کے ساتھ عطا کی ہے۔

اشتراکی ادیب باری، میرا دوست، میرا رہ نما، تمام اپنی زندگی کی جلی اور خفی سرخیوں کا تار۔ لیکن افسوس کہ وہ اُن کے نیچے وہ مضمون نہ لکھ سکے جو اس کے فذنی سر میں پروکش پاتے تھے۔ اور بجاپ ہی کر لاہور کی بیکریوں اور ہوٹلوں کی کیفیت فضا میں جذب ہو جاتے تھے۔

باری صاحب قبر میں ہیں۔ معلوم نہیں اس میں بھی کوئی ایسی کھڑکی ہے جس سے وہ کوہِ دگر باہر نکل سکیں۔

عصمت چٹائی

آج سے تقریباً ڈیڑھ برس پہلے جب میں بمبئی میں تھا، حیدرآباد سے ایک صاحب کا ڈاک کارڈ موصول ہوا۔ مصنفوں کچھ اس قسم کا تھا۔

”یہ کیا بات ہے کہ عصمت چٹائی نے آپ سے شادی نہ کی؟ منٹو اور عصمت اگر یہ دوستیاں مل جاتیں تو کتنا اچھا ہوتا مگر انفرس کے عصمت نے شاید سے شادی کر لی اور منٹو۔۔۔۔۔“

اپنی دونوں حیدرآباد میں ترقی پسند مصنفوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ اس میں شریک نہیں تھا۔ لیکن حیدرآباد کے ایک پرچے میں اس کی روداد دیکھی، جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں بہت سی لڑکیوں نے عصمت کو گھیر کر یہ سوال کیا۔ آپ نے منٹو سے شادی کیوں نہ کی؟

مجھے معلوم نہیں کہ یہ بات درست ہے یا غلط لیکن جب عصمت چٹائی واپس آئی تو اس نے میری بیوی سے کہا کہ حیدر آباد میں جب ایک لڑکی نے اس سے سوال کیا: کیا منٹو کنوارا ہے؟ تو اس نے ذرا طنز کے ساتھ جواب دیا: جی نہیں، اس پر وہ مختصر عصمت کے بیان کے مطابق کچھ کھسیانی سی ہو کر خاموش ہو گئیں۔

واقعات کچھ یہی ہوں، لیکن یہ بات غیر معمولی طور پر دلچسپ ہے کہ سارے ہندوستان میں ایک صرف حیدر آباد ہی ایسی جگہ ہے۔ جہاں مرد اور عورتیں میری اور عصمت کی شادی کے متعلق فکر مند رہے ہیں۔

اس وقت تو میں نے غور نہیں کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں اگر میں اور عصمت ذاتی سیماں بیوی بن جاتے تو کیا ہوتا؟ بڑا گڑبھ کچھ اسی قسم کی نگہ ہے۔ اگر کہا جائے کہ اگر تلواروں کی ناک ایک انچ کا اٹھا رصواں حصہ خالی ہوتی تو اس کا اثر وادی نیل کی تاریخ پر کیا پڑتا۔ لیکن یہاں عصمت تلواروں سے اور منٹو اعلیٰ، لیکن اتنا قریب ہے کہ اگر تلوار اور عصمت کی شادی ہو جاتی تو اس حادثے کا اثر ہندو حاضر کے افسانوی ادب کی تاریخ پر اچھی حیثیت رکھتا افسانے افسانے بن جاتے کہانیاں حیرت انگیز کہانیاں ہو جاتیں۔ انشاء کی چھاتیوں میں سارا دودھ خشک ہو کر باقی تو ایک صوف کی شکل اختیار کر لیتا یا جسم ہو کر راکھ بن جاتا اور یہی ممکن ہے کہ نکاح نامے پر ان کے دستخط ان کے قلم کی آغوشِ تحریر ہوتے لیکن سینے پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ نکاح نامہ ہوتا۔ زیادہ تر قریب قریب تو یہی معلوم ہوتا ہے۔

کرناج نامے پر دونوں انسانے نکلتے اور قاضی صاحب کی پیشانی پر دستخط کر دیتے
تاکسند رہے۔ نلاج کے درواں میں کچھ ایسی باتیں بھی ہو سکتی تھیں۔

”صحت قاضی صاحب کی پیشانی ایسا گنتے تختی ہے۔“

”کیا کہا؟“

”قبائے کانوں کو کیا ہو گیا ہے؟“

”میرے کانوں کو تو کچھ نہیں ہوا۔“ تباری اپنی آواز صحت سے باہر

”نہیں نکلتی۔“

”صدر ہو گئی ہے۔“ — لاپ سنو۔ میں یہ کہہ رہا تھا قاضی صاحب کی

پیشانی بالکل تختی سے متی جتنی ہے۔“

”تختی تو بالکل سپاٹ ہوتی ہے۔“

”یہ پیشانی سپاٹ نہیں؟“

”تم سپاٹ کا مطلب بھی سمجھتے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”سپاٹ اتنا تبارا ہے۔“ قاضی جی کا اتنا تو۔۔۔۔۔“

”بڑا خوبصورت ہے۔“

”خوبصورت تو ہے۔“

”تم ضمن چڑا رہی ہو مجھے۔“

”پڑا تم ہے ہو مجھے۔“

”میں کہتا ہوں تم پڑا ہی ہو مجھے۔“

”میں کہتی ہوں تم پڑا رہے ہو مجھے۔“

”تو نہیں اتنا پڑے گا کہ تم پڑا ہی ہو مجھے؟“

”اے واہ — تم تو ابھی سے شرم رہے ہو مجھے۔“

”قاضی صاحب! میں اس صحت سے شادی نہیں کروں گا۔ اگر آپ

کی بیٹی کا اتنا ہی آپ ہی کے ماتھے کی طرح ہے تو میرا نکاح اس سے بڑھوا دیجئے۔“

”قاضی صاحب! میں اس مرد سے شادی نہیں کروں گی۔ اگر آپ کی

چادر پیریاں نہیں ہیں تو مجھ سے شادی کر لیجئے۔ مجھے آپ کا اتنا بہت پسند ہے!

گرشن چندر! چوہلیاں کے دریا چے میں کھتا ہے۔

”سمت کو چپانے میں پڑھنے والے کو حیرت،

اضطراب میں غم کو دینے میں اللہ پھر لیا ایک آنری

اس اضطراب و حیرت کو مسرت میں تبدیل کر دینے

کی صفت میں صحت اور فخر ایک دوسرے کے

بہت قریب ہیں اللہ اس فن میں ارگود کے بہت

کم اضافہ نگار ان کے حریف ہیں!

اگر ہم دونوں کو شادی کا خیال آتا تو دونوں کو حیرت و اضطراب میں غم

کرنے کے بجائے ہم خود اس میں فرق ہو جاتے۔ اور جب ایک دم چونکے تو یہ حیرت اور اضطراب جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ مسرت کے بجائے ایک بہت بڑے دکاہیہ میں تبدیل ہو جاتا۔ — صحت اور خوشنوا کراچ اور شادی کتنی صحت کا خیر خیر ہے۔

صحت گفتی ہے۔

ایک فدا سی محبت کی دنیا میں کتنے شرکت کتنے غمور عباس
 عسکری یونس اور وہ جانے کون کون تاش کی گڈی کی طرح
 پھینٹ کر لکھ دیے گئے ہیں کوئی بتاؤ۔ ان میں سے چوتھا
 کون سا ہے؟ — شرکت کی بھوک کی بھوک کہاں سے لہ پڑے
 انگلیں غمور کے ساتھ کی طرح رینگتے ہوئے اعضاء
 عسکری کہنے دم اتھ یونس کے چمکے ہوئے کاسیہاں
 عباس کی کھوئی ہوئی سگڑاٹیں اور ہزاروں چمکے چمکے
 سینے کا تارہ پشیمانیاں اٹھنے گئے ہاں اسٹارل پنڈلیاں
 مضبوط بازو۔ سب ایک ساتھ ہی کیونچے سوئے کے ڈوڑوں
 کی طرح اُچھ کر رہ گئے ہیں۔ ہریشان ہو ہو کر اس ڈیر کو
 دیکھتی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا سونپ کر کے کیچوں
 کہ کھپتا ہی چلا آئے اور میں اس کے سہاگے دُعا افق

سے جس اور پر ایک پتنگ کی طرح تن جاؤں۔

(چھوٹی کتاب)

غور لکھتا ہے۔

میں صرف اتنا سمجھا ہوں کہ عورت سے عشق کرنا اور نہیں
 خریدنا تمہارے لئے ایک ہی بات ہے۔ سو تم محبت کرنے
 کے بدلے ایک دو بیگے زمین خرید لو اور اس پر ساری
 عمر قابض رہو۔ زندگی میں صرف ایک عورت — اور
 یہ دنیا اس قدر بھری ہوئی کیوں ہے؟ — کیوں اس میں تنہا
 قلشے جمع ہیں؟ — صرف گندم پیدا کر کے ہی اللہ میاں نے
 اپنا اتھ کیوں نہ روک لیا — میری ضرورت اس زندگی کو جو کہ
 تمہیں دی گئی ہے ابھی طرح استعمال کرو۔ تم ایسے گامک
 ہو جو عورت حاصل کرنے کے لئے ساری عمر سڑا رہے کہتے
 رہو گے مگر اسے ناکافی سمجھو گے۔ میں ایسا خریدار ہوں جو
 زندگی میں کئی عورتوں سے سروسے کرے گا۔ تم ایسا عشق
 کرنا چاہتے ہو کہ اس کی ناکامی ہو کر کئی اور فی دہے کا مصنف
 ایک کتاب لکھے جسے خلائق دت سہلگی پیلے کاندھوں پر چھاپے
 اور ڈوبی بانار میں اسے مادی کے بھاؤ بیچے۔ میں اپنی

کتاب حیات کے تمام اوراق دیگ بن کر چاٹ جانا چاہتا ہوں
 تاکہ اس کا کوئی نشان باقی نہ رہے۔ تم محبت میں زندگی چاہتے ہو میں
 زندگی میں محبت چاہتا ہوں۔^۱ (تکلیف)

صحت کا اگر لالچے برے موت کے ڈیسر میں سے ایسا سرا مل جاتا، کھینچنے پر جو
 کھینچتا ہی چلا آتا اور وہ اس کے سہارے وفد افق سے اوپر ایک پنک کی طرح
 تپ جاتی اور غڑا اگر اپنی کتاب حیات کے آدھے اوراق ہی دیگ بن کر چاٹنے
 میں کامیاب ہو جاتا تو آج ادب کی لوح پر ان کے فن کے نقوش اتنے گہرے
 کبھی نہ ہوتے۔ وہ وفد افق سے بھی اُپر ہمارا میں تنی رہتی اور غڑکے پیٹ میں
 اس کی کتاب حیات کے باقی اوراق بٹس ہر کے اس کے ہمدردا سے شیشے
 کی اندری میں بند کر دیتے۔

پوٹین کے دیباچے میں کرشن چندر لکھتا ہے ۔

صحت کا نام آتے ہی مردانہ نگاہوں کو دھسے پڑتے
 لگتے ہیں، مشرعہ ہر دے ہیں، اکپ ہی آپ تخیف ہوتے
 جاریت ہیں۔ یہ دیباچہ میں اسی سخت کر مٹانے کا ایک نتیجہ ہے
 صحت کے متعلق جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، کسی بھی قسم کی سخت مٹانے کا نتیجہ نہیں
 ایک قمر من تھا جو سود کی بہت ہی جلی شرح کے ساتھ ادا کر رہا ہوں۔
 سب سے پہلے میں نے صحت کو کون سا افسانہ پڑھا تھا، مجھے بالکل یاد نہیں

مجھے فرستتے

یہ سطور کہنے سے پہلے میں نے مافطی کو بہت کھڑپا۔ لیکن اس نے میری دہیری نہیں کی۔ ایسا عموں ہنسا ہے کہ میں صحت کے افانے کاغذ پر مستقل ہونے سے پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مجھ پر کوئی دودھ نہیں پڑا۔ لیکن جیب میں نے اس کو پہلی بار دیکھا تو مجھے سخت نا اُمیدی ہوئی۔

اڈلفی جینرز لکچر ریڈر بیٹی کے، انبریڈیٹ میں جہاں ’مصور ہفت وار‘ کا دفتر تھا۔ شاہد لطیف اپنی پریس کے ساتھ داخل ہوا۔ پراگت ۲۴ ۱۹ کی بات ہے۔ تمام کانگریسی لیڈر ہاتھ کا گندھی سمیت گرتا رہ چکے تھے اور شہر میں کافی گڑبڑ تھی۔ فضا سیاست میں بسی ہوئی تھی، اس نے کچے دیہاتوں کا موضوع تحریک آزادی روا۔ اس کے بعد رُخ بدلے اور انسانوں کی باتیں شروع ہوئیں۔

ایک ہفتے پہلے جب کہ میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ملازم تھا ادب لطیف میں صحت کا لحاظ شائع ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یاد ہے۔ میں نے کوشش چندر سے کہا تھا: ’انسان بہت اچھا ہے، لیکن آخری جد بہت غیر ساعانہ ہے احمدمیم کی جگہ اگر میں ایڈیٹر ہوتا تو اسے یقیناً حذف کر دیتا۔ چنانچہ جب انسانوں پر باتیں شروع ہوئیں تو میں نے صحت سے کہا: ’آپ کا انسانہ لحاظ مجھے بہت پسند آیا۔ یہاں میں انسان کو بقدر کفایت استعمال کرنا آپ کی نمایاں خصوصیت رہی ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہے کہ اس انسانے کے آخر میں آپ نے بیکار سا جملہ لکھ دیا کہ ایک رنج آئے ہونے کا لحاظ میں نے کیا دیکھا۔ کوئی مجھے ہاکہ روپیہ بھی دے تو میں کبھی

نہیں تباؤں گی !

صحت نے کہا : کیا عیب ہے اس جھٹے میں ؟

میں جواب میں کچھ کہنے ہی دلا تھا کہ مجھے صحت کے چہرے پر وہی مٹا ہوا حجاب نظر آیا جو عام گھریلو لڑکیوں کے چہرے پر ناگفتی شے کا نام سن کر نمودار ہو سکتا ہے مجھے سخت ناامیدی ہوئی اس لئے کہ میں "محاف" کے تمام جزئیات کے متعلق اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا جب صحت چلی گئی تو میں نے دل میں کہا "یہ تو کم بخت بالکل صحت نکلی"۔

مجھے یاد ہے اس ملاقات کے دوسرے ہی روز میں نے اپنی بیوی کو دہلی خط لکھا : "صحت سے ملا تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بالکل ایسی ہی عورت ہے جیسی تم ہو۔ میرا مزاج تو بالکل کرکڑا ہو گیا۔ لیکن تم اسے یقیناً پسند کر لو گی۔ میں نے جب اس سے ایک اپنچ اٹھے ہوئے محاف کا ذکر کیا تو ملائق اس کے تصور کرتے ہی مجھ پر گئی !

ایک عرصے کے بعد میں نے اپنے اس پہلے دور عمل پر تنیدگی سے غور کیا اور مجھے اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اپنے فن کی بقا کے لئے ان کو اپنی فطرت کی حدود میں رہنا اڑسیں لازم ہے۔ اگر اکثر رشید جہاں کا فن آج کہاں ہے، کچھ تو گیسوفوں کے ساتھ کٹ کر علیحدہ ہو گیا اور کچھ پتھروں کی جیسوں میں محسوس ہو کر رہ گیا۔ فرانس میں جارج سان نے سوانیت کا حسین طبع آباد کر کے تعصن کی زندگی اختیار کی اورستانی

مرستارِ حشر میں سے ہو تھکوا تھکوا کر اس نے دل و گھر ضرور پیدا کرائے۔ لیکن اس کا اپنا جوہر اس کے بلن میں دم گھٹ کے مر گیا۔

میں نے سوچا عورت جنگ کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش لڑے پہاڑ کاٹے۔ افسانہ نگاری کرتے کرتے عصمت چٹائی بن جاتے۔ لیکن اس کے ہاتھوں میں کبھی کبھی ہندی رچی ہی چاہیے۔ اس کی ہاتھوں سے چوڑی کی کھنک آتی ہی چاہیے مجھے افسوس ہے جو میں نے اس وقت اپنے دل میں کہا۔ یہ تو کم بخت باطل عورت تھی!

عصمت اگر باطل عورت نہ ہوتی تو اس کے محبوبوں میں بھول بھلیاں اہل، اہل، اور گیندا جیسے نازک اور طالم افسانے کبھی بھی نظر آتے یہاں نے عورت کی مختلف ادائیں ہیں۔ صاف، شفاف، ہر قسم کے تعص سے پاک۔ یہ ادائیں، وہ عشق، وہ غم سے نہیں جن کے تیر بنا کر مردوں کے دل اور کیلے چسپنی کیے جاتے ہیں جسم کی بھونڈی حرکتوں سے ان ادائوں کا کوئی تعلق نہیں۔ ان روحانی اشاروں کی منزل مقصود اہل ان کا ضمیر ہے جس کے ساتھ وہ عورت ہی کی ان جانی — ان برعی مگر غلیب قدرت بے مثل گیر ہو جاتے ہیں۔

ان کی رنگت بدلی؟ بھلا پتہ — مر گیا اس کا باپ شاید؟
خدا کی تہا سے منیں، خدا نہ کہے۔ میں نے ننھے کر کیلے سے لگا لیا۔
”ٹھائیں۔“ ننھے نے مرقہ پا کر بندوق چلائی۔

”ائیں پامی — آبا کو اتا ہے۔“ میں نے بندوق چھین لی۔ (بھول بھلیاں)

اور لوگ کہتے ہیں صحت ناشدنی ہے، چڑیل ہے — گدھے کہیں گے ان چار سطروں میں صحت نے عورت کی روح نچوڑ کر رکھ دی ہے اور یہ لوگ اسے اخلاق کی استقامتی ٹھیلوں میں بیٹھے بلا کر دیکھ رہے ہیں، تو پ دم کر دینا چاہیئے ایسی اوندھی کھر پڑیوں کو۔

وساقتی 'میں' دوزخی، چھپا۔ میری بہن نے پڑھا اور مجھ سے کہا: 'صداوت ابیہ صحت کتنی بے ہودہ ہے۔ اپنے موٹے بھائی کو بھی نہیں چھوڑا کم بخت نے کسی کی فضول باتیں کہیں ہیں؟'

میں نے کہا: 'اقبال اگر میری موت برقم ایسا ہی مسنون لکھنے کا وعدہ کرے تو خدا کی قسم میں آج ہی مرنے کے لئے تیار ہوں؟'

شا جہان نے اپنی محبوبہ کی یا د قائم رکھنے کے لئے تاج محل بنوایا۔ میں نے اپنے محبوب بھائی کی یا د میں 'دوزخی' لکھا۔ شا جہان نے دوسروں سے پتھر ٹھوٹے انہیں ترشویا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر عظیم الشان عمارت تعمیر کرائی، صحت نے خود اپنے 'اتوں' سے اپنے خواہرا نہ جذبات چن چن کر ایک اونچا چان تیار کیا اور اس پر نرم نرم باتوں سے اپنے بھائی کی نقش رکھ دی۔ تلج شا جہان کی محبت کا برہنہ مرمری اشتہار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن 'دوزخی' صحت کی محبت کا نہایت ہی لطیف اور حسین اشارہ ہے وہ جنت جہاں مضمون میں آیا ہے، عنوان اس کا اشتہار نہیں دیتا۔

پہلی بیوی نے یہ مضمون پڑھا تو صحت سے کہا: 'یہ تم نے کیا خرافات لکھی ہیں؟'

بکری نہیں — لادزدہ برف کہاں ہے ؟

صحت کو برف کھانے کا بہت شوق ہے بالکل بچوں کی طرح ڈلی ہاتھ میں لیے دانتوں سے کٹا کٹ کاٹی رہتی ہے۔ اس نے اپنے مہین انسانے ہی برف کھا کھا کر رکھے ہیں۔ چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی بیٹی ہے۔ سانسے تیکے پر کاپی کھلی ہے ایک ہاتھ میں خاؤٹھن پن ہے اور دوسرے ہاتھ میں برف کی گولی ریڈیو اپنے سروں میں چلا رہا ہے مگر اس کا تلم اور نہ دونوں کھٹا کھٹ پل رہے ہیں۔ صحت پر لکھنے کے دور سے پڑتے ہیں۔ دیکھے تو مہینوں گزر جاتے ہیں۔ پر جب دودھ پڑے تو سیکرٹوں صفحے اس کے قلم کے نیچے سے نکل جاتے ہیں۔ کھانے پیئے، نہانے دھونے کا کوئی ہوش نہیں رہتا، بس ہر وقت چارپائی پر کہنیوں کے بل اوندھی بیٹی اپنے میٹرے میٹرے اعصاب اور اٹلا سے بے نیاز خط میں کاغذوں پر اپنے خیالات مشعل کرتی رہتی ہے۔

میڈی کلیر جیسا طول طویل ناول میرا خیال ہے صحت نے سات آٹھ نشستوں میں ختم کیا تھا۔

کرشن چندر صحت کے بیان کی رفتار کے متعلق کہتا ہے ۔

انسانوں کے مطالعہ سے ایک اور بات ہوتی ہے اس آتی ہے

وہ ہے گھوڑ دوڑ یعنی رفتار، حرکت، سبک خرامی اور میرا

خیال ہے اس سے کرشن چندر کی مراد برق رفتاری تھی اور

تیز گامی۔ دھڑکنے والا اور تھکا ہوا ہوتا ہے بلکہ نقرے
کنڈے اور اشارے اور آوازیں اور کردار اور جذبات اور
احساسات ایک طوفانی کی سی بلاخیزی کے ساتھ چلتے اور
آگے بڑھتے نظر آتے ہیں۔

صحت کا قلم اور اس کی زبان دونوں بہت تیز ہیں۔ کھٹا شروع کرے گی
تو کئی مرتبہ اس کا داغ آگے نکل جائے گا اور الفاظ بہت پیچھے ہٹتے رہ جائیں
گے۔ باتیں کہے گی تو لفظ ایک دوسرے پر چڑھتے جائیں گے۔ شیشی بھگرنے
کی خاطر اگر کبھی بارہا چرخے میں چلی جائے گی۔ تو صبر بالکل چھوٹ
جائے گا۔ طبیعت میں چونکہ بہت ہی جبلت ہے اس لیے آٹے کا پڑا ہوا
ہی سسکی سنگائی روٹی کی شکل دیکھنا شروع کر دیتی ہے۔ آٹا ابھی پھیپے نہیں
گئے لیکن ان کا سالن اس کے داغ میں پہلے ہی تیار ہو جاتا ہے اور میرا
خیال ہے۔ بعض اوقات وہ بارہا چرخے میں قدم رکھ کر خیال خیال میں
شکم سیر ہو کر وٹ آتی ہوگی۔ — لیکن اس حد سے بڑھی ہوئی جبلت کے
مقابلے میں اس کو میں نے بڑے ٹھنڈے اطمینان اور سکون کے ساتھ پہنچتی
کے فراق سیتے دیکھا ہے۔ اس کا قلم کہتے وقت ابلا کی غلطیاں کر جاتا ہے لیکن
نہی کے فراق سیتے وقت اس کی سوئی سے ہلکی سی لغزش ہی نہیں ہوتی۔ نہ
ٹٹے ٹانگے ہوتے ہیں اور محال ہے جو کہیں معمول ہو۔

اُن سے بچنے میں عصمت لکھتی ہے ۔

گھر کیا ہے محلے کا محلہ ہے۔ مرض پھیلے دبا آئے۔ دنیا
کے بچے ٹاپٹ مریں مگر کیا مجال جو یہاں ایک بھی ش
سے مس ہو جائے۔ ہر سال ماشاء اللہ گھر ہسپتال بن
جاتا ہے ۔ سختے ہیں دنیا میں بچے بھی مرا کرتے ہیں
مرتے ہوں گے۔ کیا خبر؟

اللہ بچے دنوں بستی میں۔ جب اس کی اپنی سیا کرکالی کھانسی برتی تورو راتیں
جاگتی تھی، ہر وقت کھوٹی کھوٹی رہتی تھی۔ مٹا ماں بننے کے ساتھ ہی کو کھ سے
بہر نکلتی ہے ۔

عصمت پر لے دے کی ہٹ دھرم ہے ۔ طبیعت میں مند ہے بالکل بچوں
کی سی، زندگی کے کسی نظریے کو، فطرت کے کسی قانون کو پہلے ہی سابقہ میں کبھی
قبول نہیں کرے گی۔ پہلے شادی سے انکار کرتی رہی۔ جب آمادہ ہوئی تو بیوی
بننے سے انکار کر دیا۔ بیوی بننے پر جوں توں رضامند ہوئی تو ماں بننے سے منکر
ہو گئی، بھینس اٹھائے گی، صوفتیں برداشت کرے گی، مگر صند سے کبھی باز نہیں
آئے گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کا ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے وہ زندگی کے
حقائق سے مدچار ہو کر بلکہ ٹھکرا کر ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اُس
کی ہر بات نرالی ہے ۔

صحت کے نفاذ اور مراد کر فاروں میں بھی یہ عجیب و غریب ضد یا انکار عام پایا جاتا ہے۔ محبت میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ لیکن نفرت کا اڈا رکھے چلے جائے ہیں۔ جی گال چومنے کو چاہتا ہے لیکن اس میں سوئی لکھو دیں گے۔ ہوسے سے تھکا ہوا گویا ایسی دھول جھانسیں گے کہ دوسرا بلبل اٹھے۔ یہ جارحانہ قسم کی منفی محبت جو بعض ایک کھیل کی صورت میں شروع ہوتی ہے عام طور پر صحت کے انسانوں میں ایک نہایت روم آئینہ صورت میں انجام پذیر ہوتی ہے۔

صحت کا اپنا انجام بھی اگر کچھ اسی طور پر ہوا۔ اور میں اسے دیکھتے کے لئے زندہ رہا تو مجھے کوئی تعجب نہ ہوگا۔

صحت سے متعلق مجھے پانچ چھ برس ہو گئے ہیں۔ دونوں کی آتش گیر اور ہک سے اڑ جانے والی طبیعت کے پیش نظر احتمال تو اسی بات کا تھا کہ سیکڑوں لڑائیاں ہوتیں۔ مگر تعجب ہے کہ اس دوران میں صرف ایک بار چغ ہوئی اور وہ بھی ہلکی سی۔

شاہد اور صحت کے مدعو کرنے پر میں اور میری جو سی مضیہ دونو بلاؤ زبانی کے مشافعات میں ایک جگہ جہاں شاہد میری ٹائیکز کی ملازمت کے دوران میں مقیم تھا، گئے ہوئے تھے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد باتوں باتوں میں شاہد نے کہا "موتو تم سے اب بھی زبان کی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔"

غیر محکمہ میں نے تسلیم نہ کیا کہ میری تحریر میں زبان کی غلطیاں ہوتی ہیں۔

شاہد شک گیا۔ دو بچے کہا عصمت نے اپنے شوہر کی پردی کی میں چھری
 نہانا۔ دفنا کوئی بات کہتے ہوئے عصمت نے لفظ "دست درازی" استعمال کیا
 میں نے جھٹ سے کہا: "صح لفظ دراز دستی ہے"۔ تین بچے گئے عصمت
 اپنی غلطی تسلیم نہ کی۔ میری بیوی سو گئی۔ شاہد قصہ ختم کرنے کے لئے دوسرے
 کمرے سے لعنت اٹھا لایا۔ "وہ کی تختی میں لفظ دست درازی موجود ہی نہیں
 تھا۔ البتہ دراز دستی اور اس کے معنی درج تھے۔ شاہد نے کہا: "عصمت! اب
 تمہیں اتنا پیسے گا۔۔۔ اب یہاں بیوی میں چھ شروع ہو گئی۔ مرنے
 اذانیں دینے لگا۔ عصمت نے لعنت اٹھا کر ایک طرف چھینکی اور کہا۔
 "جب میں لعنت بناؤں گی تو اس میں یہ صح لفظ دست درازی ہو گا۔ یہ کیا
 ہوا دراز دستی۔۔۔ دراز دستی۔"

کچ بکھی کا یہ سلسلہ دراز بہر حال ختم ہوا۔ اس کے بعد ہم ایک دوسرے
 سے کبھی نہیں روتے بلکہ یوں کہتے کہ ہم نے اس کا کبھی ہوتہ ہی نہیں آنے
 دیا۔ گنتگو کرتے کرتے جب بھی کوئی خطرناک موڑ آیا تو عصمت نے سُرُخ بدل
 پیا یا میں راستہ کاٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

عصمت کو میں پسند کرتا ہوں۔ وہ مجھے پسند کرتی ہے لیکن اگر کوئی
 دفتر پوچھ بیٹھے۔ تم دونوں ایک دوسرے کی کیا چیز پسند کرتے ہو۔ تو میرا خیال
 ہے کہ میں اور عصمت دونوں کچھ عرصے کے لئے بالکل خالی الذہن ہر جا میں۔

صحت کی شکل و صورت و فریب نہیں لیکن دل نشیں ضرور ہے۔ اس سے پہلی علامات کے نقش ابھی تک میرے دل و دماغ میں محفوظ ہیں۔ بہت ہی سادہ لباس میں تھی۔ چھوٹی کچی کی سفید ساڑھی، سفید زمین کا کالی کٹری مکینوں والا پست بلارہ اتھ میں چھوٹا پرس، پاؤں میں بنیراڑھی کا بٹون چپل چھوٹی چھوٹی مگر تیز اور محتسب انگلیوں پر سوئے ہوئے شیشوں والی عینک چھوٹے مگر گنگھریلے بال — نیلے ہانگ۔ ذرا سا مسکرانے پر ہمیشہ گالوں میں گڈھے بڑبڑاتے تھے۔

میں صحت پر عاشق نہ ہوا۔ لیکن میری بیوی اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ صحت سے اگر سفید اس کا ذکر کرے تو وہ ضرور کچے یوں کہے گی: بڑی کٹی بیوی محبت میں گرفتار ہو نہ لی۔ تنہا ہی مری لو کیوں کے بات تک تید ہوتے رہے ہیں میری محبت میں ایک بزرگوار اہل تدبیر تو ہیں ہی جانتا ہوں۔ جو بہت دیر تک صحت کے پیہم پہلے رہے۔ خط و کتابت کے ذریعے سے آپ نے عشق فرمانا شروع کیا جس صحت شبہ دیتی رہی لیکن آخر میں ایسا اڑنگا دیا کہ خریا ہی دکھا دی غریب کو۔ یہ سچی کہانی میرا خیال ہے وہ کبھی قلم بند نہیں کریں گے۔

باہم متصادم ہو جانے کے خوف سے میرے اور صحت کے درمیان بہت ہی کم باتیں ہوتی تھیں۔ میرا قصہ کبھی شائع ہو تو بڑھ کر داد دے دیا کرتی تھی: نیلم کی اشاعت پر اس نے غیر معمولی جوش و خروش سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ واقعی یہ بہن بنا کیا ہے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کسی عورت کو بہن کہنا اس کی توہین ہے؟

اور میں سوچتا رہ گیا — وہ مجھے منٹو بھائی کہتی ہے اور میں اسے عصمت ہی کہتا ہوں — دونوں کو خدا سمجھے !

نکاری پاپنہ چوبیس کی دہستی کے زمانے کا ریساکوئی واقعہ نہیں جو قابل ذکر ہو۔ نجاشی کے الزام میں ایک بار ہم دونوں گرفتار ہوئے۔ مجھے تو پہلے دو دفعہ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن عصمت کا پہلا موقع تھا۔ اس نے بہت جتنائی۔ اقلیت سے گرفتاری غیر قانونی تھی۔ کیونکہ پنجاب پولیس نے ہمیں بقیہ وارنٹ پکڑا تھا۔ عصمت بہت خوش ہوئی۔ لیکن بکریے کی ماں کب تک خیر نہ تھی۔ آخر اسے لاہور کی عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑا۔

میں سے لاہور تک کافی مباحثہ رہا۔ لیکن شاہد اور میری بددیانتی کے ساتھ ساتھ سادہ دقت خوب ہنگامہ رہا۔ صفیہ اور شاہد ایک طرف ہو گئے اور بڑا بڑا کی خاطر ہم دونوں کی فحش نگاہی پر عمل کرتے رہے۔ قید کی صورتوں کا نقشہ کھینچا۔ جیل کی زندگی کی جھلکیاں دکھائیں۔ عصمت نے آخر میں جھٹکا کر کہا: 'سوئی پر بھی چڑھا دیں۔ لیکن یہاں حلق سے انا لقمہ ہی نکلے گا۔'

اس مقدمے کے سلسلے میں ہم دو دفعہ لاہور گئے۔ دونوں مرتبہ کالجوں کے تماشائی طالب علم مجھے اور عصمت کو دیکھنے کے لئے ٹریاں باندھ باندھ کر عدالت میں آتے رہے۔ عصمت نے مجھ سے کہا: 'منٹو بھائی چوہدری نذیر سے کہیے کہ ٹکٹ لگا دے کہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہی نکل آئے گا۔'

اس کا جگہ پاس ہی گھوڑ بندر روڈ تھا۔ عصمت کی تجویز سب کو پسند آئی۔ چنانچہ چند نشتروں میں ہم سب جگے کے اندر گئے۔ نسیم حسبِ عادت پردے ایک اپ میں تھی اور نہایت نفیس ریشمی جارجٹ کی ساڑھی میں طبرس تھی وہاں اس کا خاوند احسان ہمارا مشورہ سن کر باہر نکلے عصمت نے جودنگوں میں لتھری مہرئی جتنی سی لگتی تھی میری جیوی سے جس پر مزید رنگ لگانے سے میرا خیال ہے کوئی فرق نہ پڑتا۔

نسیم کی تعریف کرتے ہوئے کہا: ”منیر! نسیم واقعی حسین عورت ہے۔“

میں نے نسیم کی طرف دیکھا اور کہا: ”میں ہی بہت ٹھنڈا“

جینک کے رنگ آلود شیشوں کے پیچے عصمت کی چوٹی چوٹی آنکھیں گھومیں اور اس نے آہستہ سے کہا: ”صفر! وہی طبیعتوں کے لئے ٹھنڈی چیزیں مفید مہرئی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اُسکے بڑھی اور ایک سیکنڈ کے بعد پُری چہرہ نسیم سرس کا صفرہ بنی تھی۔

عصمت اور میں بعض اوقات عجیب عجیب باتیں سوچا کرتے ہیں۔ ”نشتر بانی ہی چاہتا ہے اب مریض اور غریبوں کے رومانس کے متعلق کچھ لکھوں۔“ یا ”میں تو فوج میں مہرئی ہو جاؤں گی اور سوائی جہاز اڑانا سیکھوں گی۔“

چند مہینوں کی بات ہے میں اور عصمت یعنی ٹاکیز سے واپس ایکٹرک ٹرین میں گھر جا رہے تھے میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا: ”کرشن چندر

کے افسانوں میں دو چیزیں میں نے عام دیکھی ہیں..... زنا بالجبر اور قوسِ قزح جیسے وہ قوسِ قزح مختلف ہے۔ ”عصمت نے دھڑپا لیتے ہوئے کہا ”یہ تو ہے۔“
 ”سوجھا ہوں ایک مضمون لکھو۔ جس کا عنوان کرشن چندر، قوسِ قزح اور زنا بالجبر ہو۔ میں ساتھ ہی ساتھ شروع رہا تھا۔ لیکن زنا بالجبر سے قوسِ قزح کا انسانی رشتہ کیا ہو سکتا ہے؟“

عصمت نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد کہا: ”جالیائی نقد“ نظر سے قوسِ قزح کے رنگوں میں انتخابی جاذبیت اور کشش..... لیکن آپ تو کسی درویش سے سوشل سمجھتے تھے۔“

”جی ہاں..... سُرخ رنگ آگ اور خون کا رنگ ہے صفیات میں اس رنگ کو مریخ یعنی جلاؤنگ سے منسوب کیا جاتا ہے..... ہو سکتا ہے کہ زنا بالجبر سے قوسِ قزح کے صرف اسی رنگ کا دامن بندھا ہو۔“
 ”ہر سکتا ہے..... آپ یہ مضمون ضرور لکھتے؟“

”لیکن عیسائیوں کے فنی مسوری میں سُرخ رنگ عشقِ الہی کا منظر ہے...“
 ”..... نہیں نہیں؟ میرے دماغ میں دفعتاً ایک خلیہ چھوٹا؟“ صلیب پر چڑھنے کے شدید جذبے کو بھی اسی رنگ سے منوں کیا گیا ہے اور کنواری مریم کا بائیں سرخ ہوتا ہے..... یہ عصمت کی نشانی ہے.....“

یہ کہتے کہتے میں نے اچانک عصمت کے سفید بائیں کاٹھن دیکھا وہ سگری

”منٹو جانی آپ یہ مضمون ضرور لکھیں، مزہ آئے گا.... لیکن عنوان میں سے بالکل ہٹا دیجئے۔“

کرشن کو اعتراض ہوگا کیونکہ وہ جبریہ فعل سمجھ کر ہی تو دوتا ہے۔
 ”بیکار دوتا ہے۔ کیا معلوم کہ یہ ظلم ہی اس کی مظلوم ہیروئنوں کو اچھا لگا ہوتا۔“

اللہ بہتر جانتا ہے!
 عصمت کی انساں نگاری پر کافی مضمون لکھے گئے ہیں حتیٰ میں کم، مخالف
 کچھ تو باطل مہذب کی بڑھیں۔ چند ایسے ہیں جن میں زمین آسمان کے تقابے
 ملنے گئے ہیں۔

پطرس صاحب کے بھی جن کو لاہور کے ادبی ٹھیکیداروں نے ڈیریا
 میں بند کر رکھا تھا اپنا ٹاٹہ باہر نکالا اور قلم پکڑ کر عصمت پر ایک مضمون لکھ
 دیا آدمی زمین میں طبیعت میں شوقی اور مزاح ہے اس لئے مضمون کافی دلچسپ
 اور سلیبا ہوا ہے۔ آپ عصمت کے لیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ایک مقتدر و پختہ کار دیباچہ نویس رآپ کی مراد صلاح الدین
 صاحب سے ہے، نے بھی معلوم ہوتا ہے۔ ان پڑھانوں
 کے دیوڑ میں نرا اور مادہ الگ الگ کر رکھے ہیں عصمت
 کے متعلق فرماتے ہیں کہ جنس کے اعتبار سے اردو میں کم و بیش

انہیں بھی وہی رتبہ حاصل ہے جو ایک زلے میں انگریزی ادب میں جانس ایلیٹ کو نصیب ہوا۔ گویا ادب کو ٹھیس ٹورنا منٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے مابین علیحدہ ہوتے ہیں۔

”جانس ایلیٹ کا رتبہ مسلم لیکن یوں اس کا نام لے دینے سے تنگ ہی ملا اور برصغیر کو کیا مرے گا۔ اب یہ امر ایک علیحدہ بحث کا مقام ہے کہ کیا کوئی مابالائتیاں ایسا ہے۔ جو غلامی اور جنگی اور اتفاقی نہیں بلکہ داخلی اور جہلی اور بنیادی اور انشاء پر داز مردوں کے ادب سے تمیز کرتا ہے اور اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ ان سوالوں کا جواب کچھ ہر بہر حال اس نوع کا ہرگز نہیں کہ اس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے ”الگ الگ دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے۔“

ان سوالوں کا جواب بہت ممکن ہے ایسا نہ ہو جس کی بنیاد پر مصنفین کو جنس کے اعتبار سے دو قطاروں میں کھڑا کر دیا جائے لیکن جواب دینے وقت لوگ یہ ضرور سوچیں گے کہ سوال کرنے والا کون ہے۔۔۔۔۔ مرد یا عورت؟ کیونکہ صنف معلوم ہونے پر سوال کرنے والے کا جہلی اور بنیادی زاویہ نگاہ

بہت حد تک واضح ہو جائے گا۔

پطرس صاحب کا یہ کہنا کہ ”گویا ادب ہی کوئی ٹینس ٹورنامنٹ ہے جس میں عورتوں اور مردوں کے بیچ علیحدہ ہوتے ہیں“ ٹھیکٹ پطرس فقرے بازی ہے ٹینس ٹورنامنٹ ادب نہیں بلکہ عورتوں اور مردوں کے بیچ علیحدہ ہونا ہے ادبی بھی نہیں۔

پطرس صاحب کلاس میں پکڑ دیتے ہیں کہ طلبہ اور طالبات سے ان کا خطاب جداگانہ نہیں ہوتا۔ لیکن جب انہیں کسی شاگرد لڑکے یا شاگرد لڑکی کے دماغی نشوونما پر غور کرتا پڑے گا تو ماہر تعلیم ہونے کی حیثیت میں وہ ان کی جنس سے غافل نہیں ہو جائیں گے۔

محدث اگر جارج ایلیٹ یا عصمت چغتائی بن جائے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے ادب پر اس کے عورت ہونے کے اثر کی طرف غور نہ کیا جائے۔ صبر سے کے ادب کے متعلق بھی کیا پطرس صاحب یہ استدعا فرمائیں گے کہ کیا کوئی ماہر الامتیاز ایسا ہے۔ داخل اور جلی اور بنیادی حوالہ نشا پرداز ہستیوں کے ادب کو انشا پر ملاز مردوں اور عورتوں کے ادب سے میسر کرتا ہے۔

میں محدث پر محدث اور مرد پر مرد کے نام کا لیبل لگانا بھونڈے پن کی دلیل سمجھتا ہوں۔ مسجدوں اور مندروں پر یہ بھونڈا لگا کر یہ عبادت اور بندگی کی جگہیں ہیں بہت ہی مضحکہ خیز ہے لیکن جب کسی مسجد اور مندر کے مقابلے میں

کسی عام رہائش گاہ کو دکھ کر ہم فنِ تعمیر کا جامہ لیں گے تو اس پر منداورد
مسجد کی تقاریر کا اثر اپنے ذہن سے محو نہیں کر دیں گے۔

عصمت کے عورت ہونے کا اثر اس کے ادب کے ہر ہر نقطے میں موجود ہے
جو اس کو سمجھنے میں ہر ہر قدم پر ہماری رہبری کرتا ہے۔ اس کے ادب کی خمر میں
اورد کیوں سے جن کو پطرس صاحب نے اپنے مضمون میں غیر جانبداری سے بیان
کیا ہے۔ ہم مصنف کی جنس سے علیحدہ نہیں کر سکتے اور نہ ایسا کرنے کے لئے کوئی
تفقدی، ادبی یا کیمیائی طریقہ ہی موجود ہے۔

عزیز احمد صاحب "نیارور" میں عصمت کی "خیر صی کیر" پر تنقید کرتے
ہوئے لکھتے ہیں:-

"جسم کے اعتبار کا عصمت کے پاس ایک ہی ذریعہ
ہے اور وہ ہے مساس۔ چنانچہ رشید سے لیکر ٹیلر تک ہمیں
مرد جو اس ناول میں آتے ہیں سب کا اندازہ جسمی یا ذہنی مساس سے
کیا گیا ہے۔ زیادہ تر مساس کی کیفیت انفعالی ہی ہوتی ہے
مساس ہی عصمت کے یہاں اعتبارِ مرد و اعتبارِ انسان
اعتبارِ زندگی، اعتبارِ کائنات کا واحد ذریعہ ہے۔

رمانیوں کے بادلوں میں عباس کے ہاتھ بجلیوں کی طرح
کوندتے ہیں اورد لڑکیوں کے گروہ میں نخی نخی لڑکیوں کی پل

کر بکھر جاتی ہیں۔ رسولِ فاطمہ کے چہرے جیسے ہاتھ مساس کا تاریک
 رخ ہیں۔ نیم تاریک رخ میٹرن کا وہ منافرہ یا مہاشو ہے جس
 میں میٹرن کو تعجب تھا کہ ذہن میں لاکیاں ان غنڈوں کی آنکھیں
 اپنی رانوں پر دیکھتی ہوئی عسوس نہیں کرتیں۔ مساس کے سلسلے
 میں نشتر کا نسولانی احساس ریپٹرس صاحبہ متوجہ ہوں (ران پر
 کی انگلیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا ہے) "اے"

عوزی احمد صاحب کا یہ نظریہ غلط ہے کہ عصمت کے یہاں احساس کا انداز
 ایک فقط مساس ہی ہے۔ اول تو مساس کہنا ہی غلط ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسا
 عمل یا فعل ہے جو کچھ دیر جاری رہتا ہے عصمت تو غایت درجہ فکری الحس ہے۔
 ہلکا سا لمس ہی اس کے لئے کافی ہے۔ عصمت کے یہاں آپ کو دوسری جہان
 حسین بھی عموماً نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر سو گئے اود سننے کی جس صوت کا
 تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ عصمت کے ادب سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔

"گھر گھر۔ پھٹ خوں۔ فٹ : باہر آدے میں موٹر بٹاری تھی :
 "ریڈیو کو مڑتے تھے۔ گھر گھر شہر گھر میرے آلسر اٹھے :
 "تین تین : سائیکل کی شخصیت بھی : میں کچھ گئی : ریڈیو آگئی : رہ پھر :
 "اود جردا اود گئے کی کوشش کی تو دھما دم تھوٹوں کی آواز چھت پرائی :
 "اود دھم دھم چھن چھن کرتی بہو سیرھیوں پر سے آتری :"

”سرد آہوں اور صحنی خوشبو تک کو رنگ میں سوکر دکھا دیا تھا۔ لگ
پہینے سے گل چکے تھے اور ان میں مرگھٹ جیسی چمکاندے آنے لگی

تھی۔ (جال)

”مردانہ قبض۔ سگرٹ کی بو میں غرق لگی سی۔ (وسیر)

”نیچے کیاریوں میں سے دھننے کی ننھی ننھی پتیاں توڑ کر سونگھنے

لگی۔ (سیر) پتہ)

عصمت کی سب حسین وقت پر مرنے — پر اپنی اپنی جگہ کام کرتی

ہیں اور شیک طور سے کرتی ہیں، عزیز احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جنس ایک
مرض کی طرح عصمت کے اعصاب پر چھاٹ ہوئی ہے، ممکن ہے ان کی
تشخیص کے مطابق درست ہو۔ مگر وہ اس مرض کے لئے نئے نئے نمونہ نہ

فرمائیں۔ یوں تو لکھنا بھی ایک مرض ہے، کمال طور پر صحت مند آدمی

جس کا درجہ حرارت ہمیشہ ساڑھے اٹھانوے ہی رہے۔ ساری عمر
اپنی زندگی کی ٹھنڈی سیلٹ بنا تو میں نے بیٹھا رہے گا۔

عزیز احمد صاحب لکھتے ہیں:-

عصمت کی بیرونی کا سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ

دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاٹا اور نہ اس

نے کسی مرد کو عیش ایک ایسی چیز ہے جی کا جسم سے

وہی تعلق ہے جو سبلی کا تار سے ہے۔ لیکن کھٹا دیا تو یہی
 عشق ہزاروں قندیلوں کے برابر روشنی کرتا ہے۔ دوپہر کی
 جلست لڑیں پنکھا جلتا ہے۔ ہزاروں دیوئل کی طاقت
 سے زندگی کی غلیم لٹان مٹینوں کے پیچھے گھٹاتا ہے اور
 کبھی کبھی زلفوں کو سنوارتا اور کپڑوں پر لاشری کرتا ہے
 ایسے عشق سے عصمت چغتائی بحیثیت مصنفہ واقف نہیں۔

ظاہر ہے کہ عزیز احمد صاحب کو اس کا انوس ہے۔ گرے عشق جس سے
 عزیز احمد صاحب واقف معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے بچے سال اسکول
 کے ماتحت تمیز کیا ہے ادب وہ اسے ہر انسان پر عام کر دینا چاہتے ہیں
 عزیز احمد صاحب کو غرض کرنے کے لئے میں فرض کر لیتا ہوں کہ عصمت کی
 بیرونی ٹریجڈی کیسے وقوع پذیر ہوئی کہ دل سے نہ اسے کسی مرد نے چاٹا اور
 نہ اس نے کسی مرد کو۔

عصمت واقعی عزیز احمد صاحب کے تعریف کردہ عشق سے نا آشنا ہے
 اداس کی یہ نا آشنائی ہی اس کے ادب کا باعث ہے اگر آج اس کی زندگی کے
 تاروں کے ساتھ اس عشق کی بیل جڑ دی جائے اور کھٹا دیا دیا جائے تو بہت
 ممکن ہے ایک اور عزیز احمد پیدا ہو جائے۔ لیکن تم یہ گیند: مہبول بھلیاں

عرصہ ہوا وہی کے ایک ذاتِ شریف مولیشد نے غیب و غریب حرکت کی آپ نے
 "اوروں کی کہانی سن میری زبان" اُس کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہو گا۔
 جیسے عنوان سے مشائخ کی۔ اس میں میرا، عصمت، معنی، پریم چند، خواجہ
 محمد شفیع اور عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایک انسانہ شامل تھا۔ دیا پچے میں ترقی
 پسند ادب پر ایک تنقیدی چوٹ ملے گی۔ پھر اُن کے بعد اُن کی فراموشی گئی
 تھی اور اس کارنامے کو اپنے دوسرے نئے نئے بچوں کے نام سے مضمون کیا گیا تھا۔ اس کی
 ایک کاپی آپ نے عصمت کو اور مجھے روانہ کی، عصمت کو دلش کی یہ
 ناشائستہ اور جھوٹی حرکت سخت ناپسند آئی۔ چنانچہ بہت ہنسا کر ٹھے
 ایک خط لکھا:-

منو بھائی آپ نے وہ کتاب جو دلش نے چھاپی ہے
 دیکھی؟ ذرا اسے پشکاریے اور ایک نوٹس دیجئے۔
 کبھی طور پر کہ ہر مضمون کا جرمانہ دو سو روپے دودرت
 دعویٰ ٹھونک دیں گے۔ پھر ہونا چاہئے۔ آپ بتائیے
 کیا کیا جائے۔ یہ خوب ہے کہ جس کا دل چاہتا ہے اشاکر
 ہیں کیہڑا میں تھیڑ دیتا ہے اور ہم کہ نہیں کہتے ذرا مزہ
 رہے گا۔ اس شخص کو خوب رگڑ دینے آئیے وکر اُٹھا
 عظیم وار کیوں بن رہا ہے عریاں ادب کا اکہ نے ہمارے

افسانے صرف کتاب فروخت کرنے کیلئے چھاپے ہیں
 ہماری جنگ ہے کہ ہمارے غیرے خصوصاً کم عقلوں
 کی ڈانٹیں سنتا پڑیں۔ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس کو
 سامنے رکھ کر ایک مضمون لکھئے آپ کہیں گے میں کیوں
 نہیں لکھتی تو جواب ہے کہ آپ سچے ہیں۔

جب محنت سے ملاقات ہوئی تو اس خط کا جواب دیتے ہوئے میں نے
 کہا: سب سے پہلے لاہور کے چوبندہ محمد حسین صاحب ہیں ان سے ہم درخواست
 کریں تو وہ ضرور پیش قدمی فرمادیں گے۔
 عصمت مسکرائی: تجویز تو خشک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم بھی ساتھ
 دھرتے جائیں گے۔

میں نے کہا: کیا ہوا..... عدالت خشک بلکہ سہی لیکن کرنل شاپ ترکانی
 دلچسپ بلکہ ہے..... مشورہ پیش کو دانا لے جائیں گے۔ اور..... عصمت کے
 گالوں کے گرد سے گہرے ہر گئے۔

مرلی کی دھن

اپرل کی تیش یا چوبیس تھی۔ مجھے اچن طرح یاد نہیں رہا۔ پاگل خانے میں شراب چھوڑنے کے سلسلے میں زیر علاج شاہک شایام کی موت کی خبر ایک اخبار میں پڑھی۔ ان دنوں ایک عجیب و غریب کیفیت مجھ پر طاری تھی۔ بے ہوشی اور نیم بے ہوشی کے ایک پکر میں پھنسا ہوا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہوش مندی کا علاقہ کب شروع ہوتا ہے اور میں بے ہوشی کے عالم میں کب پہنچتا ہوں۔ دونوں کی سرحدیں کچھ اس طرح آپس میں گڈا گڈا ہو گئی تھیں کہ میں خود کو "لوہ نیئر لینڈ" میں سمجھتا محسوس کرتا تھا۔

شایام کی موت کی خبر چنانچہ جب میری نظروں سے گزری تو میں نے سمجھا یہ سب حرکت شراب کی کارستانی ہے۔ جن نے میرے ذہن میں پہلی پیدا

کردکھی ہے۔ اس سے قبل نیم خوابی کے عالم میں کئی عویڑوں کی موتیں میرے لئے واقع ہو چکی تھیں اور نیم ہر شمدی کے وقت مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ وہ سب کے سب زندہ ہیں اور میری صحت کے لئے رعائیں مانگ رہے ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں نے یہ خبر پڑھی تو ساتھ والے کمرے کے پاگل سے کہا: ”جانتے ہو۔ میرا ایک نہایت ہی عزیز دوست مر گیا ہے۔“
 اُس نے پوچھا: کون؟

میں نے گھوگر آواز میں جواب دیا: شیم؛
 کہاں؟ یہاں پاگل خانے میں؟

میں نے جواب کوئی نہ دیا۔ اور تے کئی تصویریں میرے مضطرب دماغ میں ابھریں۔ جن میں شیم تھا، مسکراتا شیم، ہنساتا شیم، بخود پاتا شیم، زندگی سے بھرپور شیم، موت اور اُس کی ہولناکیوں سے قطعاً نا آشنا شیم میں نے سوچا جو کچھ میں نے پڑھا ہے بالکل غلط ہے.....۔ اختیار کا وجود میرے دماغ کی اختراع ہے۔

آہستہ آہستہ انکس کی دھند دماغ سے ہٹنے لگی اور میں تمام واقعات کو ان کے صحیح قد و خال میں دیکھنے لگا۔ مگر یہ عمل کچھ اس قدر سست رفتار تھا کہ جب میں شیم کی موت کے حادثے سے دوچار ہوا تو مجھے زیر دست دھکا نہ لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے وہ عرصہ ہوا مریچکا تھا اور اس کی موت کا صدمہ بھی عرصہ ہوا مجھے پہنچ چکا تھا۔ اب صرف اس کے

یہ نعرہ بلند کر سکا : شایام زندہ باد !

غجے یقین ہے موت کے ہونٹوں کو بڑے خلوص سے چومتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوتا : غٹو — خدا کی قسم ان ہونٹوں کا مزہ کچھ اور ہی ہے !
میں جب بھی شایام کے تعلق سرتپا ہوں تو غجے مشہور روسی ناول نویس آتھر تزنلی شیف کا ہیرو سنیاٹن یاد آجاتا ہے۔ شایام عاشق تھا، عشق پیشہ نہیں تھا۔ وہ ہر خوبصورت چیز کو مرنا تھا — میرا خیال ہے کہ موت ضرور غریب صورت ہوگی لہذا وہ کبھی نہ مرنا۔

اُس کو تمیز اور صحت سے پیارتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ میں نہیں مانتا۔ شایام ٹھنڈے ہاتھوں کا باطل تامل نہیں تھا۔ اگر واقعی موت کے ہاتھ ٹھنڈے ہوتے تو اس نے یہ کہہ کر ایک طرف جھٹک دیے ہوتے۔
”ہٹو بڑی بی — تم میں خلوص نہیں ہے !
غجے ایک خط میں لکھتا ہے ۔

قتلہ بیسے جان من ! کہ یہاں ہر ایک ہپ ٹلا ہے
لیکن اصل ہپ ٹلا یہاں سے بہت دور لیکن میری پوچھ
ہر تو بڑی کوئی ایسی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ حرف شکایت
لب پلاؤں زندگی خوب گزر رہی ہے — زندگی
مے خوشی ! مے خوشی ! زندگی ! ساتھ ساتھ چل رہی ہے

تبائی (مٹاڑ) چھ بھینے کے حوسے کے بعد واپس آگئی ہے
وہ ابھی تک میری ایک بڑی زبردست کمزوری ہے اور
تم جانتے ہو عورت کی محبت کی گرمی کی راحت محسوس کرنا
کتنی فرحت انگیز چیز ہے..... آخر میں انسان میں
ایک نردل انسان۔

نگار (نگار سلطان) کبھی کبھی مٹی ہے، بیسکن اوتلیں مٹی
مٹ کا ہے۔

شاموں کو تہذیبی دانشمند بکواس اکثر یاد آتی ہے۔

شام نے اس خطیب ایک لفظ "ہپ ٹا" استعمال کیا ہے اس کی تشریح
چونکہ خالی از دہلی نہیں، اس لئے آپ میں سن لیجئے۔

میں بیٹی ٹائینو میں غلام تھا۔ ان دنوں کمال امر دہی کی فلمی کہانی "حرمی" (جو
اصل کے نام سے فلمائی گئی) کی تشکیل و تکمیل ہو رہی تھی۔ اشوک، واجہا، حسرت
(دکھنوی) اور میں سب ہر روز بحث و تمیص میں شامل ہوتے تھے۔ ان نشستوں
میں کام کے علاوہ کبھی کبھی خوب زور وں پر گپ بھی چلتی تھی۔ ایک دوسرے سے
مذاق ہوتے شایام کو جب فلم بیوز کی شوٹنگ سے فراغت ہوتی، تو وہ بھی
ہماری محفل میں شریک ہو جاتا۔

کمال امر دہی کو عام گفتگو میں بھی ٹیٹ قسم کے ادبی الفاظ استعمال کرنے

کی عادت ہے۔ میرے لئے یہ ایک مصیبت ہو گئی تھی۔ اس لئے اگر میں عام فہم انداز میں کہانی کے تعلق اپنا کوئی نیا خیال پیش کرتا تو اس کا اثر کمال پر پوری طرح نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اگر میں زردوار الفاظ میں اپنا مندر بیان کرتا تو اشوک! وہ داپا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا، چنانچہ میں ایک عجیب قسم کی ملی جلی زبان استعمال کرنے لگا۔

ایک روز صبح گھر سے بیٹی نکلیز آتے ہوئے میں نے ٹرین میں احبار کا اسٹوڈنٹس کا لم کھولا۔ بڑے بڑے اسٹڈنٹس میں کرکٹ پیچ ہو رہے تھے ایک کھلائی کا نام کچھ عجیب و غریب تھا، ہپ ملا۔ ”پچ“ اسی ہلی، ٹی، یو، ایل، ایل، پچ۔ اسے — ہپ ملا۔۔۔ میں نے بہت سوچا کہ آخر یہ کیا ہو سکتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ شاید ہیبت اللہ کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔

اسٹڈیو پر پہنچا تو کمال کی کہانی کی فلمی تشکیل کا کام شروع ہوا۔ کمال نے اپنے مخصوص انداز بیان اور اثر پیدا کرنے والے انداز میں کہانی کا ایک باب سنایا۔ مجھ سے اشوک نے رائے طلب کی۔ ”کیوں غلط؟“

معلوم نہیں کیوں میرے منہ سے نکلا: ”ٹھیک ہے۔“ مگر ہپ ملا نہیں! بات کچھ یوں ہو گئی: ”ہپ ملا! میرا مطلب بیان کر گیا میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ یوں سنس زردوار نہیں ہے۔“

کچھ عرصے کے بعد حسرت نے اُسی باب کو ایک نئے طریقے سے پیش کیا۔ میری رائے پوچھی گئی تو میں نے آپ کی ذمہ داری طور پر کہا: ”بھئی حسرت بات

نہیں بنی — کوئی ہپ ٹلا چیز پیش کرو۔ ہپ ٹلا۔

دوسری مرتبہ ہپ ٹلا کہہ کر میں نے سب کی طرف رد عمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ یہ لفظ اب معنی اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں بلا تکلف میں نے اسے استعمال کیا۔ ہپ ٹلیٹی نہیں۔ ہپ ٹلا نہ کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ لیکن اچانک ایک بار اشوک مجھ سے مخاطب ہوا: ہپ ٹلا کا اصل مطلب کیا ہے؟ کس زبان کا لفظ ہے؟

شیام اس وقت موجود تھا۔ جب اشوک نے مجھ سے یہ سوال کیا، اس نے زور کا تہقہ لگایا۔ اس کی آنکھیں سڑگیں۔ ٹرین میں وہ میرے ساتھ تھا۔ جب میں نے کرکٹ کے کھلاڑی کے اس عجیب و غریب نام کی طرف اس کو متوجہ کیا تھا، منس ہنس کے دوہرا ہوتے ہوئے اس نے سب کو بتایا کہ یہ منٹر کی نئی منٹویت ہے جب کہ مجھ میں نہ آیا۔ تو ہپ ٹلا کو پہنچ کر فلمی دنیا میں لے آیا۔ مگر کھینچا تانی کے بغیر یہ لفظ بیٹے کے فلمی حلقوں میں رائج ہو گیا۔

۱۹۶۷ء کے خط میں شیام مجھے لکھتا ہے۔

پیارے منٹو! اب کی دفعہ تم پھر خاموش ہو۔ تہلاری یہ خاموشی مجھے بیت دق کرتی ہے۔ اس کے باوجود کہ میں تہلارے دماغی تساہلی سے بخوبی واقف ہوں۔ میں غصے سے دیوانہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جبکہ تم یکجہت چپ سا

حتم ہو جاتی ہے تو وہ اپنے ماضی کو پٹ پٹ کر دیکھنے لگتا ہے لیکن تم فکر مند نہ ہونا میں اس آخری منزل سے کچھ دُور ہوں۔ زندگی بہت معروف اور بھرپور ہے۔ اور بھرپور زندگی میں تم جانتے ہو۔ دیوانگی کے لئے بہت کم فرصت حتیٰ ہے۔ حالانکہ مجھے اس کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

نیم والا نظم (چاندنی رات) قریب قریب نصف مکل ہو چکا ہے۔ امر ناتھ سے ایک فلم کا کنٹریکٹ کر چکا ہوں۔ ذرا سوچو تو میری ہیر و من کون ہے؟ — نگار (نگار سلطان) میں نے خود اس کا نام تجویز کیا تھا۔ محض یہ سہل کرنے کے لئے کہ پردے پر ان پرانے جذبات کا امداد کیسے لگتا ہے جو کبھی کسی سے حقیقت کی دنیا میں متعلق رہے ہیں — پہلے مسرت تھی، اب محض کا رد بار لیکن کیا خیال ہے تبارا۔ یہ سدا جوش آفریں نہیں رہے گا۔

تاجی، ابھی تک میری زندگی میں ہے۔ نگار بہت ہی سچی ہے اور اس کا سلوک بے حد نرم و نازک، پچھلے دنوں سے روم لا بھی یہاں بیٹھے ہیں ہے۔ اس سے ملاقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک اس کمزوری کو جو اس کے

دل و دماغ میں میری طرف سے موجود ہے غلوب نہیں کر
سکی، چنانچہ ہمیں کے ساتھ بھی سیر و تفریح رہی ۔

اولڈ بوائے میں ان دنوں فلمیں کے فن میں انڈین
ٹرننگ لے رہا ہوں۔ مگر دوست یہ سارا سلسلہ بہت ہی عجیب
ہو گیا ہے، بہر حال میں پیچیدگیاں پسند کرتا ہوں ۔

وہ میرے اندر جو حسرت آزا، ہم جو ادارہ گرد ہے
ابھی تک کافی طاقتور ہے۔ میں کسی مضمون جگہ کا نہیں
اور نہ کسی مضمون جگہ کا ہونا چاہتا ہوں۔ میں لوگوں سے
محبت کرتا ہوں اور ان سے نفرت کرتا ہوں۔ زندگی
یوں ہی گزر رہی ہے۔ دراصل زندگی ہی ایک رسی
مسوڑہ ہے جس عجیب محبت ہے۔ لوگ جائیں جہنم میں !

مجھے مصنف کا نام بھول گیا ہے۔ مگر اس کا ایک ٹیڈیا
رہ گیا ہے۔ شاید وہ بھی درست نہ ہو۔ مگر مفہوم کچھ اسی قسم
کا تھا۔۔۔ وہ لوگوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ خود
کو محبت کہتے ہیں ابھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ لیکن وہ
اس طور پر ان سے نفرت کرتا تھا کہ (نفرت کہنے میں
خود کو ایک دہنہ محسوس کرتا تھا)۔

میں اس میں اور کوئی خُقرہ شامل نہیں کر سکتا۔

ان دو خطوں میں تاجی کا ذکر آیا ہے۔ خطوط وعداتی میں اتنا تو میں بتا چکا ہوں کہ یہ ممتاز کی تعین ہے۔ قمار کون ہے یہ خود شام بتا چکا ہے کہ وہ اس کی کمزوری ہے۔ برج پر چھپے تو نگار، رسولاسب اس کی کمزوریاں تھیں۔ وحدت و دامل اس کی سب سے بڑی کمزوری تھی اور یہی اس کے کردار کا مضبوط ترین پہلو تھا۔

قمار، زریب قریشی ایم۔ اے کی چھوٹی بہن ہے۔ زریب کے ساتھ بیٹے گنی تو ظہور راجہ کے جہادی بھرم مشن میں پسں گئی۔ کچھ عرصے کے بعد اس سے اپنا واس چھڑا کر لاہور آئی۔ تو شعیام کے ساتھ روانس شروع ہو گیا۔ بیٹے۔ میں جب شعیام کی حالت درست ہوئی۔ تو اس نے اپنے ہمنے والے بھوں کی خاطر اس سے شادی کر لی۔

شعیام کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ خاص طور پر خوبصورت بچوں سے خواہ وہ مدد درجہ بدتمیزی کیوں نہ ہوں۔ طہارت و نفاست پسند طبقوں کی نظر میں وہ خود بہت بڑا بدتمیزی تھا۔ یعنی عورتیں تو اس سے اس کی بدتمیزی کی وجہ سے سوت نفرت کرتی تھیں، مگر وہ بالکل بے پردہ تھا۔ اس نے کبھی ان عورتوں کی خوشنودی کے لئے اپنی عادت سنوارنے کی کوشش نہ کی۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ منٹو۔ میری باتیں سن کر یہ ناک بھوں چڑھانے والی سایاں سب جتنی ہیں۔ ایک اپ کی دنیا میں رہتی ہیں۔

لیکن بعض عورتیں اس کی بد تمیزوں سے محبت بھی کرتی تھیں۔ کیونکہ ان میں بستر کی ٹونہیں، ہوتی تھی۔ شام اُن سے کھلے مذاق کرتا۔ وہ بھی اس سے ایسی باتیں کرتیں۔ جو مہذب سوسائٹی میں قابلِ سترپش سمجھی جاتی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں، چپتیں، حلق سے قہقہے اچھلتے، جھنٹے جھنٹے شام کی آنکھوں میں آنسو آجاتے اور مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ دورِ کونے میں طہارت پندی نو کیلئے کیوں پرکاشن جمانے اپنے گناہ بھڑانے کی رائیگاں گردش کر رہی ہے۔

شام سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی یہ مجھے بالکل یاد نہیں یا یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں اس سے غٹنے سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ ویسے اب سرچنا ہوں تو اتنا یاد آتا ہے کہ بیٹی میں اس سے شروع شروع کی ملاقاتیں شاید سیڈی جھنڈی جی روڈ پر ہوئی تھیں۔ جہاں میری بہن رہتی تھی۔ "بائی منٹ" میں بالائی منزل کے ایک فلیٹ میں ڈاننڈ رہتی تھی۔ اس کے اس شام کا آنا تھا۔ دو تین مرتبہ غائب میٹر جیوں میں اس سے ملنا ہوا۔ یہ ملاقاتیں گوریجی تھیں لیکن غایت درجہ بے تکلف تھیں۔ کیونکہ شام نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا۔ کہ ڈاننڈ نام کی عورت جو سنر شام کہلاتی ہے۔ درحقیقت اس کی بیوی نہیں لیکن تعلقات کی بنا پر وہ بیوی سے کچھ زیادہ ہی ہے وہ ازدواجی رشتہ اور اس کے اشتہار کا بالکل قائل نہیں تھا۔ لیکن جب ایک تکلیف کے سلسلے میں اُسے ڈاننڈ کو ہسپتال داخل کرنا پڑا تو اُس نے دھڑکیں اس کا نام سنر شام

ہی نکھوایا ۔

بہت دیر بعد ڈائنڈ کے شوہر نے مقدمے باری کی شیم کو بھی اس میں بٹنایا گیا۔ لیکن معاملہ دفع دفع ہو گیا اور ڈائنڈ جو کہ اب بھی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی۔ اور وزنی جیپیں دیکھ چکی تھی شیم کی زندگی سے نکل گئی مگر شیم اس کو اکثر یاد کرتا تھا۔

مجھے یاد ہے۔ پوٹنے کے ایک باغ میں اس نے مجھے سیر کرتے ہوئے کہا ۔

”ننٹو ڈائنڈ گریٹ عورت تھی۔ خدا کی قسم جو عورت اسطرح بدداشت کر سکتی ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی مصوبت کا مقابلہ کر سکتی ہے؛ لیکن فردا ہی اس نے کچھ سوچ کر کہا :- یہ کیا بات ہے ننٹو عورت پہل پہل سے کیوں ٹھرتی ہے۔ کیا اس لئے کہ یہ گناہ کا ہوتا ہے؛ مگر یہ گناہ اور ثواب کی بکواس کیا ہے۔ ایک نوٹ اصلی یا جعلی ہو سکتا ہے۔ ایک پتہ حلال کا یا حرام کا نہیں ہو سکتا۔ وہ جھٹکے یا کھرچنے کے چھری پھرنے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی پیدائش کا موجب تو عظیم الشان دیرانگی ہے۔ جس کے مرتکب سب سے پہلے باوا آدم اور اماں حوا ہوئے تھے۔ آہ یہ دیرانگی !“

اور وہ دیر تک اپنی مختلف دیرانگیوں کی باتیں کرتا رہا۔

شیم بہت بند بائگ تھا۔ اس کی ہر بات، اس کی ہر حرکت اس کی ہر آواز اور بچے سروں میں ہوتی تھی۔ احتیال کا وہ بالکل قائل نہیں تھا۔ محفل میں سنجیدگی و مسامت کی ٹپنی بہن کر بیٹھا اس کے نزدیک سفر میں تھا۔ شعل مے نورشی کے دکان

گنجے فرشتے

میں خاص طور پر اگر کوئی خاموش ہو جاتا یا تفسق میں جاتا، تو اسے ناقابل بیان گرفت ہوتی۔ اس قدر جھنجھلا جاتا کہ بعض اوقات بزل اور گلاس توڑ پھوڑ کر گامیاں دیتا غصہ سے باہر چلا جاتا۔

پڑنے کا ایک واقعہ ہے۔ شام اور مسودہ پر دینہ دونوں زبیدہ کی میز میں دھتے تھے ایک کہانی فردوس کتنے کے سلسلے میں مجھے وہاں ٹھہرنا پڑا۔ مسودہ طبعاً خاموشی پسند ہے۔ شرب پی کر وہ اور بھی زیادہ سہجہ ہو جاتا، ایک دن صبح سے دم کا دور شروع ہوا۔ اس دوران میں کئی آنے اور بہک کر چلے گئے۔ میں مسودہ اور شام ڈٹے ہوئے تھے۔ شام بہت خوش تھا۔ اس لئے کہ وہ پہلے والوں سے مل کر جی بھر کے شور مچاتا رہا تھا۔ مگر شام کے قریب اس کو دھتے محسوس ہوا کہ مسودہ دن کی تمام باتوں سے الگ تھلگ رہا ہے۔ دھتے سے چڑا پنکھوں کو کیڑا کر اٹھنے نے مسودہ کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیوں حضرت پر دینہ کیا آپ نے اپنا مرثیہ مکمل فرمایا ہے؟"

مسودہ حسب عادت مسکرا دیا۔ اتنے میں کرشن چندر آگیا اور شام مسودہ کی سہجہ مسکراہٹ کے پیدا کردہ اثر کو بھول گیا۔ وہ ایک دھتے تو شام نے کرشن سے مسودہ کے ناقابل برداشت انجاء کا ذکر کیا۔ کرشن کی زبان کا تالا کھولنے کے لئے دو پیگ کافی تھے۔ چنانچہ مسودہ سے مخاطب ہو کر اس نے لعن طعن شروع کر دی: تم کیسے شاعر ہو پر دینہ صبح سے پانی رہے ہو اور تم نے ابھی تک

کوئی ماہیت بات نہیں کی۔ خدا کی قسم جو شاعر و اہیت کجاس کرنا نہیں جانتا وہ شاعری بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ہجرت ہے کہ تم شاعری کیسے کر لیتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تہادی یہ شاعری یقیناً کجاس ہوگی۔ اور تہاد پانی کریوں کیسٹر آئل کی بوتل بن جانا تہادی اصل شاعری ہے :

یہ سُن کر شام اس قدر ہنسا کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ جب کچھ دیر تک مسودے سے چھڑ جادی رہی تو وہ اکھاڑا کہ اُس نے ہم سب کے گاس خالی کر دیے اور کہا : ”چلو باہر چلیں“۔

ہم باہر نکلے۔ مسودے کے کہنے پر سب نے اپنے جوتے اتار کر جیپوں میں لٹکائیے۔ اور دوڑنے لگے۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے پونڈ کی ٹریفک سب سنان تھیں۔ میں مسودہ، شام اور ایک اور جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ دیوانہ وار شور مچاتے دوڑ رہے تھے۔ بالکل بے مطلب ! اپنی منزل سے نا آشنا۔

راستے میں گرشن چندر کا مکان پڑتا تھا۔ وہ دوڑ سے پہلے ہم سے الگ ہو کر چلا گیا تھا۔ دروازہ کھولا کہ ہم نے اسے بہت پریشان کیا۔ اس کی تینہ خاتون ہلاک شور مچ کر دوسرے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس سے گرشن اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ جس کے پیش نظر ہم وہاں سے رخصت ہوئے اور پھر عک پمائی شروع کر دی۔ پڑے مندروں کا شہر ہے۔ ہر فرلانگ پر ایک ذ ایک مندر ضرور ہوتا ہے۔ مسودہ نے ایک کا گھنڈہ بجایا۔ میں اور شبیم سجدے میں چلے گئے اور شر شمشو، شر شمشو

گئے زینت

کہنے لگے۔ اس کے بعد جرجی مندر آتا۔ ہم چاروں بھی محل و ہراتے اور خوب
قبضے لگاتے۔ جب کوئی بھاری آنکھیں ملتا یا ہر نکلتا۔ تو ہم خاموش ہو جاتے اور
چپ چاپ چل پڑتے۔

اسی طرح تین بج گئے — ایک سڑک پر کھڑے ہو کر مسود نے وہ خط
بکریں کر میں دنگ رہ گیا۔ کیونکہ اس کی زبان سے میں نے کبھی ناشائستہ کلمہ نہیں
سنا تھا۔ مگر جب وہ سوٹی موٹی گالیاں اگل رہا تھا۔ تو میں نے محسوس کیا کہ وہ اس
کی زبان پر ٹھیک طور پر بیٹھتی نہیں تھیں۔

چار بجے ہم زبیدہ کا بیچ پیچھے اور سو گئے۔ لیکن مسود شاید جاگتا اور شکر کہتا
رہتا۔

مے نوشی کے معاملے میں بھی شعیام اعتدال پسند نہیں تھا۔ وہ کھل کھیلنے
کا قائل تھا۔ مگر اپنے سلسلے میدان کی وسعت دیکھ لیتا تھا۔ اس کی لمبائی چوڑائی
کو اچھی طرح جان لیتا تھا۔ تاکہ حدود سے آگے نکل نہ جائے وہ عجیب سے کہا کرتا
تھا۔ میں چو کے پسند کرتا ہوں — چھکے بعض اتفاق سے لگ جاتے ہیں۔
ایک چھکا ملاحظہ ہو:-

تقسیم ہونے سے چند ماہ پیشتر کا ذکر ہے شعیام، شاہد لطیف سنگھ
سے میرے یہاں چلا آیا تھا۔ بیٹی کی زبان میں کڑا کی یعنی نفسی کے دن تھے مگر
نوشی بڑی رفتار لگی سے جاری تھی۔ ایک شام باتوں باتوں میں زیادہ پانی گئے۔

راجہ بھدی مل خان بھی اتفاق سے موجود تھا۔ گرفتار کا وقت ہوا تو اس نے جانے کی اجازت چاہی۔ میں نے اس نے کہا: ”پاگل ہوئے ہو پکڑے جاؤ گے۔“
 شام نے اس سے ازراہ مذاق کہا: ”میں سو جاؤ۔ آج کل تاملی یہیں نہیں شہ۔“
 راجہ نے مسکرا کر جواب دیا: ”مجھے نیند نہیں آئے گی۔ سپرنگ والے پتنگوں پر میں قطعاً سو نہیں سکتا۔“

شام نے ایک گلاس میں راجہ کے ڈیل ڈول کے مطابق برانڈی کا پگ ڈالا۔
 اور اس کو دے دیا۔ یہ لوہ اس سے نیند آجائے گی :-

راجہ ایک جرے میں سارا گلاس چڑھا گیا۔ بہت دیر تک تاجی کی بائیں ہوتی رہی۔ جو شام سے ناراض ہو کر اپنی بہن کے پاس چلی گئی تھی۔ ہر انٹرویو دسویں دفعہ نکلتی نکلتی باتوں پر دونوں میں چرچ ہو جاتی تھی۔ میں بالکل دخل نہیں دیتا تھا۔ اس لئے کہ شام کو یہ بالکل پسند نہیں تھا۔ ہم دونوں میں گویا دل ہی دل میں یہ معاہدہ ہو چکا تھا کہ ایک دوسرے کے کاموں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔

تاجی یوں گئی تھی جیسے کبھی واپس نہیں آئے گی۔ اور شام نے بھی اٹھے ہیں دواغ کیا تھا۔ جیسے وہ پھر کبھی اس کی شکل تک دیکھنے کا روادار نہیں ہوگا۔ مگر دونوں ایک دوسرے سے دور بیٹھے ٹپتے رہتے تھے۔ شاموں کو تو شام اکثر تاجی کے معاملے میں بہت جذباتی ہو جاتا تھا۔ میں سوچتا کہ وہ ضرور رات بھر اس کی یاد میں جاگتا رہے گا۔ مگر کم بہت نیند کا کچھ ایسا مانتا تھا کہ پتنگ پر لیٹے ہی سو جاتا۔

میرے فلیٹ میں صرف دو کمرے تھے۔ ایک سونے کا اور دوسرا بیٹھنے کا سونے والا کمرہ میں نے شام اور تاجی کو دے دیا تھا۔ اور بیٹھنے والے کمرے میں گولا بچا کرین سنا تھا۔ تاجی جو کہ موجود نہیں تھی اس لئے اس کا چنگ و بلیغ مہدی علی خان کو مل گیا رات بہت گزر گئی تھی اس لئے ہم سب اپنی اپنی جگہ پر سو گئے۔

صبح سول پونے چھ کے قریب میری جاگ کھلی۔ نیم خوابی کے عالم میں یوں محسوس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی لیٹا ہے۔ پہلے میں نے خیال کیا کہ بیوی ہے مگر وہ تو لاہور بیٹھی تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ شام ہے۔ اب میں نے سوچنا شروع کیا کہ یہ کیسے میرے پاس پہنچ گیا۔ ابھی بے سوچے ہی رات تھا۔ کہ جلتے ہوئے کپڑے کی بوناک میں گھسی۔ پاس ہی صوفہ پڑا تھا۔ عرصہ ہوا اس گراف گورنر سے اس کا ایک حصہ مل گیا تھا، مگر اتنی دیر کے بعد اب بڑا آنے کا کیا مطلب ہے۔ آنکھیں زیادہ کھلیں تو میں نے دھوئیں کی کڑواہٹ محسوس کی اور ہلکے ہلکے دودھیا بادل بھی دیکھے۔ اٹھ کر میں دوسرے کمرے میں گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پتنگ جس پر شام سویا کرتا تھا۔ تنگ رہا ہے اور پاس ہی دوسرے چنگ پر راجہ مہدی علی خان اپنی توہم نکالنے پڑا خواتین لے رہا ہے۔

میں نے قریب جا کر پتنگ کے جلتے ہوئے حقہ کا معائنہ کیا میٹرس میں جی رہا کی کے برابر سوراخ تھا۔ جس میں سے دھواں نکل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آگ بجھانے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ پتنگ پانی میں تر بہت تھا۔

مگر معاملہ چونکہ روٹی اور ناریل کے پیسوں کا تھا اس لئے ہنگامی طور پر یہی طریقہ نہیں
تھی اور بار بار سنگ رہی تھی میں نے راجہ کو جگانے کی کوشش کی مگر وہ کروٹ
بدل کر اور زور سے خطرے لینے لگا ایک دم پلنگ کے سیاہ کمرے سے
ایک لال لال شعلہ باہر پکا۔ میں فوراً غسل خانے کی طرف بھاگا ایک بالٹی
پانی کی اس سوراخ میں ڈالی اور جب پوری طرح اطمینان ہو گیا کہ ہنگامہ گھٹا ہے
تو راجہ کو حضور حضور کہہ دیا۔ اس سے جب آتش زنگ کی وادعات کے تعلق استغناء
کیا تو اس نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں خوب ہنک مڑھ لگا کر واقعات بیان
کئے۔ تمہارا یہ خیام منہمان مبارک ہے۔ رات برائے ہی کے تالاب میں غوطہ
لگاتے ہوئے میں سو گیا دو بجے کے قریب جب عجیب عجیب آوازیں آئیں تو میں جاگ
پڑا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خیام ایک بہت بڑا منہمان ہے۔ اس کی گھٹے دار دم کیساتھ
مٹی کے تیل میں ڈوبی چند یاں بندھی ہیں اور ان میں آگ لگی ہے خیام پلنگ پر
دودھ دے اچھل کود رہا ہے اور اپنی دم سے آگ لگا رہا ہے جب آگ
لگ گئی تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور برائے ہی کے تالاب میں غوطہ لگا
گیا۔ تہہ کے ساتھ لگ کر سونے ہی والا تھا کہ مجھے تمہارا خیال آیا ہے۔ کہ
غریب آدمی کا پلنگ ایسا زہرہ کر رہا ہے جو جاتے۔ چنانچہ آتش خیام غائب
تھا۔ دوسرے کمرے میں تمہیں حالات سے آگاہ کرنے کے لئے گیا تو کیا دیکھتا
ہوں کہ خیام اپنے اصلی روپ میں تمہارے ساتھ چھٹ کر لیا ہے میں نے

تھیں بچکانے کی کوشش کی۔ اپنے پیسپروں پر زور لگا لگا کر تمہیں پکار گھنٹے بجائے۔ اہ تم ہم چلاؤ۔ مگر تم دُشھے۔ آخر میں نے ہولے ہولے تمہارے کان میں کہا۔ خواجہ اختر۔ اسکاچ و سکی کی ایک پوری پٹی آئی ہے۔ تم نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ اور پوچھا کہ کیاں؟ میں نے کہا کہ ہوش میں آؤ۔۔۔۔۔ ساما مکان میں رہا ہے۔۔۔۔۔ آگ لگ گئی ہے آگ! تم نے کہا کہ بکتے ہو؟ میں نے کہا کہ نہیں خواجہ، میں خواجہ حضرت کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ آگ لگی ہے۔ جب تمہیں میرے بیان پر یقین آگیا تو تم آرام سے یہ کہتے ہوئے سو گئے کہ فائر بریگیڈ کو اطلاع دے دو تمہاری طرف سے مایوس ہو کر میں شیام کو حالات کی نزاکت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ جب وہ اس قابل ہوا کہ میری بات اس کے دماغ تک پہنچ سکے تو اس نے مجھ سے کہا کہ تم بھادو نایار۔ کیوں تنگ کرتے ہو؟۔۔۔۔۔ اور سو گیا۔۔۔۔۔ آگ آخر آگ ہے اور اس کا بھانا ہر انسان کا فرض ہے۔ اس لئے میں فوراً اپنی ساری السانیت مجتمع کر کے فائر بریگیڈ میں گیا اور وہ جگ جو میں نے تمہاری سالگرہ پر تمہارے گھر پر دیا تھا بھر کے آگ پر ڈال دیا۔۔۔۔۔ میرا کام چوکنے پورا ہو چکا تھا۔ نتیجہ خدا کے ہاتھ سو فیصد سو گیا۔

شیام جب پوری نیند سوکرا تھا تو میں نے اور راجہ نے اس سے پوچھا کہ
اگ کیسے گئی تھی شیام کو یہ نطفہ معلوم نہیں تھا بہت دیر غور و فکر کے بعد اس نے کہا

میں آتشزدگی کی اس واردات پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا : مگر ب راجہ دوسرے کمرے سے شام کی جلی ہوئی ریشمی قمیض اٹھا کر لایا تو شام نے مجھ سے کہا اب تعیش کرنی ہی پڑے گی :

سب نے مل کر تعیش کی تو معلوم ہوا کہ شام صاحب نے جو بنیان بننا تھا۔ وہ بھی دو ایک جگہ سے جلا بیڑا ہے۔ زیادہ گہرا میوں میں گئے تو دیکھا کہ انکی چھاتی پر دوپے دوپے جھتے دو بڑے آبلے ہیں۔ چٹا چٹا شرک ہو مڑتے اپنے موت والٹن سے کہا : یہ بات تھیں طو پر پائے ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ آگ ضرور لگی تھی اور شام صرف اس غرض سے کہ اس کے ہمسائے راجہ مہدی علی خان کو تکلیف نہ ہو۔ چپ چاپ اُٹھ کر میرے پاس چلا آیا :

جب شام نے تہذیب و تمدن کے مروجہ قوانین کے پیش نظر راجہ سے باقاعدہ شادی کی۔ تو میرا خیال ہے۔ صرف ایک استقامی جذبے کے تحت اس نے اتنی شاندار دعوت کی۔ کہ دیر تک علمی دنیا میں اس کے چرچے رہے اتنی شرب بہانہ گئی کہ غم کے خم خالی ہو گئے۔ مگر افسوس کہ تہذیب و تمدن کی ستر پوش چلی کے داغ وصل نہ سکے۔

شام صرف بول اور حرکت ہی کا رسیا نہیں تھا۔ زندگی میں جتنی نعمتیں موجود ہیں۔ وہ ان سب کا عاشق تھا۔ اچھی کتاب سے بھی وہ اسی طرح پیار کرتا تھا جس طرح ایک اچھی عورت سے کرتا تھا۔ اس کی ماں اس کے بچپن ہی میں مر گئی تھی۔

مگر اس کی اپنی تسکین ماں سے بھی ویسی ہی محبت تھی۔ جو حقیقی ماں سے ہو سکتی ہے اس کے چھوٹے چھوٹے سوتیلے بہن بھائی تھے۔ ان سب کو وہ اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا۔ باب کی موت کے بعد صرف اس کی اکیلی جان تھی جو لختے بڑے کنبے کی دیکھ بھال کرتی تھی۔

ایک طرح سے ملک وہ انتہائی غلامی کے ساتھ دولت اور شہرت حاصل کرنے کے لئے ناتھ پاؤں مارتا رہا۔ اس دوران میں تقدیر نے اُسے کئی غمے دیئے مگر وہ ہنستا رہا۔ جان میں ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ قمری بنیں ہوگی۔ اور وہ کئی برسوں کے بعد آخر اُسی گیا کہ دولت اور شہرت دونوں اس کی جیب میں تھیں۔

موت سے پہلے اُس کی آمدنی ہزاروں روپے ماہوار تھی بڑے کے مصافحات میں ایک خوبصورت بنگلہ اس کی ملکیت تھا اور کبھی وہ دن تھے کہ اس کے پاس سر چھپانے کو جگہ نہیں تھی۔ مگر مفلسی کے ان ایام میں بھی وہی ہنستا ہوا شام تھا دولت و شہرت اُٹی تو اس نے ان کا یوں استقبال نہ کیا جس طرح لوگ ڈپٹی کمشنر کا کرتے ہیں یہ دونوں محترمانہ اس کے پاس آئیں تو اس نے ان کو اپنی ٹوبے کی چارپائی پر بٹھالیا۔ اور چٹا چٹا بڑے داغ دیے۔

میں اور وہ جب ایک چھت کے نیچے رہتے تھے تو دونوں کی حالت پتل تھی۔ نلنڈ سٹری ملک کی سیاست کی طرح ایک بڑے ہی نازک دور

سے گند رہی تھی۔ میں سمیٹی ٹائیکو میں ملازم تھا۔ اس کاوٹن ایک کچر کا کنٹریکٹ تھا۔ دس ہزار روپے میں۔ سرے کی بیکری کے بعد اس کو یہ کام ملا تھا۔ مگر وقت پر پیسے نہیں ملتے تھے۔ بہر حال ہم دونوں کا گند کس نہ کسی طور پر ہو جاتا تھا۔ میاں یہودی بھرتے تو ان میں روپے پیسے کے سلاٹ میں ضرور چھجھرتی۔ مگر شام اور مجھے کبھی محسوس تک نہ ہوا کہ ہم میں سے کون خیر کر رہا ہے اور کتنا کر رہا ہے۔

ایک دن اُسے بڑی کوششوں کے بعد موتی سی رقم ملی اور غالباً پانچ سو پیسے تھے۔ میری جیب خالی تھی۔ ہم ملاوے گھر آ رہے تھے راستے میں شام کا یہ پردہ گرام بن گیا کہ وہ چمچ گیٹ کسی دوست سے ملنے جائے گا۔ میلا ایشیئن آیا۔ تو اس نے جیب سے دس دس روپے کے نوٹوں کی گندی کالی آنکھیں بند کر کے اس کے دو حصے کئے اور مجھ سے کہا: جلدی کرو مٹھو۔۔۔۔۔ ان میں سے ایک لے لو۔

میں نے گندی کا ایک حصہ پکڑ کر جیب میں ڈال لیا اور پیٹ فارم پر آ کر گیا۔ شام نے مجھے "نانا" کہا اور پکڑے نوٹ جیب سے نکال کر لہراتے: تم میں کیا یاد رکھو گی۔ سیدنی کی خاطر میں نے یہ نوٹ بلعہ رکھ لئے تھے۔۔۔۔۔ سب ٹھاکہ۔

شام کو جب وہ اپنے دوست سے مل کر آیا۔ تو کباب ہو رہا تھا شہور فلم اسٹار کے محلے کے اس کو بلایا تھا کہ وہ اس سے ایک پرائیویٹ بات کرنا چاہتی ہے۔ شام نے براڈوی کی بوسن بنس میں سے نکال کر اور گلاس میں ایک چٹا پیگ ڈال کر

مجھ سے کہا: پلاٹھیوٹ بات یہ تھی..... میں نے لاہور میں ایک دفتر کسی سے کہا تھا کہ "کے کے" مجھ پر مرقی ہے۔ خدا کی قسم بہت جرمی طرح مرقی ہے۔ لیکن ان دنوں میرے دل میں کوئی گتباٹش نہیں تھی۔ آج اس نے مجھے اپنے گھر لے کر کہا کہ تم نے بکواس کی تھی۔ میں تم پر کبھی نہیں مری۔ میں نے کہا تو آج مر جاؤ۔ مگر اس نے ہٹ دھرمی سے کام لیا اور مجھے غصے میں آکر اس کے ایک گھونسلہ مارنا پڑا:

میں نے اس سے پوچھا: تم نے ایک عورت پر ہاتھ اٹھایا؟
 خیم نے مجھے اپنا ہاتھ دکھایا جو لاشی ہو رہا تھا کہ تم نبوت آگے سے ہٹ گئی۔
 نشاۃ چوکا اور میرا گھونسلہ دیوار کے ساتھ جا لکرایا:
 یہ کہہ کر وہ خوب ہنسا: سال بے کد رنگ کر رہی ہے:

میں نے اوپر دوپے پیچے کا ذکر کیا ہے..... تباہ دو برس پیچے کی بات ہے۔ میں یہاں لاہور میں فلمی صنعت کی زبوں حالی اور اپنے انسانے..... ٹھنڈا گوشت کے مقدمے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ عدالت ماتحت نے مجھے مجرم قرار دے کر تین مہینے قید بامشقت اور تین سو روپیہ جرمانے کی سزا دی تھی۔ میرا دل اس قدر کٹھا ہو گیا تھا کہ جی چاہتا تھا۔ اپنی تمام تصانیف کو آگ میں جھونک کر کوئی اور کام شروع کر دوں۔ جس کا تخیلیق سے کوئی علاقہ ہو..... چنگی کے ٹککے میں ملازم ہو جاؤں اور رشوت کھا کر اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالا کروں کس پر نکتہ چینی کروں۔ نہ کسی معاملے میں اپنی داسٹے دوں۔

ایک عجیب و غریب دور سے میلادل دو عالم گذر رہا تھا۔ بعض لوگ سمجھتے تھے کہ افسانے لکھ کر ان پر مقدمے چلوانا میرا پیشہ ہے۔ بعض کہتے تھے کہ میں صرف اس لئے لکھتا ہوں کہ سستی شہرت کا دلدلا وہ ہوں اور لوگوں کے منفی جذبات خستہ کر کے اپنا الو سیدھا کرنا ہوں۔ مجھ پر چار مقدمے چل چکے تھے ان چار لوگوں کو سیدھا کرنے میں جو ٹم میری کمریوں پیدا ہوا۔ اس کو کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

مالی حالت کچھ پہلے ہی کمزور تھی اس پاس کے ماحول نے جب ٹھٹھا کر دیا تو آمدنی کے محدود ذرائع اور بھی سکڑ گئے۔ ایک صرف مکتبہ جدید لاہور کے چوبدری برادگان تھے جو مقدمہ بھر میری امداد کر رہے تھے۔ غم غلبا کرنے کے لئے جب میں نے کثرت سے شلوپ نوشی شروع کی تو انہیں نے چاٹا کر اپنا ہاتھ روک لیا۔ مگر وہ اتنے غلصہ تھے کہ مجھے ناامنی کرنا نہیں چاہتے تھے۔

اس زمانے میں میری کسی سے خط و کتابت نہیں تھی۔ دراصل میلادل بالکل لپٹا ہوا چکا تھا۔ اکثر گھر سے باہر رہتا اور اپنے شرابی دوستوں کے گھر بڑا رہتا جن کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی صحبت میں رہ کر میں جسمانی و روحانی خودکشی کی کوشش میں مصروف تھا۔

ایک دن مجھے کسی اور کے گھر کے پتے سے ایک خط ملا۔ تعبیر پاکیزہ کے مالک کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا کہ میں قراٹوں۔ بیٹے سے انہیں میرے بارے میں کوئی ہدایت موصول ہوئی ہے۔ صرف یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ ہدایت

بیچنے والا کون ہے۔ میں تمہیں پکچر ڈالوں سے بلا معلوم ہوا کہ مجھے سے شام کے پے در پے انہیں کئی تارڑے ہیں کبھی دھونڈ کر ۵۰ روپے دے دیے جائیں۔ میں جب دفتر میں پہنچا۔ تو وہ شام کے تازہ تاکید سی مار کا جواب لکھ رہے تھے کہ تلاش بیا ر کے باوجود انہیں غٹو نہیں مل سکا۔

میں نے ۵۰ روپے لے لئے اور میری غمور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے بہت کوشش کی کہ شام کو خط لکھ کر اس کا شکریہ ادا کروں اور پوچھوں کہ اس نے مجھے یہ ۵۰ روپے کیوں بھیجے تھے۔ کیا اس کو علم تھا کہ میری مالی حالت کمزور ہے۔ اس عرصے میں نے کئی خط لکھے اور بھاڑ دیئے۔ ایسا غصہ ہوتا کہ میرے لکھے ہوئے الفاظ شام کے اس جذبے کا منہ چمڑا رہے ہیں۔ جس کے زیر اثر اس نے مجھے یہ روپے روانہ کئے تھے۔

پچھلے سال جب شام اپنے ذاتی فلم کی تلاش کے سلسلے میں امرت سر آیا۔ تو تصویر دیکھ کے نے لاہور میں آگیا۔ یہاں اس نے بہت سے لوگوں سے میرا اتا پتا پوچھا۔ مگر اس دوران میں اتفاق سے مجھے ہی معلوم ہو گیا کہ وہ لاہور میں موجود ہے۔ میں اسی وقت دوڑا اس سینما پہنچا۔ جہاں وہ ایک دعوت کھا کے آ رہا تھا۔

میرے ساتھ رشید عطرے تھا شام کو پہلنے کا پرانا دوست جب موٹر سینما کے صحن میں داخل ہوا تو شام نے مجھے اور رشید کو دیکھ لیا۔ ایک زور کا غرہ

بلند کیا۔ اُس نے ڈرامیور سے موٹر دو کھنے کے لئے بھیت کہا۔ مگر اس کے استقبال کے لئے اس قدر ہجوم تھا کہ ڈرامیور نہڑکا۔ موٹر سے نکل کر پولیس کی مدد سے شیام اور اوم ایک ہی قسم کا لباس اور سر پر سفید پانا مر بیٹ پہنے سینک کے اندر پہلے دروازے سے داخل ہو گئے۔ بڑے دروازے سے ہم اندر پہنچے۔ شیام وہی شیام تھا۔ سکراتا، بنتا اور تہقے لگاتا شیام۔

دوڑ کر ہم دونوں سے پٹ گیا۔ پھر اس قدر شور مچا کہ ہم میں سے کوئی بھی مطلب کی بات نہ کر سکا۔ اوپر سے اتنی باتیں ہوئیں کہ انہار لگ گئے اور ہم ان کے نیچے دب کے رہ گئے۔ سینما سے فارغ ہو کر اُسے ایک فلم ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانا تھا۔ ہمیں میں اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں جربات ہی شروع ہوئی، فوراً کٹ جاتی۔ لوگ دھڑا دھڑا رہے تھے۔ نیچے بازار میں ہجوم شور برپا کر رہا تھا کہ شیام درجن دینے کے لئے باہر سکیٹی میں آئے۔

شیام کی حالت عجیب و غریب تھی۔ اس کو لاہور میں اپنی موجودگی کا شدید احساس تھا۔ اس لاہور میں جس کی متعدد سڑکوں پر اُس کے رومانوں کے چھپتے بکھرا کرتے تھے۔ اس لاہور میں جس کا فاصدا اب امرتسر سے ہزاروں میل ہو گیا تھا اور اس کا راولپنڈی کہاں تھا۔ جہاں اُس نے اپنے لڑکپن کے دن گزارے تھے؟ لاہور، امرت سر اور راولپنڈی، سب اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ مگر وہ دن نہیں تھے۔ وہ راتیں نہیں تھیں جو شیام یہاں چھوڑ کر گیا تھا۔ سیاست

کے گورنر نے انہیں نہ معلوم کہاں دھن کر دیا تھا۔
شیام نے ہر سے کہا۔ میرے ساتھ ساتھ رہو مگر اس کے دل و دماغ کی
مضطرب کیفیت کے احساس نے مجھے سخت ہلاکندہ کر دیا اس سے یہ وعدہ کر کے
کہ رات کو اس سے ٹیلی فون پر ملوں گا۔ چلا گیا۔

شیام سے اتنی دیر کے بعد ملاقات ہوئی تھی مگر خوشی کے سبب اسے ایک عجیب
قسم کی گھٹی گھٹی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ طبیعت میں اس قدر جھنجھلاہٹ تھی کہ
جی چاہتا تھا کسی سے زبردست لڑائی ہو جائے۔ خوب بدکنی ہو اور میں
نھٹک کر سو جاؤں۔ گفتگو کا تجربہ کیا تو کہاں کہاں پہنچ گیا۔ ایک ایسی جگہ جہاں
خیالات کے سارے دھماگے بڑی طرح آپس میں الجھ گئے۔ اس سے طبیعت
اور بھی جھنجھلا گئی اور ٹیلی فون پر جا کر میں نے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھا
شروع کر دیا۔

نوساڑھے نو بجے کے قریب شور مچنے پر معلوم ہوا کہ شیام آ گیا ہے اس کے
کمرے میں ملنے والوں کی ویسی ہی سیڑ تھی۔ تھوڑی سی ویرواں بیٹھا۔ مگر کھل کر کوئی
بات نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم دونوں کے جذبات میں تالے لگا کر
چابیاں کسی نے ایک ہیٹ بڑے گچے میں پرو دی تھیں ہم دونوں اس
گچے میں سے ایک ایک چابی نکال کر یہ تالے کھولنے کی کوشش کرتے اور
ناکام رہتے تھے۔

میں اکتا گیا۔ ڈنر کے بعد شیمام نے بڑی جذباتی قسم کی تقریر کی مگر میں نے اس کا ایک لفظ تک نہ سنا۔ میرا پناہ مانگ رہے اُدھنے سروں میں جانے کیا یک دم تھا۔ شیمام نے اپنی بکواس ختم کی تو لوگوں نے بھرے پیٹ کے ساتھ تالیاں پیشیں۔ میں اُٹھ کر کمرے میں چلا آیا۔ وہاں فاضل بیٹھے تھے۔ ان سے ایک معمولی بات پر چچ ہو گئی۔ شیمام آیا تو اُس نے کہا: یہ سب لوگ ہیرا منڈی جا رہے ہیں چلو آؤ تم بھی چلو۔

میں قریب قریب رو دیا۔ میں نہیں جانا۔ تم جاؤ اور تمہارے یہ لوگ جائیں۔
”تو میرا انتظار کرو..... میں ابھی آیا۔“

یہ کہہ کر شیمام ہیرا منڈی جانے والی پارٹی کے ساتھ چلا گیا۔ میں نے شیمام کو اور فلمی صنعت سے متعلق تمام لوگوں کو موٹی موٹی گالیاں دیں اور فاضل سے کہا: تم میرا خیال ہے۔ آپ تو یہاں انتظار کریں گے اگر تکلیف نہ ہو تو اندازاً دو کمرہ اپنی موٹر میں مجھے میرے گھر تک چھوڑ آئیے۔

رات بھر واٹ چٹانگ خواب دیکھتا رہا۔ شیمام سے کئی مرتبہ ملائی ہوئی صبح دو دو دھالا آیا تو میں کھوکھلے غصے میں اُس سے کہہ رہا تھا: تم بالکل بدل گئے ہو..... اُلو کے پٹھے، کیسنے، ذلیل..... تم ہندو ہو۔

غیند کسلی تو میں نے عروس کیا کہ میرے منہ سے ایک بہت بڑی گالی نکل گئی ہے۔ لیکن جب میں نے خود کو اچھی طرح مشورہ تو یقین ہو گیا کہ وہ میرا نہ

نہیں تھا۔ سیاست کا بھونپا تھا جس سے یہ گالی مکھی تھی اس کے متعلق سرپتے ہوئے میں نے دودھ والے سے دودھ لیا جس میں ایک چوڑھاٹی پانی تھا۔ اس خیال نے مجھے بڑی ڈھارس دی کہ شیام ہندو تھا مگر پانی ملا ہندو نہیں تھا۔

عرصہ ہوا جب تقسیم پر ہندو مسلمانوں میں خوریز جنگ جلدی تھی اور طرفین کے ہزاروں آدمی روزانہ مرتے۔ تھے شیام اور میں راولپنڈی سے بھاگے ہوئے ایک سکھ خاندان کے پاس بیٹھے تھے اس کے افراد اپنے تازہ زخموں کی تودلو سنار ہے تھے جو بہت ہی دردناک تھی۔ شیام متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا وہ پھل جو اس کے دل و دماغ میں بیج رہی تھی اس کو بھی میں بخوبی سمجھتا تھا۔ جب ہم دونوں سے رخصت ہوئے تو میں نے شیام سے کہا: ”میں مسلمان ہوں کیا تمہارا بھی نہیں چاہتا کہ مجھے قتل کر دو۔“

شیام نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: ”اس وقت نہیں..... لیکن اس وقت جبکہ میں مسلمانوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کی داستان سن رہا تھا۔..... میں تمہیں قتل کر سکتا تھا۔“

شیام کے منہ سے یہ سن کر میرے دل کو زبردست دھکا لگا۔ اس وقت شاید میں ہی اُسے قتل کر سکتا۔ مگر بعد میں جب میں نے سوچا اور اس وقت اور اس وقت میں زمین و آسمان کا فرق ہے کیا۔ تو ان تمام فسادات کا نفسیاتی پس منظر میری سمجھ میں آگیا جس میں روزانہ سینکڑوں بے گناہ ہندو اور مسلمان

موت کے گھاٹ اتار دے جا رہے تھے۔

اس وقت نہیں۔۔۔ اس وقت ٹل۔۔۔ کیوں؟ آپ سوچئے تو آپ کو اس کیوں کے پیچھے انسان کی فطرت میں اس سوال کا صحیح جواب مل جائے گا۔

یمن میں بھی فرقہ وارانہ کشیدگی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ بھٹے ٹاکیز کی عنان حکومت جب اشوک اور واپالے سنبھالی تو بڑے بڑے عہدے اتفاق سے مسلمانوں کے نام پر چلے گئے۔ اس سے بھٹے ٹاکیز کے ہندو اشراف میں نفرت اور غصے کی لہر دوڑ گئی۔ واپالے کو گناہم خطا موصول ہونے لگے جس میں اسٹوڈیو کو آگ لگانے اور مرنے مارنے کی دھمکیاں ہوتی تھیں۔ اشوک اور واپالے دونوں کو ان کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ لیکن کچھ ذکی الحس ہونے کے باعث اور کچھ مسلمان ہونے کی وجہ سے میں حالات کی نزاکت کو سمیٹ کر زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اشوک اور واپالے (جنی ٹولیش) کا اظہار کیا۔ اور ان کو رستے دی کر وہ مجھے بے ٹاکیز سے الگ کر دیں۔ کیونکہ ہندو یہ سمجھتے تھے کہ صرف میری وجہ سے مسلمان وٹاں داخل ہو رہے ہیں مگر انہوں نے کہا کہ میرا دماغ خواب ہے۔

دماغ میرا واقعی خواب ہو رہا تھا۔ بیوی بچے پاکستان میں تھے۔ جب وہ ہندوستان کا ایک حصہ تھا تو میں اُسے جانتا تھا اس میں وقتاً فوقتاً ہر مذہب مسلم فسادات ہوتے رہتے تھے۔ میں ان سے بھی واقف تھا۔ مگر اب اس

خطۂ زمین کو نئے نام نے کیا بنا دیا تھا اس کا مجھے علم نہیں تھا اپنی حکومت کیا
 بہرتی ہے؟ اس کی تصویر بھی کوشش کے باوجود میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔
 ۴ اراگست کا دن میرے سامنے بیٹے میں مٹا گیا۔ پاکستان اور عبادت
 دونوں آزاد ملک قرار دیئے گئے تھے۔ لوگ بہت مسرور تھے مگر قتل اور آگ
 کی وارداتیں باقاعدہ جاری تھیں۔ ہندوستان زندہ باد کے ساتھ ساتھ
 پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگتے تھے۔ کانگریس کے تحنگے کے ساتھ اسلامی
 پدھجم بھی بہرتا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور قائد اعظم محمد علی جناح دونوں
 کے نعرے بازاروں اور سڑکوں میں گونجتے تھے۔ سبھی میں نہیں آتا تھا۔ کہ
 ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان اور وہ لہو کس کا ہے جو ہندو اتنی
 بے پردی سے بہایا جا رہا ہے۔ وہ بڑیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی
 جن پر سے مذہب کا گوشت پوست چلیں اور گدھ نونج نونج کر کھا گئے تھے
 اب کہ ہم آزاد ہوئے ہیں، ہمارا غلام کون ہوگا۔۔۔۔۔ جب غلام تھے تو آزادی
 کا تصور کر لیتے تھے اب آزاد ہوئے ہیں تو غلامی کا تصور کیا ہوگا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم آزاد
 بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ ہندو اور مسلمان دھڑا دھڑا مڑ رہے تھے کیسے مڑ رہے تھے، کہیں
 مڑ رہے تھے۔۔۔۔۔ ان سوالوں کے مختلف جواب تھے، عبادت جواب پاکستان
 جواب، انگریزی جواب، ہر سوال کا جواب موجود تھا مگر اس جواب میں
 حقیقت تلاش کرنے کا سوال پیدا ہوتا تو اس کا کوئی جواب دلتا۔ کوئی

کہتا اسے غدر کے کھنڈرات میں تماشائی کرو کوئی کہتا نہیں یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں ملے گا۔ کوئی ادھیچھے ہٹ کر اسے مقلدِ خاندان کی تاریخ میں ٹٹولنے کے لئے کہتا۔ سب پیچھے ہی پیچھے ہٹتے جاتے تھے اور قاتل اور سفاک برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے اور لہو اور لوہے کی ایسی تاریخ لکھ رہے تھے۔ جس کا جواب تاریخِ عالم میں کہیں بھی نہیں ملتا۔

ہندوستان آزاد ہو گیا تھا۔ پاکستان عالم وجود میں آتے ہی آزاد ہو گیا تھا لیکن انسان ان دونوں ملکوں میں غلام تھا۔ تعصب کا غلام..... مذہب جنوں کا غلام۔ حیوانیت و بربریت کا غلام.....

میں نے مجھے تاکید جانا چھوڑ دیا۔ اشوک اور واپا آتے تو میں خرابی طبیعت کا میاں کر دیتا۔ اسی طرح کون دن گزر گئے۔ ششیام مجھے دیکھتا اور سکرا دیتا اس کو میری قلبی کیفیت کا بخوبی علم تھا کچھ دن بہت زیادہ پی کر میں نے یہ فعل بھی چھوڑ دیا تھا۔ سارا دن گرم صوفے پر لیٹا رہتا۔ ایک دن ششیام سٹوڈیو سے آیا۔ تو اس نے مجھے لیٹا دیکھ کر مزاحیہ انداز میں کہا: کیوں خواجہ جنگلی کر رہے ہو؟

مجھے بہت جھنجھلاہٹ ہوتی تھی کہ ششیام میری طرح کیوں نہیں سوچتا اس کے دل و دماغ میں وہ طرفان کیوں برپا نہیں ہیں جن کے ساتھ میں دن رات لڑتا رہتا ہوں۔ وہ اسی طرح مسکراتا، ہنستا اور شور مچاتا رہتا۔ مگر

شاید وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جو نقصان اس وقت گرد و پیش تھی اس میں سوجنا بالکل بے کار ہے۔

میں نے بہت غور فکر کیا۔ مگر کچھ میں نہ آیا۔ آخر ٹنگ آکر میں نے ہٹاؤ پولیس یہاں سے۔۔۔۔۔ شعیام کی ٹائٹ ٹونگ تھی میں نے اپنا اسباب وغیرہ باندھنا شروع کر دیا۔ ساری رات اس میں گزر گئی جس پر ٹی تو شعیام ٹونگ سے ناراض ہو کر آیا۔ اس نے میرا بندھا ہوا اسباب دیکھا تو مجھ سے صرف آنا پر چاہیے؟ میں نے جس صرف اتنا ہی کہا: ہاں۔

اس کے بعد میرے اور اس کے درمیان "ہجرت" کے متعلق کوئی بات نہ ہوئی۔ بقایا سامان رکھوانے میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا اس دوران میں راست کی ٹونگ کے لطیفے بیان کرتا رہا۔ اور خوب ہنستا رہا۔ جب میرے رخصت ہونے کا وقت آیا تو اس نے الماری میں سے برائڈی کی بوتل نکالی۔ دو ہریگ بنائے اور ایک مجھے دے کر کہا: ہپ ٹلا؟

میں نے جواب میں ہپ ٹلا کہا اور اس نے قہقہے لگاتے ہوئے مجھے اپنے چوڑے سینے کے ساتھ سینج لیا: سو رکھیں گے؟ میں نے اپنے آنسو روکے: پاکستان کے؟

شعیام نے پُر غلصہ نعرہ بلند کیا: زندہ باد پاکستان؟
 "زندہ باد بھارت؟" اور میں نیچے چلا گیا۔ جیوں ٹوک والا میرا ہٹا کر رہ گیا۔

بندر گاہ تک شیم میرے ساتھ گیا۔ جہاں چھنے میں کافی دیر تھی۔ وہ ادھر ادھر کے پلٹے سنا کر میرا دل بہلا تا رہا۔ جب وصل ہوا تو اس نے ہپ ملا کہہ کر میرا ہاتھ دبا یا۔ اور گینگ وے سے نیچے اتر گیا۔۔۔۔۔ مڑ کر اُس نے میری طرف نہ دیکھا اور مضبوط قدم اٹھاتا بندر گاہ سے باہر چلا گیا۔

میں نے ہا ہپ پنچ کر اس کو خط لکھا۔ انیس ایک اڑتالیس کو اس کا جواب آیا یہاں تمہیں سب لوگ یاد کرتے ہیں۔ تمہاری اور تمہاری بذر بسنی کی غیر موجودگی محسوس کرتے ہیں۔ جو تم بڑی فراخ دلی سے اُن پر مٹاتے کرتے تھے واپس آجی تم اس بات پر متصر ہے کہ تم کئی کئی گھنٹے اب کی وفد اس کو اطلاع دیتے بغیر پاکستان بھاگ کر گئے عجیب متناقض بات ہے کہ وہ جو بچے ہائیز میں مسلمانوں کے دائرے کی مخالفت میں سب سے آگے حساب سے پہلا آدمی تھا جو پاکستان بھاگ کر چلا گیا خود کو اپنے نظریے کا شہید بنا تے ہوئے۔ یہ واپس آ جانا نظریہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم نے اُس کو ضرور خط لکھا ہو گا۔ اگر نہیں لکھا تو فردا کھو کم از کم شرافت کا یہی تقاضا ہے۔

تمہارا شیم

آج چودہ اگست ہے وہ دن جب پاکستان اور ہندوستان آزاد ہوئے ہیں
 راجہ اور اڈھر دونوں طرف بخوشیاں منائی جا رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ حملے اور
 دفاع کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔ شہر سے جا رہی ہیں..... میں شام کی دھند سے غائب
 ہوتا ہوں۔ پیادے شام..... یہ مجھے تا کیڑ چھوڑ کر چلا گیا تھا کیا پتہ تہ جہاں ہر لال نہرو
 کٹیر نہیں چھوڑ سکتے..... ہے نا ہیپ تلاتا بات؟

پری چہرہ نسیم بانو

میرا فلم دیکھنے کا شوق امرتسری میں ختم ہو چکا تھا اس وقت فلم دیکھے تھے کہ اب ان میں میرے لئے کشش ہی درہی تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب میں ہفتہ وار ”مسعود“ کو ایڈٹ کرنے کے سلسلے میں بمبئی پہنچا تو وہیں کس سینما کا رخ نہ کیا۔ پرچہ فلمی تھا۔ ہر فلم کو پاس میں لے سکتا تھا۔ مگر طبیعت اور راجب نہ تھی مجھے۔ مجھے ٹائیکز کا ایک فلم ”اچھوت کینا“ ان دنوں ایک سینما میں ہفتوں سے چل رہا تھا جب اس کی نمائش کا بائیسواں ہفتہ شروع ہوا۔ تو میں نے سوچا اس فلم میں کیا ہے جو اتنی دیر سے چل رہا ہے۔ دیکھنا چاہیے۔

بمبئی میں یہ میل پہلا فلم تھا میں نے اس میں پہلی مرتبہ اشوک کمار اور دیوکارانی کو دیکھا اشوک کمار کا ایک سنگ خام تھا مگر دیوکارانی کا کام بہت مہیا ہوا تھا فلم

مجموعی طور پر کامیاب تھا ایک خاص بات جو میں نے نوٹ کی یہ تھی کہ اس میں ہوتا نہ
پرن نہیں تھا۔ ایک سیدھی سادی کہانی تھی جو بڑے صاف ستھرے انداز میں پیش
کی گئی تھی میں نے اب گاہے گاہے فلم دیکھنے شروع کر دیئے۔

ان دنوں ایکٹرسوں میں ایک ایکٹرس نسیم بانو خاص شہور تھی۔ اس کی
خوبصورتی کا بہت چرچا تھا اشتہاروں میں اسے پری چہرہ نسیم کہا جاتا تھا۔ میں
نے اپنے ہی اخبار میں اس کے کئی فوٹو دیکھے تھے، خوش شکل تھی۔ جوان تھی۔
خاص طور پر آنکھیں بڑی پرکشش تھیں اور جب آنکھیں پرکشش ہیں تو سارا
چہرہ پرکشش بن جاتا ہے۔

نسیم کے غالباً دو فلم تیار ہو چکے تھے جو سہراب مودی نے بنائے تھے اور
عوام میں کافی مقبول ہوئے تھے یہ فلم میں نہیں دیکھ سکا مگر نہیں کیوں؟
عمرہ گزرا گیا اب مرزا مودی فن کی طرف سے اس کے شاندار تاریخی فلم "پکارہ"
کا اشتہار بڑے زور و جوش پر ہو رہا تھا۔ پری چہرہ نسیم اس میں فوڈ جہاں کے وہاب
میں پیش کی جا رہی تھی۔ اور سہراب مودی خود اس میں ایک بڑا اہم کردار ادا
کر رہے تھے۔

فلم کی تیاری میں کافی وقت صرف ہوا۔ اس دوران میں اخبارات اور
رسالوں میں "اسٹیل" شائع ہوتے بڑے شاندار تھے۔ نسیم، فوڈ جہاں کے لباس
فائمرہ میں بڑی چڑو تار دکھائی دیتی تھی۔

”پکار“ کی نمائندگی غلطی پر میں دعو تھا۔ جیہ گمیر کے عدل و انصاف کا ایک
 من گھڑت قصہ تھا۔ جو بڑے جذباتی اور تھیشری انداز میں پیش کیا گیا تھا فلم میں
 دو باتوں پر بہت زور تھا۔ مکالموں پر اور مہوسات پر۔ مکالمے اگر غیر فطری اور
 تھیشری تھے لیکن بہت زوردار اور پُر شکوہ تھے جو سننے والوں پر اثر انداز
 ہوتے تھے چونکہ ایسا فلم اس سے پہلے نہیں بنا تھا اس لئے سہرا ب مودی کا
 ”پکار“ سونے کی کان ثابت ہونے کے علاوہ ہندوستانی صنعت فلم سازی
 میں ایک انقلاب پیدا کرنے کا موجب ہوا۔

نسیم کی اداکاری کمزور تھی۔ لیکن اس کمزوری کو اس کے خدا داد حسن اور
 نور جہاں کے لباس نے جو اس پر خوب سمجنا تھا اپنے اندر چھپا لیا تھا مجھے یاد
 نہیں رہا۔ خیال ہے کہ ”پکار“ کے بعد نسیم غالباً دو تین فلموں میں پیش ہوئی مگر
 یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے ”پکار“ کا مقابلہ نہ کر سکے۔

اس دوران میں نسیم کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیل رہی تھیں فلمی دنیا
 میں اسکی فنڈل عام ہوتے ہیں۔ کبھی یہ سننے میں آتا تھا کہ سہرا ب مودی نسیم بانو سے
 شادی کرنے والا ہے۔ کبھی اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی تھی۔ کہ نظام حیدر آباد
 کے صاحبزادے معلّم جاہ صاحب نسیم بانو پر دوسرے ڈال رہے ہیں اور مغربی
 اسے لے آئیں گے۔ یہ خبر درست تھی۔ کیونکہ شہزادے کا قیام ان دنوں اکشر
 بمبئی میں ہوتا تھا اور وہ کئی بار نسیم کے مکان واقع میرن ڈرائیو دیکھے گئے تھے۔

شہزادے نے لاکھوں روپے خرچ کئے بعد میں جن کا حساب دینے کے سلسلے میں انہیں بڑی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ آپ روپے کے ذریعے لیسیم کی والدہ شمشاد عرف چھیاں کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گئے، چنانچہ پوری چہرہ لیسیم کا انتظام خرید کر آپ اسے اُس کی والدہ سمیت حیدرآباد لے گئے:

تھوڑے ہی عرصے کے بعد جہاں دیدہ چھیاں نے یہ محسوس کیا کہ حیدرآباد ایک قید خانہ ہے۔ جس میں اس کی بچی کا دم گھٹ رہا ہے آرام و آسائش کے تمام سامان موجود تھے مگر فضا میں گھٹن سی تھی۔ پھر کیا پتا تھا کہ شہزادے کی لالہ ابالی طبیعت میں ایسا ایک انقلاب آجاتا اور لیسیم بانوا دھرم کی رہتی شاد دھرم کی چنانچہ چھیاں نے حکمت عمل سے کام لیا۔ حیدرآباد سے نکلتا بہت مشکل تھا مگر وہ اپنی ہی لیسیم کے ساتھ واپس نہیں آنے میں کامیاب ہو گئی۔

اس کی آمد پر کافی شور مچا۔ جڑی پوسٹر جاری ہوئی۔ دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک شہزادہ منظم جاہ کے کارسلیوں کی۔ دوسری لیسیم بانو کے ہمدردوں کی بہت دیر تک کیپٹر اچال گئی اس کے بعد یہ معاملہ خاموش ہو گیا۔

میں اب نئی دنیا میں داخل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر منشی کی حیثیت سے اسپرین فلم کمپنی میں کام کیا۔ لیٹن ڈائریکٹروں کے حکم کے مطابق اتنی سیدھی زبان میں فلموں کے مکالمے گفت و نا۔ ساتھ روپے ماہوار پر ترقی کی توہمند داستان سننے تو

میری چہرہ نسیم بانو

میں سیٹھ نانوجائی ڈیساٹی کے یہاں سو روپے ماہوار پر ملازم ہو گیا۔ یہاں میں نے اپنی پہلی نظم کہانی "نثر" کے عنوان سے لکھی اس کا حرف "اپنی نگریا" تھا کہنا یہ ہے کہ نظم طے اب میرے نام سے واقف ہو چکے تھے۔

اس دوران میں ایک اعلان نظروں سے گزرا کہ کوئی صاحب احسان ہیں انہوں نے ایک نظم کہانی تاج کچھڑ کے نام سے قلم کی ہے پہلا نظم "اجالا" ہو گا جس کی بیروٹن پری چہرہ نسیم بانو ہے۔

اس نظم کے بنانے والوں میں دو مشہور ہستیاں ہیں۔ "پکار" کا مصنف کمال امروہی اور پکار ہی کا پہلی بیٹی مینیر ایم اے مفتی۔ نظم کی تیاری کے دوران میں کئی جگہ کھڑے ہوئے۔ امیر حیدر کمال امروہی اور ایم اے مفتی کی کئی بار آپس میں جھج ہوئی۔ یہ دونوں حضرات غالباً عدالت تک بھی پہنچے مگر "اجالا" انجام کار مکمل ہو ہی گیا۔

کہانی معمولی تھی موسیقی کمزور تھی۔ ڈائریکشن میں کوئی دم نہیں تھا۔ چنانچہ یہ فلم کامیاب نہ ہو اور احسان صاحب کو کافی خسارہ اٹھانا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا کاروبار بند کرنا پڑا۔

مگر اس کاروبار میں وہ اپنا دل نسیم بانو کو دے بیٹھے احسان صاحب کے لئے نسیم جینی نہیں تھی۔ ان کے والد خان بہادر محمد سلیمان چیف انجینئر نسیم کی والدہ عرف چھیاں کے پرستار تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک لحاظ سے وہ ان کی دوسری بیوی

تھی۔ احسان صاحب کو یقیناً نسیم سے ملنے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ غلام کی تیاری کے دوران میں تو خیر وہ نسیم کے ہاتھ قریب رہے تھے لیکن لوگوں کا بیان ہے کہ احسان اپنی چھینچپو اور شرریلی طبیعت کے باعث نسیم سے پوری طرح کھل نہیں سکے تھے۔ سیت پر آتے تو غامرض ایک کونے میں بیٹھتے رہتے۔ نسیم سے بہت کم بات کرتے۔ کچھ بھی ہوا آپ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیوں کہ ایک دن بہنے سنا کہ پری چہرہ نسیم نے مسٹر احسان سے رانی میں شادی کر لی ہے اور یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اب غلوں میں کام نہیں کرے گی۔

نسیم بانو کے پرستاروں کے لئے یہ خبر بڑی افسوس ناک تھی۔ اس کے حس کا جلوہ کیونکہ صرف ایک آدمی کے لئے وقف ہو گیا تھا۔

احسان اور نسیم کا عشق تمام مراحل طے کر کے شادی کی منزل تک کیسے پہنچا مجھے اس کا علم نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں اشوک گدار کا بیان بہت دلچسپ ہے اشوک ایک صاحب کمپن صمد لیتی کا دوست تھا۔ یہ مسٹر احسان کے قریبی عزیز تھے۔ اجالا میں انہوں نے کافی روپیہ لگایا تھا۔

اشوک قریب قریب ہر روز کمپن صمد لیتی کے یہاں جایا کرتا تھا کچھ دنوں سے وہ عموں کو داتا تھا کہ کمپن صاحب کے گھر کی فضا بدلی ہوئی ہے شروع شروع میں تو وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔ لیکن ایک اس کی ناک نے عموں کو کیا کہ ہوا میں بہت ہی عمدہ سینٹ کی خوشبو بس ہوئی ہے۔ اشوک نے اندازہ مذاق کمپن صمد لیتی سے

اس خوشبو کے ماتخذ کے بارے میں پوچھا۔ لیکن وہ گول کر گئے۔

ایک دن جب اشوک، صدیقی صاحب کے گھر گیا۔ تو وہ موجود نہیں تھے لیکن وہ خوشبو موجود تھی۔ جڑی لطیف لیکن جڑی شریہ۔ اشوک نے سونگھ سونگھ کر تاک کے قدیلمے سے معلوم کر لیا کہ یہ اوپر کی منزل سے آرہی ہے۔ سیڑھیاں ملے کہے وہ اوپر چنپا بکری کے کواڑ تھوڑے سے کھلے تھے۔ اشوک نے جھانک کر دیکھا نسیم بانو پلنگ پر لیٹ تھی اور اس کے پیلو میں ایک صاحب بیٹھے اس سے ہلے ہلے باتیں کر رہے تھے۔ اشوک نے پہچان لیا۔ مہر احسان تھے جن سے اس کا تعارف ہو چکا تھا۔

اشوک نے جب کیپٹن صدیقی سے اس معاملے کے متعلق بات کی تو وہ مسکرائے یہ سلسلہ دیر سے جاری ہے؟

اشوک کے اس بیان سے نسیم اور احسان کے اس معاشرے پر جو روشنی پڑتی ہے اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ عشق و محبت میں جہر کہہ جاتا ہے ہر اس گناہ اتنا علم ہے کہ احسان کی والدہ اور بہنیں سنت خلاف تھیں کہ وہ نسیم سے شادی کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں بہت جھگڑے ہوئے۔ مگر خان بہادر محمد سلیمان صاحب کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس لئے یہ شادی عمل میں آگئی اور نسیم غلامی دنیا سے دودھ دلی میں رہنے لگی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن کے دن گزارے تھے۔

شادی پر اور شادی کے بعد کچھ دیر اخباروں میں ہنگامہ نہ مگرا مگر پھر نسیم غلامی

حقوق سے اوجھل ہو گئی۔

اس دوران میں غلطی دینا یہی کئی انقلاب آئے کئی نظم کپتیاں بنیں۔ کئی ٹوٹیں۔ کئی ٹکڑے ابھرے۔ کئی ڈوبے۔ ہانسوراٹے کی افسوسناک موت کے بعد بیٹی ٹائیز میں طوائف الملوک کی پھیل ہوئی تھی دیوکارانی (منسز ہانسوراٹے) اور داسے بہادر چرنی وال (جنرل منسجر) میں بات بات پر چلتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ داسے بہادر اپنے گروپ کے ساتھ میٹ ٹائیز سے علیحدہ ہو گئے۔ اس گروپ میں پروڈیوسر ایس کرجی افسانہ نگار اور ڈائریکٹر گیان کرجی، مشہور سپردا شوک کمار، کوی پروڈیوسر ساؤنڈ ریکارڈسٹ ایس واجا، کامیڈین وی یارچ ڈیسان، کارلنگکار شاہ، بلین اور سنو سی شان تھے۔ بیٹی ٹائیز سے ملتے ہی اس گروپ نے ایک نئی فلم کینی۔ کلتان کے نام سے ٹائمز کی۔ پروڈکشن کنٹرولر ایس کرجی مقبول ہوئے۔ جو سلسلہ جو بلی فلم بن کر میہمت شہرت حاصل کر چکے تھے۔ کہانی و ڈانی لکھی گئی۔ اسٹوڈیو نئے ساز و سامان سے آراستہ ہو گیا۔ سب ٹھیک تھا۔ شاک تھا مگر پروڈیوسر ایس کرجی سخت پریشان تھے۔ بچے ٹائیز سے علیحدہ ہو کر وہ دیوکارانی کو خاویخ کے لئے کوئی سنی پھیلائے وال بات پیدا کرنا چاہتے تھے اور یہ بات ہیروئن کے انتخاب کے متعلق تھی۔۔

میٹھے میٹھے ایک دن ایس کرجی کو یہ سوچی کہ نسیم بانو کو واپس کھینچ کر لایا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اُسے اپنے اوپر پورا اعتماد تھا۔ پے درپے کئی کامزائیوں کے بعد اس کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ جس کام میں تھا تو ڈالے گا پورا کرے گا چنانچہ

قہراً ہی نسیم بانو تک پہنچنے کے واسطے سرٹ لے گئے۔

اشوک کی وجہ سے ایس کرچی کے بھی کپٹن صدیقی سے برصے اچھے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ لال بہادر چوہانی لال کے احسان کے والد خان بہادر محمد سیٹھان سے بہت بے تحلف ملازم تھے۔ چنانچہ دل میں نسیم تک رسائی حاصل کرنے میں ایس کرچی کو کوئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن سب سے بڑا امر حد پہلے احسان کو اور پھر نسیم کو رضا مند کرنا پڑا تھا۔

کرچی کی خود اعتمادی کام آئی۔ احسان نے پہلے تو صاف جواب دے دیا لیکن آخر کار رضا مند ہو گیا۔ فتح مند ہو کر جب وہ واپس بیٹی آیا تو اخباروں میں یہ خبر برصے ثقات سے شائع کرائی۔ "کوئٹہ کے پہلے قلم" میں اس سے "نوجوان" کی بیروٹن پر ہی چہرہ نسیم بانو ہوئی۔ تلمی حلقوں میں سنسنی پھیل گئی کیونکہ نسیم ظہیر نیا سے ہمیشہ کے لئے علیحدگی اختیار کر چکی تھی۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں ڈیڑھ برس ال انڈیا ریڈیو ڈلی کے ساتھ منسلک رہ کر واپس بیٹی آیا تھا۔ اور سیتھ شوکت حسین رضوی کے لئے ایک کہان لکھنے میں مصروف تھا۔

یہ کہانی لکھی گئی۔ چند اور کہانیاں بھی لکھی گئیں اس دوران میں گھر سے بھینا بہت کم جوتا تھا۔ میری بیوی میرے اس گھر میں پنے سے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ویل اپنی صحت خواب کرنا ہوں۔

شاہد لطیف سے میرے مراسم علی گڑھ یونیورسٹی سے چلے آئے تھے غلستان کے کاموں سے جب میں فراغت ملتی میرے یہاں ضرورتاً ایک دن آیا تو میری سیری نے اس سے کہا: شاہد بھائی ان سے کہیے کہیں ملازمت کریں گھر بیٹھ کر ان کا کام بھی اچھا نہیں لگتا۔ صحت خراب کر رہے ہیں کہیں ملازمت کریں تو گھر سے باہر تو قدم رکھا کریں گے۔

چند روز کے بعد ملاٹ سے شاہد لطیف کا فون آیا کہ پروڈیو سر ایس کرجی مجھ سے انسٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ سنسریوڈیو پارٹنٹ کے لئے انہیں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔

ملازمت کی مجھے کوئی خواہش نہیں تھی صرف انسٹرویو دیکھنے کے لئے میں غلستان چلا یا گیا۔ نصاب پڑھی اچھی تھی جیسے کسی یونیورسٹی کی اس نے مجھے بہت متاثر کیا مگر جی سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے بے حد پسند آئے چنانچہ وہیں کنسٹرکٹ پر دستخط کر دیئے۔ تنخواہ بہت تھوڑی تھی۔ کل تین سو روپے ماہوار اور نامہ صلہ بھی کافی تھا۔ ایک بڑک ٹرین سے ایک گھنٹہ کے قریب جھٹتا تھا۔ مگر رے گاؤں پہنچنے میں لیکن میں نے سوچا شیک ہے۔ تنخواہ تھوڑی ہے لیکن میں ادھر ادھر سے کالیا کروں گا۔

شروع شروع میں تو غلستان میں میری حالت اجنبی کی سی تھی لیکن بہت جلد میں اسٹاف کے ساتھ گھل مل گیا۔ ایس کرجی سے تو میرے تعلقات دوستانہ حد تک پہنچ چکے تھے۔

ہمدردی پر

اس دوران میں نسیم بانو کی صرف چند جھلکیاں دیکھنے کا اتفاق ہوا چونکہ نسیم پر لکھا جا رہا تھا اس لئے وہ چند لمحات کے لئے حوض میں آتی اور واپس چلی جاتی تھی۔

ایس کرچی بڑا مشکل پسند واقع ہوا ہے مہینوں کا بنی کی لوک پک پک درست کرنے میں لگ گئے خدا خدا کر کے نسیم کی شہرت لگ شروع ہوئی مگر یہ وہ سین تھے جن میں نسیم بانو نہیں تھی۔ بالآخر اس سے ایک روز ملاقات ہوئی۔ اسٹوڈنٹ کے باہر فرلڈنگ کرسی پر بیٹھی تھی ناگہم پر ناگہم رکھے قہر میں سے چائے پی رہی تھی اشوک نے میلا اس سے تعارف کرایا۔ خندہ پشانی سے پیش آئی اور بڑی باریک آواز میں کہا: میں نے ان کے معنائیں اور اس نے پڑھے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی گفت گو ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ختم ہوئی چونکہ وہ میک اپ میں تھی اس لئے میں اس کے اصلی حسن کا اندازہ نہ کر سکا۔ ایک بات جو میں نے خاص طور پر نوٹ کی وہ یہ تھی کہ بولنے وقت اسے کوشش ہی کرنی پڑی تھی۔ جوں کیسے کہ جب وہ بولتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ تھوڑی سی مشقت کر رہی ہے۔

”پیارے“ کی نسیم میں اور ”چل چل“ سے نور جہاں“ کی نسیم میں زمین و آسمان کا فرق تھا اور صرف وہ ملکہ نور جہاں کے لباس فاخرہ میں ملبوس اور ادھر تجارت سیوا دل کی ایک رضا کار کی وردی میں نسیم بانو کو تین مرتبہ میک اپ کے بغیر دیکھا تو میں نے سوچا کہ ان کی معنی کے لئے اس سے بہتر صورت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ جگہ وہ کون جہاں وہ جیتی پاکھڑی ہوتی ایک دم سوج جاتا۔

لباس کے انتخاب میں وہ بہت محتاط ہے اور رنگ پنہنے کے معاملے میں جو سلیقہ اور قریظ میں نے اس کے یہاں دیکھا ہے اور کہیں نہیں دیکھا۔ زرد و رنگ بڑا خطرناک ہے کیونکہ زرد و رنگ کے کپڑے آدمی کو اکثر زرد و تر یعنی بنادیتے ہیں مگر نسیم کچھ اس بے پرواہی سے یہ رنگ استعمال کرتی تھی کہ مجھے حیرت ہوتی تھی۔

نسیم کا محبوب لباس ساڑھی ہے۔ غرارہ بھی پہنتی ہے مگر گاہے گاہے شلوار قمیض پہنتی ہے۔ مگر صرف گھر میں وہ کپڑے پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی یہی وجہ ہے کہ اس کے پاس جھول کے پرانے کپڑے جی اچھی حالت میں موجود ہیں۔

نسیم کو میں نے بہت محنتی پایا ڈری نازک سی عادت ہے مگر سیٹ پر برا بھڑاتی رہتی ہے مگر جس کو معطل کرنا آسان کام نہیں کئی دیر سلیں کرنا پڑتی تھیں گھنٹوں جلسہ دینے والی دوستی کے سامنے اٹھ بیٹھ کرنا پڑتی تھی لیکن میں نے دیکھا کہ نسیم اکتاؤ نہیں ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کو اداکاری کا بہت شوق ہے ہم شوٹنگ کے ساتھ ساتھ دشمن دیکھتے تھے۔ نسیم بالوں کا کام لبس گوارا تھا اس میں چمک نہیں تھی وہ سنجیدہ ادائیں دیتا کر سکتی ہے اپنے مغلیہ خدو خال کی حسین جھلکیاں پیش کر سکتی ہے۔ لیکن ناقدا نہ نگاہوں کے لئے اداکاری کا جو ہر شے نہیں کر سکتی۔ لیکن پھر بھی "ہل ہل سے کو جوان" میں اس کا ایکٹنگ پہلے فلموں کے مقابلے میں کچھ بہتر ہی تھا۔

مکرمی اس میں کوٹھنگی اور درشتگی پیدا کرنا چاہتا ہے مگر یہ کیسے پیدا کرتی
نسیم بے حد سرد مزاج ہے۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ "ہل چل دے نوجوان" میں نسیم کا
کوٹھنگہ بڑھ کر رہ گیا۔

علم دینے والا۔ رات کو تاج میں ایک شاندار پارٹی دی گئی، علم میں نسیم جیسی
بھی تھی شیک ہے مگر تاج میں وہ سب سے الگ نظر آتی تھی چوتھا با عظمت
منلیہ شہزاد یوں کی سی شان اور انفرادیت لے۔

"ہل چل دے نوجوان" کی تیاری میں دو برس۔ دو اکت دینے والے برس
لگ گئے تھے جب علم تو تعات کے مطابق کامیاب اور مقبول نہ ہوا تو ہم سب
پر افسردگی طاری ہو گئی۔ مکرمی بہت بیدل ہوا۔ مگر کنٹرول کے مطابق چونکہ
اسے تاج محل پیمبر کے ایک علم کی نگاہ کرنا تھی اس لئے کمر بستہ ہو کر کام
شروع کرنا پڑا۔

علم "ہل چل دے نوجوان" کی تیاری کے دوران میں احسان سے مکرمی
کے تعلقات بہت جڑ گئے تھے۔ جب تاج محل پیمبر کے علم کا سوال آیا تو احسان نے
اس کی پروڈکشن کا سارا بوجھ مکرمی کے کندھوں پر ڈال دیا۔ مکرمی نے مجھے مشورہ
کیا۔ آخر یہ "ہل چل دے نوجوان" کے عنوان سے میں ایک ایسی کہانی لکھوں جس میں نسیم کی
خوبصورتی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جاسکے۔

میں نے ایک خاکہ تیار کیا۔ مکرمی نے اس میں کچھ تبدیلیاں کرائیں جب علم تیار

ہوا۔ تو میں نے بڑی حیرت سے یہ محسوس کیا کہ جو کہانی میں نے سوچی تھی وہ تو رومی کا خندوں پر ہے اور جو پردے پر ہیں پھر وہی ہے وہ محض اس کا ہلکا سا سایہ ہے۔ کہانی کا تہہ چھوڑیے مجھے کہنا یہ ہے کہ ”بیگم“ کھینے کے دوران میں مجھے نسیم بانوں کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ میں اور مگر ہی دوسرے کا کھانا ان کے گھر پر کھاتے تھے۔ اور ہر روز رات کو دینک کہانی میں تو نسیم کو منیخ کرنے میں مصروف رہتے تھے۔

میرا خیال تھا نسیم بڑے عالیشان مکان میں رہتی ہے لیکن جب گھوڑ بند روڑ پر اس کے بنگلے میں داخل ہوا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ بنگلہ نہایت شکستہ حالت میں تھا جو معمولی قسم کا فریخیر جو غالباً کراٹے پر لایا گیا تھا کھسا ہوا نکالین، دیوار میں اور فرش سیل زدہ۔

اس پس منظر کے ساتھ میں نے پری چہرہ نسیم بانو کو دیکھا بنگلے کے برآمدے میں وہ گوالے سے دودھ کے کوپلوں کے متعلق بات چیت کر رہی تھی۔ اس کی دلی دلی آواز، جیسا معلوم ہوتا تھا کہ شش کے ساتھ حلق سے نکالی جا رہی ہے گوالے سے قبول رہی تھی کہ اس نے آدھ سیر دودھ کا سیر پھر کیا ہے آدھ سیر دودھ اور پری چہرہ نسیم بانو جس کے لئے کئی فرناؤ دودھ کی نہریں نکالتے کے لئے تیار تھے..... میں چکرائی۔

آہستہ آہستہ مجھے معلوم ہوا کہ ”پکار“ کی نود جہاں بڑی گھر پر تو قسم کی عورت ہے

اور اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک غایت درجہ خوبصورت میں ہوتی ہیں۔ اُس کی یکپڑہ گیٹم کی پردہ کشن شروع ہوتی ہے۔ تو لباسات کا سدا کام اُس کے سنبھال لیا۔ اٹھانہ کھاکہ دس بارہ ہزار روپے اس حد پر اٹھ جاتیں گے مگر نسیم نے دزدی گھر میں بٹھا کاپنی پانی ساڑھیوں، قمیضوں اور غلاروں سے تمام لباس تیار کروائے۔

نسیم کے پاس بے شمار کپڑے ہیں۔ میں اس سے قبل کہہ چکا ہوں کہ وہ لباس پہنتی ہے استعمال نہیں کرتی۔ اُس پر ہر لباس سبنا ہے جسی وجہ ہے کہ گیٹم میں ایس کمری نے اس کو کشمیر کے دیہات کی اٹھارویں کے روپ میں پیش کیا اس کو قلو قلو پڑھ بنایا۔ ہیرا کلبا کرتے اور لاجا چہنا یا موڈن لباس میں بھی پیش کیا۔

یقین واثق تھا کہ صرف لباسات کے تنوع ہی کے باعث گیٹم بے حد مقبول ثابت ہوگی۔ مگر غوس کو نکلتی فائر کشن اور کمزور میزک کی وجہ سے اُس نے درمیانے درجے کے فلموں کی بزنس کی۔

ہم سب نے اس فلم کی تیاری پر بہت محنت کی تھی۔ خاص طور پر کمری نے ہم سب کو ایک (یعنی ادھارت دانت کے تین تین جے تک) بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔ اور کمری کہانی کی لوک پلک دوست کرتے دیتے اور نسیم اور احسان جاگنے کی کوشش کرتے رہتے۔ جب تک احسان صاحب کی ٹانگ بلیج رہتی وہ میری اور کمری کی باتیں سنتے رہتے لیکن جو نہیں ان کی ٹانگ بن بند ہو جاتی ہم سب سمجھ جاتے

کردہ گہری نیند سو گئے ہیں۔

نسیم کو اس سے بڑی جینجیلاہٹ ہوتی تھی کہ اس کا شوہر نیند کا ایسا مانتا ہے کہ کہانی کے نہایت ہی دشوار گزار موڑ پر لمبی تان کر سو جاتا تھا میں اور مگرچی احسان کو چھیڑتے تھے تو نسیم بہت تجزئہ ریز ہوتی تھی وہ ان کو اپنی طرف سے جھنجھوڑ کر جگاتی تھی گویا معلوم ہوتا کہ لوری دے کر انہیں اور گہری نیند سلا رہی ہے۔

جب نسیم کی آنکھیں بھی بند نہ لگتیں تو مگرچی رخصت چاہتے اور چلے جاتے۔

میرا مگر گھوڑ بندہ سے بہت دور تھا۔ برقی ترین قریب قریب پہن گئے میں مجھے وہاں پہنچاتی تھی۔ ہر روز نصف شب کے بعد مگر پہنچتا ایک اچھا خاصا خلیہ تھا میں نے جب اس کا ذکر مگرچی سے کیا تو یہ طے ہوا کہ میں کچھ عرصے کے لئے نسیم ہی کے یہاں آٹھ آؤں۔

احسان بے حد جھنجھو ہیں۔ کوئی بات کہنا ہو تو برسوں لگا دیتے ہیں۔ انہیں میری آسائش کا خیال تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جس چیز کی مجھے ضرورت ہو میں ان سے بلا تکلف کہہ دیا کروں۔ مگر تکلف کی یہ حد تھی کہ وہ صرف بدعازبان پر لاپس نہیں پاتے تھے۔ آفاک روناؤں کے اصول پر نسیم نے مجھ سے کہا: "تمہاؤں جس چیز کی ضرورت ہو وہ دے دیا کرو۔"

نسیم سنٹ کا اس پنجابی بولتی تھی "پل چل دے تو جوان" کے دامن میں جب میں نے دقیق غزلوی سے جو اس پتھر میں ایک اہم دھل ادا کر رہا تھا۔ ذکر کیا کہ نسیم

پنیابی بولتی ہے کہ اُس نے اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے کہا کہ تم مجھے ہر میں نے
اُس کو یقین دلانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

ایک روز شوٹنگ کے دوران میں جب نسیم اور رفیق دونوں موجود تھے۔ اور
اشوک انگریزی کے زبان مرثیہ فقرے نسیم سے کہہوانے کی کوشش کر رہا تھا تو
میں نے رفیق سے پوچھا: لالہ! ادھر دیکھا کسے کہتے ہیں؟
رفیق نے جواب دیا: یہ کسی زبان کا لفظ ہے۔

میں نے کہا: پنیابی زبان کا؟ بتاؤ اس کا کیا مطلب ہے؟
رفیق نے اپنے مخصوص انداز میں کہا: "میں تو معلوم نہیں۔" ادا دھڑ دھڑ
دے پڑا۔

نسیم نے گردن میں جاکو سا خم دے کر رفیق کی طرف دیکھا اور مسکرا کر پنیابی
میں اس سے پوچھا: "سچی۔ سہانوں معلوم نہیں۔"

رفیق نے جب نسیم کے منہ سے پنیابی سنی۔ تو بقول شے وہ اپنی پشت پر جھول
گیا۔ گفت بھرے لہجہ میں اُس نے نسیم سے اردو میں کہا: "آپ پنیابی
جانتی ہیں؟"

نسیم نے اسی طرح مسکرا کر کہا: "جی ہاں!"

میں نسیم سے مخاطب ہوا۔ تو آپ بتائیے ادھر دھڑ دھڑ کا مطلب کیا ہے؟
نسیم نے کہہ دیا: سوچا: وہ وہ لباس جو گھر میں استعمال کیا جاتا ہے۔

رفیق غزنوی اپنی پشت اور زیادہ سبھل گیا۔

نسیم کی نانی اسرت سر کی کشیدہ تھی۔ چنبالی زبان اس نے غالباً اسی سے سیکھی تھی اور وہ اس لئے بہت شستہ و رفتہ بولتی ہے کہ دلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہی۔ انگریزی جانتی ہے اس لئے کہ کنونٹ میں پڑھتی تھی۔ موسیقی سے شغف رکھتی ہے اس کی تلمیم ماں ہی سے پائی۔ مگر ماں جیسا سُر لاٹھ نہ پایا۔ فلموں میں اپنے گانے خود ہی گاتی ہے مگر ان میں دس نہیں بڑتا۔ لیکن اب میں نے سنا ہے کہ اس نے خود گانا ترک کر دیا ہے۔

نسیم کے ارد گرد جو ایک خیر و کن مالہ تھا آہستہ آہستہ غائب ہو گیا مجھے ان کے بچنے کے غصے خائے میں پہلی بار نہانے کا اتفاق ہوا۔ تو مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جدید ساز و سامان سے ہمارے ہر گاہ۔ متعدد قسم کے نہانے والے نمک ہوں گے۔ نایاب صابن ہر گاہ۔ ٹب ہر گاہ۔ وہ تمام اوت چٹانک چیزیں ہوں گی جو حسین عورتیں اور ایکٹریں اپنے ٹھن کی افزائش کے لئے استعمال کرتی ہیں مگر وہاں صرف ایک جست کی بالٹی تھی۔ ایو مینیم کا ایک ڈونگا اور طلاؤ کے کنڈیز کا بھاری پانی کہ صابن گھستے رہا اور بھاگ پیدا نہ ہوا۔

لیکن نسیم کو جب بھی دیکھو تو تازہ اور نکھری نکھری نظرات تھی بیک اپ کئی نئی شربت۔۔۔ شہنشاہی رنگوں سے اسے نفرت ہے۔ وہ حرف وہی رنگ استعمال کرتی ہے۔ جو اس کے مزاج کے موافق ہوں یعنی مقلد۔

پہلی چہرہ نسیم باکو

عطریات سے اُس کو عشق ہے۔ چنانچہ انواع و اقسام کی خوشبوئیات اس کے پاس موجود رہتی ہیں۔ بعض سنیت تو بہت ہی قیمتی اور نایاب ہیں۔ لیڈہ ایک سے ایک اعلیٰ اور بیش قیمت ہے مگر ان میں لدی پسندی نہیں ہوتی۔ کبھی سیرے کا ایک کٹن سپن یا کبھی جڑاؤ چوڑیاں اور کبھی موتیوں کا ہار۔

ان کا دسترخوان میں تے کبھی پڑتکھ نہیں دیکھا۔ احسان کو دھمے کی شکایت رہتی ہے اور نسیم کو دکام کی۔ دونوں پر بیزاری کو خشش کیا کرتے تھے۔ نسیم میری چہری پر میں نے اثراتی تھی۔ اور احسان نسیم کی پیٹ پر ہاتھ صاف کر دیتے تھے دونوں میں کھانے پر قریب قریب ہر روز ایک عجیب بھگانہ قسم کی جمع ہوتی تھی دونوں کی نگاہیں جب اس دودان میں ایک دوسرے سے ٹکراتیں تو دیکھنے والوں کو صاف پتہ لگ جاتا کہ وہ محبت آشنا ہیں۔

نسیم کو جب میری بیوی نے اپنے یہاں مدعو کیا تو اُسے سالنوں میں استعمال کیا جواگلی بہت پسند آیا کھانے کی میز پر اس نے پوچھا: یہ گلی آپ کہاں سے منگواتی ہیں؟

میری بیوی نے جواب دیا: "بازار سے..... پوسٹن کا گلی ہے..... نام

مٹا ہے۔"

نسیم نے کہا: دو ڈبے بے منگوا دیجئے ہمیں نے نوکر سے کہا۔ وہ فوراً پاس والے اسٹور سے جس کے ساتھ میرا صاحب چلے ہے۔ دو ڈبے لے آیا۔

اسی طرح وہ کئی آٹھ تین لے گئی۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی :- آپ وہ گئی کا حساب تو کریں گے ؟

میں نے کہا :- اس کی کیا ضرورت ہے ؟
لیکن جب اس نے اصرار کیا تو میں نے کہا :- کئی آٹھ تین ہوتے ہیں
آپ حساب کریں گے ؟

فیسم نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا :- آٹھ ہا میرا خیال ہے سات میں آئے ہیں :- سات ہی ہوں گے ؟

”ہوں گے کیا آپ کہتے ہیں تو آٹھ ہی ہوں گے :-

”آپ نے بھی ہوں گے ہی کہا :-

کافی دیر تک سات اور آٹھ کا ہیر پھیر ہوا۔ فیسم کے حساب کے مطابق تین سات تھے اور میرے اور اسٹور والے کے حساب کے مطابق آٹھ۔ فیصلہ یوں ہی ہو سکتا تھا کہ ہم میں سے ایک دوسرے کا حساب مان لے مگر جب بات حساب کی تھی تو کون مانتا۔ آخر فیسم نے اپنے ملازم سے کہا کہ غالی تین اکٹھے کرے جب یہ اکٹھے کر کے فیسم کے دو برویش کئے گئے تو ان کی تعداد سات تھی فیسم نے فائسٹا ڈانڈا میں میری طرف دیکھا اور کہا :- ”گن لیجئے۔ سات ہیں :-

میں نے پھر کہا :- سات ہی ہوں گے لیکن میرے حساب کے مطابق آٹھ ہوتے ہیں ۔

عازم نسیم سے مخاطب ہوا: جی ہاں! آٹھ ہی ہوتے ہیں۔ ایک بنگلے گئی تھی۔ میں اُن سے پانچ سو روپے ماہوار لیتا تھا، ہر مہینے اس کی پاٹی پاٹی کا حساب ہوتا تھا۔ لیکن اس میں کبھی سات اور آٹھ کا ہیرہ ہیرہ نہ ہوا۔ میاں میری دونوں میرے کام سے مطمئن تھے۔ لیکن مشرا احسان کسی حد تک میری تیز طبیعت سے ناواقف تھے۔ مگر اس کا اظہار وہ اپنی حد سے بڑھی پُر تکلف طبیعت کے باعث بارہا کبھی ذکر کرے۔

نظارہ مشرا احسان بہت وسیع قسم کے انسان ہیں مگر اپنی بیوی کے معاملے میں بہت سخت قسم گیر واقع ہوئے ہیں۔ نسیم کو صرف خاص خاص لوگوں سے ملنے کی اجازت ہے عام ایکٹروں اور ایکٹریسوں سے نسیم کو بات چیت کی ممانعت ہے ویسے نسیم بھی چھپوروں سے نفرت کرتی ہے۔ شوہر داخل برپا کرنے والی پادشہوں سے وہ خود بھی دور رہتی ہے۔ ایک دفعہ اسے ایک بہت بڑے بنگلے میں صحنہ پڑا۔

یہ بنگلہ مہرلی کا بنگلہ تھا جس طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی ایک "ٹریڈیشن" برکھ کے آغاز پر "مڈ پاڈی" ہے۔ اسی طرح مجھے ٹائیکز کی ایک ٹریڈیشن مہرلی کی رنگ پادشہ تھی۔ چونکہ فلان کے قریب قریب تمام کام کنجے ٹائیکز کے مہاجر تھے اس لئے یہ ٹریڈیشن یہاں بھی قائم رہی۔

ایس مگر جی اس رنگ پادشہ کے رنگ لپڑا رہتے۔ عورتوں کی کان اُن کی منقہ اور ہنس مکھ بیوی (اشوک کی بہن) کے سپرد تھیں میں شاہد لطیف کے ٹاں بیٹھا تھا۔ شاہد کی بیوی محبت (جیتائی) اور میری بیوی (صفیر) دونوں خدا منعم کیا باتیں کر

گئے زشتے

رہی تھیں۔ ایک دم شود پر پا ہوا۔ عصمت چنتا نہ کر لے مافیہ وہ آگئے..... لیکن میں بھی.....

عصمت اس بات پر اڑ گئی کہ وہ کسی کو اپنے اوپر رنگ پسینے نہیں دے گی۔ مجھے درد تھا کہ اس کی یہ ضد کہیں دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے۔ کیونکہ رنگ پاہٹ والے سب "ہولی" دسے موڑ میں تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ عصمت کا موڑ خود بخود بدل گیا۔ اور وہ چند لمحات ہی میں رنگوں میں لت پت بھتنی بن کر دوسری بھتیوں میں شامل ہو گئی۔ میرا اور شاہد لطیف کا حلیہ بھی وہی تھا جو ہولی کے دوسرے بھتنوں کا تھا۔

پارٹی میں جب کچھ اور لوگ شامل ہوئے تو شاہد لطیف نے باواز بلند کہا۔ چلو پرسی چہرہ نسیم کے گھر کا رخ کرو۔

رنگوں سے مسلح گردہ گھوڑ بند روڈ کی اوپری نیچی مار کول گئی مسلح پر بے خشکے میں بوٹے بنانا اور خود چھانا نسیم کے بنگلے کی طرف روانہ ہوا۔ چند منٹوں ہی میں ہم سب وہاں تھے۔ خود گن کر نسیم اور احسان باہر نکلے نسیم ہلکے رنگ کی جاکٹ کی ساڑھی میں ملبوس میک اپ کی نوک ہلکے نکالے۔ جب ہجوم کے سامنے برآمدے میں نمودار ہوئی تو شاہد نے ہنسنے کا حکم دیا۔ مگر میں نے اسے روکا۔ "شہر واپس آئے ہیں" سے کہہ کر ہڑے بدل آئیں۔

نسیم سے کچھ سے تمہیں کرنے کے لئے کہا گیا تو وہ ایک ادا کے ساتھ

سکرائی : یہیں ٹھیک ہیں :

ابھی یہ الفاغ اس کے منہ ہی میں تھے کہ ہول کی پچکاریاں برسن پڑیں۔ چند لمحات ہی میں بدی چہرہ نسیم بانو ایک عجیب و غریب قسم کی خوفناک چیز میں تبدیل ہو گئی۔ نیلے پیلے رنگوں کی تہوں میں سے جب اس کے سفید اوہر نکلیے دانت اور بدی چہرہ آنکھیں نظر آئیں تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہمزاد اور مافی کی معصومی پر کسی بچے نے سیاہی انڈیل دی ہے۔

رنگ بازی ختم ہونے پر کبھی شروع ہوئی۔ پہلے مردوں کا پیچ شروع ہوا۔ پھر عورتوں کا یہ سب دلیپ تھا۔ مشرکری کی فریبی جی جب بھی گرتی۔ تمبھوں کا طوقان برپا ہو جاتا۔ میری بیوی جینک ہوش تھی۔ شیشے رنگ اکڑ ہونے کے باعث اسے سمجھتے کہ نظر آتا تھا۔ چنانچہ وہ اکثر غلط سمت دوڑنے لگتی۔ نسیم سے سبھا گاہیں جاتا تھا یا وہ یہاں ہر کتنا ہاتھی تو کدو اس شقت کی عادی نہیں مگر حال وہ بڑا بکریں میں دلچسپی رہی۔

نسیم ادا اس کے میاں بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ میرا مطلب اس قسم کے مذہبی آدمیوں سے ہے۔ جو اردو کے اخباروں کے پڑھنے سے زمین سے اٹھا کر جڑتے ہیں اور سر آنکھوں پر لگاتے ہیں۔ شام کو ایک ستارہ دیکھتے ہیں۔ نو اور دو دیکھنے کے لئے سارا آسمان کھنڈا شروع کر دیتے ہیں دونوں وہم پرست ہیں۔ خاص طور پر میاں احسان دلیس کو کس پران کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔ پاس سمجھتے اچھی شب ہے۔ قریب ہے کہ آس پر روپ نگاہیں کہ ایک کا نا آدمی پاس سے

گزر گیا۔ بس وہیں ٹپک جائیں گے۔ ٹپک گھوڑا دن اُجائے گا تو نسیم سے اُبلو پڑیں گے
 و تم نے کیوں کہا تھا کہ اس گھوڑے پر دنگ لگاتا..... نہیں آئے گا۔"

ایسی کھل کھل چنچ ان میں عام سہرتی رہتی ہے۔ جوان کی از معافی زعلی میں رنگ
 بھرتی رہتی ہے۔

نسیم کے دو بچے ہیں جو اکثر تان کے پاس رہتے ہیں وہ ان کو اسٹوڈیو کی فضا
 سے دلد رکھنا چاہتی ہے اُس کو اپنے مرحوم باپ سے بہت پیار ہے ان کا فوٹو ہر
 دھرت اس کے درغیٹی ٹیک میں موجود رہتا ہے۔ مجھے عودتوں کے بیگ چھدی چھدی
 دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ ایک روز میں حسبِ عادت نسیم کا بیگ کھول
 کر یہ فوٹو دیکھ رہا تھا کہ وہ آگئی میں نے اس سے کہا: معاف کیجئے گا۔ یہ میری بہت
 بُری عادت ہے..... جاتیے یہ کس کا فوٹو ہے؟

نسیم نے فوٹو اُتار لی میں نے کہا اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا.....
 "میرے آبا جی کا۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک چہرہ قسیمی ہے۔ جو مجھ سے یوں کہہ رہی ہے۔
 "میرے آبا جی کا اور کس کا۔"

میں نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہیں؟ کہاں ہیں؟..... کیا یہی کافی
 نہ تھا کہ وہ اُس کے باپ ہیں..... نہیں..... اُس کے آبا جی ہیں۔
 ذیل کا یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد میں یہ مضمون ختم کروں گا۔

”بیگم! کچھنے کے دوران میں سڑکوں کے ساتھ ایک منظر پر بحث و تمحیص کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی۔ رات کے دو بجے تھے۔ جمع کی پہلی گاڑی سڑک سے تین بجے ملنی تھی میری بیوی ساتھ تھی۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو نسیم نے کہا: ”نہیں صغیر یہیں تو جاؤ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے جانے کا۔“

ہم نے بہت کہا کہ کوئی بات نہیں، موسم اچھا ہے کچھ دیر بیٹھ فارم پر نہیں گے۔ اتنے میں گاڑی آ پہنچے گی۔ مگر نسیم اور ادا صانع نے بہت اصرار کیا کہ ہم شہر جائیں کہیں چلے گئے۔ اس لئے کہ ان کے پاس سڑک تھی۔ اور انہیں بہت دودھ نہیں جاتا تھا۔ میں باہر باقاعدے میں سو گیا۔ صانع بھی کمرے میں سوئے پر لیٹ گئے۔ صبح ناشتہ کر کے جب میں اور صغیر گھر چلے تو راستے میں اس نے مجھے یہ بات سنائی جو دلچسپی سے ظاہر نہیں۔

جب صغیر اور نسیم سونے کے لئے کمرے میں داخل ہوئیں تو وہاں ایک چنگ تھا۔ صغیر نے اصرار کر دیا کہ کیا اور نسیم نے کہا: ”آپ سو جائیے۔“

نسیم سکرانی اور چنگ پر نئی چادر بچھا کر کہنے لگی: ”پکیرے تو بدل لیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک نیا سیلینگ سوٹ نکالا: ”یہ تم پہن لو۔“ بالکل نیا ہے۔ ”بالکل نیا“ یہ زور دے رہا تھا۔ جس کا مطلب میری بیوی سمجھ گئی اور لباس تبدیل کر کے

بستر پر لیٹ گئی۔ نسیم نے اطمینان سے آہستہ آہستہ شب خرابی کا لباس پہننا چہرے کا میک اپ کیا۔ ”آپ اتنا۔“ تو صغیر نے حیرت زدہ ہو کر کہا: ”ٹائٹ کٹ تنی پہلی پر نسیم۔“

نسیم کے چیکے ہر تھنوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی : یہ سب ایک آپ کی
کارت تھی ہے :

میک آپ آٹانے کے بعد اُس نے چہرے پر مختلف روغیات ملے اور
ٹاٹھ دگو کر قرآن اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ میری بیوی بے حد متاثر
ہوئی۔ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا : نسیم... نسیم تو ہم لوگوں سے کہیں
اچھی ہے..... :

اس احساس سے کہ یہ بات اسی نے ڈھنگ سے نہیں کہی مفید ایک
دم خاموش ہو گئی۔

قرآن کی تلاوت کرنے کے بعد نسیم سو گئی۔

پری چہرہ نسیم..... پکار کی نور جہاں..... مکہ حسن..... احسان کی خوشن
..... پھمسیاں کی مٹی اور دوبرچوں کی مٹاں !

اشوک کمار

مبھالمن جب دیوکارانی کو لے آؤا۔ تو بہن ٹائیز میں افراتفری میں لگی فلم کا آغاز
ہر چکا تھا۔ چند مناظر کی شوٹنگ پایہ تکمیل کو پہنچ چکی تھی کہ بمب لسن اپنی ہمدردی کو
سلو لائیو کی دنیائے کھینچ کر حقیقت کی دنیا میں لے گیا۔ بیٹھے ٹائیز میں سب سے
زیادہ پریشان اور متشکر شخص ہانسوراٹے تھا۔ دیوکارانی کا شوہرا دیو بیٹے ٹائیز
کا "دل و دماغ ہیں پروہ"۔

ایس کو جی مشہور جرہی میگزین فلم ساز اشوک کمار کے بہنوئی ہاں دلوں بھی
ٹائیز میں مٹر ساوک واپا ساوندز ایجنٹ گنگ کے اسٹنٹ تھے صرف بنگال
ہرنے کی وجہ سے انہیں ہانسوراٹے سے ہمدردی تھی وہ چاہتے تھے کہ کسی دکنی طرح
دیوکارانی والی آجائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آقا ہانسوراٹے سے شورہ کئے بغیر

اپنے طہرے کو شش کی انداپنی ضرور حکمت علی سے دیو کارانی کو آمادہ کر لیا کہ وہ کلکتے میں اپنے عاشق نجم الحسن کی آغوش چھوڑ کر واپس بجے ٹائیکر کی آغوش میں چلائے جس میں اس کے چاہر کے چنے کی زیادہ گنٹائش تھی۔

دیو کارانی واپس آگئی۔ ایس مگر جی نے اپنے جذباتی آقا ہانسورائے کو بھی اپنی حکمت علی سے آمادہ کر لیا کہ وہ اسے قبول کر لیں۔ اود بے چارہ نجم الحسن ان عاشقوں کی فہرست میں داخل ہو گیا جن کو سیاسی، مذہبی اور سرمایہ دارانہ حکمت علیوں نے اپنی محبوباؤں سے جدا کر دیا تھا۔

ذیر تمکین فلم سے نجم الحسن کو قہقی سے کات کر دوی کی ٹوکر میں پسٹیک تو دیا گیا۔ مگر اب یہ سوال درپیش تھا کہ عشق آشنا دیو کارانی کے لئے سیولائزڈ کا ہیرو کون ہو۔

ہانسورائے اک بے حد منتق اور دوسروں سے الگ تنگ رہ کر خاموشی سے اپنے کام میں شب و روز منہمک رہنے والے فلم ساز تھے انہوں نے بجے ٹائیکر کی نیوکچہ اس طرح ڈالی تھی کہ وہ ایک باوقار درس نگاہ معلوم ہو یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بمبئی شہر سے دو مصنفات میں ایک گاؤں کو جس کا نام "ملاو ہے" اپنی فلم کہنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ وہ باہر کا آدمی نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے کہ باہر کے آدمیوں کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی نجم الحسن بھی باہر کا آدمی تھا، یہاں پھر ایس مگر جی نے اپنے جذباتی آتما کی مدد کی۔ ان کا سارا اشوک کمار

بی ایس سی پاس کر کے ایک برس لگتے میں دکان پر دھن کے بعد بیٹے ٹائیکز کی
 لیبارٹری میں بغیر تنخواہ کے کام سیکر رہا تھا۔ تاک نقشہ اچھا تھا۔ تھوڑا سبب گاہیا
 بھی لیتا تھا مگر بیٹے چنانچہ پریسنگ تیکر کے بیرو کے لئے اس کا نام لیا۔ ہانسورا کے کی سدی
 زندگی قبروں سے دو چار ہی تھی انہوں نے کہا دیکھ لیتے ہیں جو من کیو من دھنگ
 نے اشوک کا میٹ لیا۔ ہانسورا نے دیکھا اور پاس کر دیا۔ جو من تم ڈائریکٹر
 ڈائراؤ سنٹن کی دانتے ان کے برعکس تھی۔ مگر بیٹے ٹائیکز میں کسی کی مبالغہ کو ہانسورا نے
 کی دانتے کے خلاف اظہار خیال کر کے۔ چنانچہ اشوک کمار گنگولی جوان دونوں بشکل
 ۲۲ برس کا ہو گا دیوکارانی کا سیرو مشتبہ ہو گیا۔

ایک فلم تھی، دو فلم تھی..... کئی فلم تھیں اور دیوکارانی اور اشوک کمار کا جذبات
 ہونے والا تھی جو تباہ کیا ان فلموں میں سے اکثر بہت کامیاب ہوئیں۔ گریڈ یا سی ڈی کلائی
 اور بڑا ہی بے ضرر اشوک کمار، دونوں سلو ٹانڈ پر فیروزنگر ہر کرتے تو بہت ہی پیارے
 لگتے۔ معصوم ادائیں، الطاف خیزے..... بڑا ہنسائی قسم کا عشق..... لوگوں کو
 جو جادو خانہ عشق کرنے اور دیکھنے کے شوقین تھے۔ یہ دم و تازہ اور لپکلیا عشق
 بہت پسند آیا۔ خاص طور پر اس نئے فلمی جرم سے گے گردیدہ ہر گئے مسکولوں اور بچوں
 میں ملاقات کا خصوصاً ان دنوں، آئیڈیل سیرو اشوک کمار تھا اور بچوں کے لڑکے
 بس اور کسل، ستینوں والے جنگلی کرتے پن کر گاتے پھرتے تھے۔

تو بن کی چڑیا۔ میں بن کا پنیں بن بن بلوں سے

آتے رہے..... صبح آٹھ گھنٹے میں نے پہلا کام یہ کیا کہ وہ نوٹس اٹھا کر ڈاک خانے میں جمع کروا دیے۔

اشوک مجھے یہ بات اپنے مکان پر منارا تھا کہ گھنٹے کا ایک نلم ساڈا اس سے ملے آیا۔ کنڈریکٹ ٹیڈ تھا مگر اشوک نے اس پر دستخط نہ کئے۔ وہ اسی ہزار روپے دیتا تھا۔ وہ اشوک کا رکا مطالبہ پورے ایک لاکھ کا تھا۔... کہاں ڈھائی سو روپے اور کہیں ایک لاکھ!

بچے ٹائیز میں اشوک کے ساتھ ساتھ اس کے بیٹھنی ایس کمپنی نے بھی ترقی کی۔ آدمی ڈسین تھا۔ گرد و پیش جو کچھ بھی ہوتا تھا اس کا بنظر غائر مطالعہ کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ پروڈیوسر بن گیا..... معمولی پروڈیوسر نہیں بہت بڑا پروڈیوسر جس نے بچے ٹائیز کے جھنڈے تلے کئی سکور اور گولڈن جوبلی فلمیں بنائیں اور منظر نگاری میں ایک خاص اسکول کی بنیاد ڈالی..... راقم الحروف اس منصف میں اس کو اپنا استاد مانتا ہے۔

اشوک کی ہر لمبیز می دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ چونکہ وہ باہر بہت ہی کم نکلتا تھا اور مالگ تنگ رہتا تھا۔ اس لئے جب لوگ کہیں اس کی جھلک دیکھ پاتے تو ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ چلتی ٹریک بند ہو جاتی اس کے چاہنے والوں کے شمشک لگ جاتے اور اکثر ادھات پولیس کے ڈنڈے کے ڈھدے سے آگے جھوم کی بے پناہ عقیدت سے نہات دلا دیا پڑتی۔

اشوک کو اس ایکٹریس کا جسم پسند تھا۔ ہر وقت وصل وصل بکھری نکھری ہوتی تھی اس کی یہ چیز بھی اشوک کو بہت جاتی تھی۔ چنانچہ جب اس نے تھلا بازی لگا کر اس کو اپنا جانی بنالیا تو اشوک کو کافی گرفت ہوئی۔

اشوک عشق پیشہ نہیں۔ لیکن ہلک جھانک کا مرض اس کو عام مردوں کا سا ہے عورتوں کی دعوت طلب چیزوں کو باقاعدہ غور سے دیکھتا ہے اور ان کے شعلہ اپنے دوستوں سے باتیں بھی کرتا ہے۔ کہیں کبھی کسی عورت کی جسمانی قربت کی خواہش بھی غوس کرتا ہے۔ مگر بقول اس کے منشیہ..... بہت نہیں پڑتی۔

بہت کے معاملے میں وہ واقعی بہت بردا ہے۔ لیکن یہ بردا پن اس کی ازدواجی زندگی کے لئے بہت ہی مہارک ہے اس کی بیوی شوبھا سے اگر اس کی اس کمزوری کا ذکر کیا جائے تو یقیناً وہ یہی کہے گی: خدا کا شکر ہے کہ گانگولی میں ایسی بہت نہیں اور خدا کرے اس میں یہ بہت کہیں پیدا نہ ہو۔

مجھے حیرت ہے کہ اس میں یہ بہت اور جرات کیوں پیدا نہ ہوئی جب کہ سینکڑوں لڑکیوں نے جرات و دغا نہ سے کام لے کر اس کو عشق کی آگ میں کودنے کی ترغیب دی اس کی فانی ڈاک میں بلابالغہ ہزاروں عورتوں کے عشق و محبت سے بربیز خطوط آئے ہوں گے۔ مگر جہاں تک میں جانتا ہوں۔ خطوط کے اس انبار میں سے اس نے شاید ایک سو بھی خود نہیں پڑے۔... خطا ہے میں اس کا

مرل سیکڑی ڈی سوفا انہیں مزے لے لے کر چھتا ہے اور دون جن مریں ہوتا جاتا ہے۔

تقسیم سے چند ماہ پہلے اشوک فلم چند شیکم کے سلسلے میں لگتے میں تھا شہید سہروردی اس وقت وزیراعظم بنگلہ کے ہاں سے سولہ علی میر ظلم دیکھنے کے بعد اپنے قریبے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں دو خوبصورت اینگلو انڈین لڑکیوں نے اس کی موٹر روکی اور لغت چاہی۔ اشوک نے چند منٹ کی عیاشی کر لی۔ مگر اُسے اپنے نئے سگریٹ کیس سے ہاتھ دھوئے پڑے ایک لڑکی جو شوخ و شنگ تھی۔ سگریٹ کے ساتھ سگریٹ کیس بھی لے اُڑی۔ اس واقعے کے بعد اشوک نے کئی بار سوچا کہ ان سے رسمی راہ پیدا کی جائے بات معمولی تھی مگر اس کی بہت بڑھڑی۔

کو لھا پور میں غرز، تلوار اور ڈھال قسم کی بھاری بھرکم ہونٹ فلم بن رہی تھی اشوک کا تھوڑا سا کام اس میں باقی رہ گیا تھا وہاں سے کئی بلاؤسے آئے مگر وہ نہ گیا اس کی طبیعت اس ہول سے بہت متاثر تھی۔ جو اسے ادا کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ مگر کنٹرکٹ تھا۔ آخر ایک روز اُسے جانامی پڑا۔ ساتھ مجھے لے گیا۔ اُن دنوں میں فلستان کے لئے ”آٹھ دن“ نامی فلم لکھ رہا تھا چو نکریہ فلم اُسے پروڈیوس اور ڈائریکٹ کرنا تھی۔ اس لئے اُس نے کہا: چلو بار..... وہاں اُداس سے کام کریں گے۔

گمراہ نام کہیں... لوگوں کو فوراً معلوم ہو گیا کہ اشوک کمار کو لہا پور آیا ہے چنانچہ
 اُس برس کے ارد گرد جہاں ہم ٹھہرے تھے۔ ذاترین جمع ہونے شروع ہو گئے ہوش کا ملک
 ہوشیدہ تھا کسی نہ کسی جہان نے وہ ان لوگوں کو منتشر کر دیا لیکن پھر بھی بعض چیکوٹم
 کے لوگ ہوش کا طواف کرتے رہتے اور اپنے محبوب اکشر کی زیدت کر ہی نہتے
 اپنے عقیدت مندوں کے ساتھ اشوک جیسا کہ میں پہلے لکھا ہوں۔ بہت ہی اکشر
 قسم کا سلوک کرتا رہا مجھے معلوم نہیں اُن کا رویہ عمل کیا تھا۔ مگر بحیثیت ایک نافر
 کے لیے سنت گرفت ہوئی تھی۔

ایک شام ہم دونوں سیر کو نکلے۔ اشوک "کیون فلاڈ" کہتے تھے۔ آنکھوں پر چوڑا
 چکلا۔ گہرے رنگ کا چشمہ..... ایک ہاتھ میں چھتری دوسرے ہاتھ میں میرا
 کندھا تاکہ حسب ضرورت مجھے اُگے پیچھے کر سکے۔ اسی طرح ایک استود میں بیٹھے
 اشوک کو کو لہا پور کے استوڈیو کے گرد و غبار کے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے
 کوئی دھما خمد نہ تھا۔ جب اُس نے استود والے سے یہ طلب کی تو اُس نے سر ہری
 نظریے اپنے گاہک کی طرف دیکھا اور اندامی کی طرف جہا لیکن فوراً ہی ڈی
 لیڈ ایکشن "ببب کی طرح پٹا اور مڑ کر اشوک سے مخاطب ہوا۔"
 آپ..... آپ کون ہیں؟

اشوک نے جب دیا۔ میں کون ہوں؟..... میں وہی ہوں جو کہ
 میں ہوں؟

استور والے نے غور سے اشوک کے چہرہ اور اسے چہرے کی طرف دیکھا۔ آپ اشوک کاہر میں؟

اشوک نے بڑے دل شکن ہنسے میں کہا: اشوک کا کوئی اور ہوگا۔ چلو نشو۔ یہ کہہ کر اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دوا خرید سے بغیر ہی ہم دونوں استور سے باہر تھے۔ ہوتل کا موٹر مرد نے لگے تو سامنے تین مرستی لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ بہت صاف ستھری، گوری جیٹی۔ ہاتھوں پر نگم نگم، بالوں میں دینیاں رچھوڑوں کے گجرے، پیروں میں ہلکے پھلکے چل۔ ان میں سے ایک جس کے ہاتھوں میں موسمیاں تھیں۔ اشوک کو دیکھ کر دوسرے کا پنی، بھنی ہوئی آواز میں اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا: اشوک! اور اس کے ہاتھوں کی ساری موسمیاں سڑک پر گر پڑیں۔ اشوک نے میڈکنڈ حاصوڑا اور بھاگ گیا۔

اشوک سے میری پہلی ملاقات فلستان میں ہوئی۔ جب ایس کمری کی پوسی ٹیم نے بے ٹاکنیز چھوڑ کر اپنا نیا غلی بازار قائم کر لیا تھا۔ میں تو میں نے کئی بار اس کی جھلکیاں دیکھی تھیں مگر اس سے مفصل ملاقات فلستان ہی میں ہوئی جب میں وہاں ملازم ہو گیا۔

غلی دنیا کی ہر شخصیت پردے پر کچھ اور پردے سے پردے کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ اشوک کو چنانچہ جب میں نے پہلی مرتبہ فریب سے دیکھا تو پردے کے اشوک سے بہت مختلف تھا۔ گہرا سونوارنگ، موٹے اور کھردرے ہاتھ مضبوط

کرتی جسم۔ نیم گنوار لب و لبو۔ اکھڑا اکھڑا غیر فطری مختلف۔ تعارف کرایا گیا
تو میں نے اس سے کہا: آپ سے مل کر جی مسرت ہوئی ہے۔
اشوک نے اس کے جواب میں جو کچھ کہا وہ سوتے سوتے الفاظ پر شعل بنایا
لگتا تھا۔ جیسے اُس نے یہ لفظ دئے ہوئے ہیں۔

ایک مرتبہ بلستان میں ایک صاحب سیر و تغیر کئے آئے۔ آپ نے
بڑے پر تکلف انداز میں اشوک سے کہا: مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خاکسار
کو اس سے پہلے بھی جواب سے شرفِ ملاقات حاصل ہو چکا ہے۔

اشوک نے گڈ بڑے ہنس میں جواب دیا: جی... جی مجھے کبھی مقابلہ نہیں
ہوا۔ مقابلے کا کاف اُس نے حلق سے نکالا۔... لیکن فوراً ہی اس کو احساس ہوا
کہ اُس نے یہ لفظ غلط استعمال کیا ہے مگر وہ گول کر گیا۔

اشوک کو اردو بہت اچھی لگتی ہے شروع شروع میں اُس نے اُس
زبان میں لکھنا پڑھنا شروع کیا مگر قاعدے سے آگے نہ بڑھ سکا پھر بھی اس کو
تھوڑی سی شہد ہے ایک دو سطر اردو لکھ لیتا ہے تقسیم کے بعد جب میں
اُسے چھوڑ کر بیٹے ٹائیز سے چلا آیا تو اُس نے مجھے اردو میں ایک خط
لکھا کہ واپس آ جاؤ۔ مگر افسوس ہے کہ میں چند در چند وجوہ کے باعث
اس کا جواب دے سکا۔

میری بیوی بھی دوسری عہدوں کی طرح اشوک کار کی بہت شغف تھی۔

ایک دن میں اشوک کو اپنے گھر لے آیا کرے میں داخل ہوتے ہی میں نے
 خود سے آواز دی: "صغیرہ.....! او اشوک کا آیا ہے؟"

صغیرہ اندر دوڑی پکار ہی تھی۔ جب میں نے پے درپے آوازیں دیں تو
 وہ باہر نکل۔ میں نے اشوک سے اس کا تعارف کرایا۔ یہ میری بیوی ہے دادا منی
 ہاتھ ملاؤ اس سے۔

صغیرہ اور اشوک دونوں جھینپ گئے۔ میں نے اشوک کا ہاتھ پکڑ لیا۔
 "ہاتھ ملاؤ دادا منی..... شرماتے کیا ہو؟"

مجبوراً اُسے ہاتھ ملا پڑا۔ اتفاق سے اُس روز قیسے کی روٹیاں میاں کی جا
 رہی تھیں۔ اشوک کھا کے آیا تھا مگر جب کھانے پر بیٹھا تو تین ہڑپ کر گیا۔
 یہ عجیب بات ہے کہ بچے میں اس کے بعد جب کبھی میاں سے یہاں قیسے کی
 روٹیاں تیار ہوتیں۔ اشوک کسی دکی طرح اُن موجود ہوتا اس کی خوشبو میں کر
 سکتا ہوں مٹا اشوک۔ دانے دانے پر مہر والا چچی قہقہہ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے ابھی ابھی اشوک کو دادا منی کہا ہے۔ بنگلہ میں اس کا مطلب ہے
 بڑا بھائی..... اشوک سے جب میرے مراسم بڑھ گئے تو اُس نے مجھے مسودہ
 کیا کہ میں اُسے دادا منی کہا کروں۔ میں نے اُس سے کہا: "تم بڑے کیسے ہوئے
 حساب کرو۔ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔"

حساب کیا گیا تو وہ مجھ سے عمر میں دو ماہ اور کچھ دن بڑا نکلا۔ چنانچہ اشوک

اور سرنگا گولی کے بجائے مجھے دامانی کینا پڑا۔ یہ مجھے پسند بھی تھا کیونکہ اس میں
 بنگالیوں کی محبوب تنہائی اس گلی کی شناس اور گولائی تھی۔ وہ مجھے پیسٹر سنٹر کہتا
 تھا جب اس سے دامانی کینے کا سہارہ ہوتا۔ تو وہ مجھے صرف منٹو کہنے لگا۔ حالانکہ مجھے
 یہ ناپسند تھا۔

پردے پر وہ مجھے چاکولیٹ بیرو معلوم ہوتا تھا مگر جب میں نے اس کو
 سلوانڈ کے غول سے باہر دیکھا تو وہ ایک کسرتی آدمی تھا اس کے کتے میں اتنی قوت
 تھی کہ دروازے کی کڑی میں شگاف پڑ جاتا تھا ہر روز گھر پر بانگ کی
 شش کرتا تھا۔ شکار کھینے کا شوقین تھا۔ سخت سے سخت کام کر سکتا تھا انہوں
 مجھے صرف اس بات کا سہارا اُسے آرائش کا قطعاً ذوق نہیں تھا۔ وہ اگر
 چاہتا تو اس کا گھر دکش سے دکش ساز دس ماہ سے آگے ہوتا مگر اس طرف
 وہ کبھی رجوع دیتا ہی نہیں تھا۔ اگر دیتا تھا تو اس کے نتائج غیر متاوانہ ہوتے تھے
 برش، اٹھا کر خود ہی سارے فریج پر گہرائی پینٹ توپ دیتا یا کس صوفے کی پشت
 توڑ کر اسے دیوان کی بھرتی شکل میں تبدیل کر دیا۔

مکان سمندر کے ایک خینہ کلاس پر ہے۔ لیکن پانی کے چھینے یا ہر کھڑکیوں کی
 سلاخوں کو چاٹ رہے ہیں۔ جگہ جگہ لوہے کے کام پڑنگ کی پڑیاں بھی ہیں ان
 سے جڑی اداسی پھیلائے والی برا رہی ہے۔ مگر اشوک اس سے قطعاً غافل
 ہے۔ ریفریجریٹر یا ہر کوری ڈور میں پڑا جگہ مار رہا ہے اس کے ساتھ لگ

کر اس کا گرانڈ فیل اسے شین کتا سو رہا ہے ۔ پاس کمرے میں نیچے اوڑھ بچا رہے ہیں اور اشوک غسل خانے کے اندر پاٹ پر بیٹھا دیواروں پر حساب لگا کر دیکھ رہا ہے کہ ایس میں کون سا گھوڑا دین آئے گا یا کالوں کا پرچہ نامہ میں لٹے ان کی ادائیگی سونچ رہا ہے ۔ اشوک کو فراست الید یعنی پامشری اور علم نجوم سے خاص شغف ہے ۔ مٹووالہ ذکر علم اس نے اپنے باپ سے سیکھا ہے مستعد و کتاب میں بھی پڑھی ہیں فرصت کے اوقات میں وہ شغل کے طور پر اپنے دوستوں کی جنم پتریاں دیکھا کرتا ہے ۔

میرے دوستوں کا مطالعہ کر کے اس نے ایک دن مجھ سے سرسری طور پر پوچھا : تم شادی شدہ ہو؟

میں نے اس سے کہا : تمہیں معلوم نہیں؟
اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا : جانتا ہوں لیکن دیکھو
مثلاً ایک بات بتاؤ نہیں تمہارے تو ابھی اولاد نہیں ہوئی ؟

میں نے اس سے پوچھا : بات کیا ہے بتاؤ تو نہیں ؟
اس نے جھکپاتے ہوئے کہا : کچھ نہیں جن لوگوں کے ستاروں کی
پوزیشن ایسی ہوتی ہے ان کی پہلی اولاد لڑکا ہوتی ہے لگروہ زندہ
نہیں رہتی ۔

اشوک کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میرا لڑکا ایک سال کا ہو کر مر گیا تھا ۔

اشوک نے جے لہدی میں بتایا کہ اس کا پہلا بچہ جو کہ لڑکا تھا مردہ پیدا ہوا تھا۔ اس نے جے کا۔ تمہارے اور میرے ستاروں کی پوزیشن قریب قریب ایک جیسی ہے اور یہ کبھی ہو ہی نہیں سکتا کہ جن لوگوں کے ستاروں کی پوزیشن ایسی ہو ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا نہ ہو اور وہ نہ ترے۔

اشوک کو علم نجوم کی صحت پر پورا پورا یقین ہے بشرطیکہ حساب درست ہو۔ وہ کہا کرتا ہے جس طرح ایک پانی کی کپیش حساب میں بہت جری گڑ چڑ پیدا کرتی ہے اس طرح ستاروں کے حساب میں معمولی سی غلطی ہیں کہیں کی کہیں سے جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ لائق کے ساتھ کوئی نتیجہ قائم نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے ہم سے ہو ہو گیا ہو۔

دیس کے گھوڑوں کے ٹپ حاصل کرنے میں بھی عام طور پر اشوک اس علم سے مدد لیتا ہے۔ گھنٹوں باتہ دوم میں بیٹھا حساب لگاتا رہتا ہے مگر پوری دس میں سو روپے سے زیادہ اس نے کبھی نہیں کھیلا اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ ہمیشہ جیتتا ہے۔ سو کے ایک سو دس ہو گئے سو کے سو ہی رہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا۔ کہ اس کے سو میں سے ایک پانی کم ہوئی ہو..... وہ دیس جتنے کے لئے نہیں محض تفریح کے لئے کھیلتا ہے اس کی جبین دھیس سیوی شو بھاتیں بچوں کی ہاں ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممبرز انکلوڈر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک کونے میں الگ تنگ بیٹھ جاتا ہے۔ دیس شروع ہونے سے چند منٹ پہلے اپنی

بیوی کو روپے دیتے ہے کہ نعل نعل نعل نمبر کے ٹکٹ لے آؤ۔ جب دیس ختم ہوتا ہے تو اس کی بیوی ہی کھڑکی پر جا کر جیتنے والے ٹکٹوں کے سوپے وصول کرتی ہے۔

شوہنیا گھر پر عورت ہے۔ تعلیم دا جی ہے اشوک کہا کرتا ہے کہ ان پر لڑ ہے مگر صرف ازدواج مذاق۔ اس کی ازدواجی زندگی بہت کامیاب ہے۔ شوہنیا اتنی دولت ہمارے کے باوجود گھر کے کام کاج میں مشغول رہتی ہے۔ ٹیٹ بنگالیوں کی طرح سوئی دھوتی پہنے اور اس کے چو کے ایک کونے میں چابیوں کا پر بڑا گھنچا اڑے وہ مجھے ہمیشہ اپنے گھر میں معروف کرد نظر آتی۔ شام کو جب کبھی دسکی کا ایک دور چلتا تو گڑک کی چیزیں شوہنیا اپنے ماتھے سے تیار کرتی تھی۔ کبھی ٹیکس پادے کبھی گجن ہوٹی دال۔ کبھی آلوؤں کے تٹے۔

میں فرما زیادہ پیسے کا عادی تھا۔ اس نے شوہنیا اشوک سے کہتی تھی: دیکھو گا گولی! مشر منشو کو زیادتی مت دینا۔ مشر منشو ہم کو رو میں گی؟

مشر منشو اور مشر گا گولی دونوں سیلیاں تھیں ان سے ہم دونوں بہت کام لگاتے تھے۔ جنگ کے باعث بڑے اچھے سگرٹ قریب قریب ناپید تھے۔ جتنے ہیں باہر سے آتے تھے سب کے سب بلیک مارکٹ میں چلے جاتے تھے۔ یوں تو ہم عام طور پر اس بلیک مارکٹ ہی سے اپنے لیے سگرٹ حاصل کرتے تھے۔ مگر جب کسی ویسے سے صحیح قیمت پر کوئی چیز مل جاتی۔ تو ہم عجیب و غریب مسرت محسوس کرتے۔

اشوک کد

مسز گنگول جب شوہنک کرنے نکلن تو میری بیوی صنید کو کس کس اپنے ساتھ لے جاتی۔ قریب قریب ہر بڑے دکاندار کو معلوم تھا کہ مسز گنگول مشہور دیکٹر اشوک کد کی بیوی ہے۔ چنانچہ اس کے طلب کرنے پر بلک مارکیٹ کی تار یک تہوں میں چھپائی ہوئی چیزیں باہر نکل آتی تھیں یوں میں بٹے کے مرد عورتوں کے ہاتھ میں کافی رقم مل دانت ہوئے ہیں۔

بنک سے روپیہ نکلوانا ہو۔ کوئی رجسٹری گراتا ہے۔ سینا یا دیں گا ڈی کے ٹکٹ لینا ہوں۔ مرد پڑا ڈیڑھ گھنٹہ سوکتا رہے گا لیکن اس کے مقابلے میں عورت کو ایک منٹ میں استاد کرنا نہیں پڑے گا۔

اشوک نے اپنی شہرت اور ہر دلعزیزی سے شاید ہی ٹانڈہ اٹھایا مگر میرے بعض دوست اس کے علم کے بغیر اس کے دلیے سے اپنا اتو سیدھا کہیتے تھے راجہ مہدی علی خاں نے ایک دفعہ بڑے ہی دلچسپ طریقے سے اپنا اتو سیدھا کیا۔

راجہ غلستان میں ملازم تھا میں غلستان چھوڑ کر ولی صاحب کے لئے ایک کہانی لکھ رہا تھا ایک روز مجھے ٹیلیفون پر اشوک کے سیکرٹری نے بتایا کہ راجہ مہدی علی خاں بیمار ہیں۔ میں وصال پہنچا تو دیکھا کہ جناب کی بہت بڑی حالت ہے لگتا ہے کہ وہ صلاب ہے کہ کھلاڑی نہیں نکلتی۔ نقابست کا یہ عالم ہے کہ مہاراجے کو بھی آٹھ خیمیں جانا۔ اور آپ ٹیکن پانی کے غلاموں اور اورینٹل بام کی مالش سے اپنا ہر حق دودھ کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

مجھے شبہ سا ہوا کہیں ڈیپریسز یا نہ ہو۔ چنانچہ میں نے انہیں فوراً موٹر پر لاوا اور اشوک کو ٹیلیفون کیا۔ اُس نے مجھے اپنے ایک واقف ڈاکٹر کا نام بتایا کہ وہاں لے جاؤ۔ میں راجہ صاحب کو وہاں لے گیا۔ تشنیںص کے بعد معلوم ہوا کہ واقعی وہی ممڈی مرض ہے ڈاکٹر صاحب کے شورے کے مطابق میں نے فوراً ہی ممڈی امراض کے ہسپتال میں اُن کو داخل کرا دیا۔ ٹیکے وغیرہ دیے گئے دوسرے روز صبح میں نے اشوک کو ٹیلی فون پر راجہ کے مرض کی نوعیت بتائی۔ سبب اُس نے کوئی تشویش ظاہر نہ کی۔ تو مجھے غصہ آگیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ ایک آدمی ایسے خوفناک مرض میں مبتلا ہے جیسا کہ کامیابیاں کوئی پرسان حال ہی نہیں اور تم کوئی دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

اشوک نے جواباً صرف اس قدر کہا: آج شام کرپلیں گے اُس کے پاس۔ ٹیلیفون بند کر کے میں ہسپتال میں پہنچا اور دیکھا کہ راجہ کی حالت پہلے کی نسبت کسی قدر بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے جو ٹیکے کہے تھے وہ میں لے آیا تھا۔ یہ اس کے حوالے کر کے اور دم دلا سادے گرمی اپنے کام پر چلا گیا۔

شام کو اشوک نے مجھے وِل کے دفتر میں پکڑ لیا میں نامراض تھا مگر اس نے مجھے مٹایا موٹر میں ہسپتال پہنچے۔ اشوک نے راجہ سے معذرت طلب کی کہ وہ بے حد مصروف تھا۔ اور صراحت کر کے باقی برائیوں۔ اس کے بعد اشوک مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔

”دوسرے روز ہسپتال پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ راجہ راجہ بنا بیٹھا ہے۔ بستر کی چادر اچل، تنکے کا غلاف اجلا۔ سگریٹ کی ڈبیا، پان، سروے کی ڈنڈوسل پر چھلکٹن۔ ہانگ پر تانگ دھکے۔ ہسپتال کا ساف سٹول جوڑا پہنے بڑے عیاشانہ طرز پر اقبند کا سٹول کرنا تھا۔ میں نے حیرت جیسے ہنسی میں اس سے پوچھا۔ کیوں راجہ؟ یہ سب کیا؟“

راجہ مسکرایا۔ اس کی یہ بڑی بڑی مونچھیں تھرائیں تھیں تو کچھ بھی نہیں... اسی اور دیکھتا؟

میں نے پوچھا۔ کیا؟

”عیاشی کے سامان... کچھ روز اور میں یہاں رہا تو قم دیکھو گے کہ پاس والے کمرہ میں میری حرم سڑے ہوگی۔ خدا جتنا رکھے میرے اشوک کد کو... بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا؟“

تھوڑی دیر کے بعد راجہ نے بتایا کہ وہ سب کچھ اشوک کد اور غبور ہے... ہسپتال والوں کو پتہ چل گیا کہ اشوک اس کی بید پرسی کے لئے آیا تھا۔ چنانچہ ہر چھوٹا بڑا راجہ کے پاس آیا ہر ایک نے اس سے ایک ہی قسم کے متعدد سوال کئے۔

”کیا اشوک واقعی اس کی بید پرسی کے لئے آیا تھا؟“

”اشوک سے اس کے کیا تعلقات ہیں؟“

کی رائے لیتا ہے۔ اس فضا سے اگر کوئی اسے باہر لے جاتا ہے تو وہ بہت الجھن محسوس کرتا ہے۔

تعلیم یافتہ ہونے اور بیٹی ٹائیز جیسے باذوق فلمی ادارے کے ساتھ کئی برسوں تک شلک رہنے کی وجہ سے اشوک کو فلمی صنعت کے قریب قریب ہر شعبے سے واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ کمرے کی باریکیاں جانتا ہے، لیا بڑی کے تمام پیچیدہ مسائل سمجھتا ہے۔ ایڈیٹنگ کا عملی تجربہ رکھتا ہے اور ڈائریکشن کی گہرائیوں کا بھی مطالعہ کر چکا تھا۔ چنانچہ فلستان میں جب اُس سے رائے سبیلہ چوٹی ملنے لگی ایک فلم پر ڈیلیوس کرنے کے لئے کہا تو وہ فرماتیا ہو گیا۔

ان دنوں فلستان کا چودہ گینڈا فلم "شکاری" مکمل ہو چکا تھا اس سٹی میں کئی مہینوں کی لگاتار محنت کے بعد گھر میں پھینوں کے مزے اڑا رہا تھا۔ ایک دن سلوک واپس آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد کہنے لگے، سہلوت.....

..... ایک کہانی لکھ دو گنگولی کے لئے۔ میری سمجھ میں آیا کہ ساوک کا کیا مطلب ہے میں فلستان کا ملازم تھا اور میرا کام ہی کیا تھاں لکھنا تھا۔ گنگولی کے لئے کہانی لکھوانے کے لئے ساوک کی سفارش کی کیا ضرورت تھی مجھ سے دنوں فلستان کا کوئی ذمہ دار دکن بھی کہتا، میں کہانی لکھنا شروع کر دیتا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اشوک چونکہ فلم خود پروڈیوس کرنا چاہتا ہے اس لئے اس کی خواہش ہے کہ میں اُس کی خواہش کے مطابق کوئی شہایت ہی اچھوتی کہانی

لکھوں۔ وہ خود میرے پاس اس لئے آیا کہ وہ دوسروں سے کئی کہانیاں سن چکا تھا۔
 بہر حال ساوک کے ساتھ وقت مقنن ہوا اور ہم سب ساوک ہی کے صاف
 سترے نلیٹ میں جمع ہوئے۔ اشوک کو کسی کہانی چاہیے تھی یہ خود اس کو
 معلوم نہیں تھا۔ بس منظر ایسی کہانی ہو کہ مرزا آجائے..... انتہا خیال رکھو کہ یہ
 میرا پہلا نظم ہوگا:

ہم سب نے ہی کو گھٹنوں منفر پاشی کی، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا اُن دنوں آغا
 خاں کی ڈائمنڈ جوبلی ہونے والی تھی جس کے لئے ساوک کے نلیٹ کی پہل طرف
 برے برون اسٹیڈیم میں ایک بہت بڑا پنڈال تعمیر کیا جا رہا ہے۔ میں نے
 اس سے اپنی دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش کی..... ساوک کے رنگ دم
 میں صنم تماش کی ایک نہایت ہی عمدہ نمونہ تھا اس کو یہی دماغ میں گمایا پھر آیا
 اپنے چائے کارناموں پر نظر ڈالی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

دن بھر کی سٹی ناکام کی کوفت دور کرنے کے لئے شام کو باہر تیرس پر
 برآمدی کا دور شروع ہوا۔ شراب کے انتخاب میں ساوک کا چاہت ہی عمدہ
 ذوق کا مالک ہے۔ برآمدی چنانچہ خائفہ اور قوام کی بہت ہی اچھی تھی۔ حلق
 سے اترتے ہی لطف آگیا۔ سامنے چپ گلیٹ، اسٹیشن تھا۔ میچے بازار میں خوب
 چہل پہل تھا۔ ادھر بازار کے اختتام پر مندر اور مندر سے مندر کا انتخاب
 جری تھی کاروں میں شرک کی چمکیں سطح پر تیر رہی تھی..... ٹھوڑی دیر کے بعد

بعد ایک ٹانپتا بٹوا سڑکیں کھٹنے والا انہیں نمودار ہوا..... میں نے ایسے ہی سوچا..... خدا معلوم کہاں سے یہ خیال میرے دماغ میں آئیں گا اگر اس طرح سے کوئی خوب صورت لڑکی ایک رتھ گرائے اس نیت سے کہ وہ جس کے ہاتھ لگے گا وہ اس سے شادی کرے گی تو کیا ہو چکا..... ہر سکتا ہے کہ رتھ کسی پیادہ موٹر میں جا کرے..... اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آڈیو ٹاپو گرامز میں کوٹنے والے انہیں کے ڈرائیور کے پاس جا پہنچے..... ہر کھٹنے کا یہ سلسلہ کتنا دانا تھا اور کتنا دلچسپ!

میں نے اس کا ذکر اشوک اور سادک سے کیا ان کو مزہ آگیا اور مزہ لینے کی خاطر ہم نے برانڈی کا ایک اور دور چلایا اور بے غلام خیال آدھیاں شروع کر دیں۔ جب محض درخواست ہوئی تو طے پایا کہ کہانی کی بنیادیں اس خیال پر مستند کی جائیں۔

کہانی تیار ہو گئی مگر اس کی شکل پکا اور ہی تھی۔ حیدر کا لکھا ہوا رتھ نہ سڑکیں کوٹنے والا انہیں۔ پہلے پہلے خیال تھا کہ ٹریسینڈی مہرنی چائے مگر اشوک چاہتا تھا کہ کو میڈی ہو اور وہ بھی بہت ہی سبب قرار، چنانچہ دماغ کی سادی توفیق اسی طرف مرف ہونے لگیں۔ کہانی مکمل ہو گئی۔ قرا اشوک کو پسند آئی شوٹنگ شروع ہو گئی۔ اب نغمہ کا ایک ایک فریم اشوک کی ہدایات کے ماتحت تیار ہونے لگا۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ”اتھ دن“ نام وہ کمال

اشوک کی ڈاؤن کیشن کا نتیجہ تھی کہ پردے پر ڈاؤن کیشن کا نام ڈی۔ این پائی تھا جس نے اس فلم کا ایک ایچ بی ڈاؤن کٹ نہیں کیا تھا۔ بیٹی ٹائیز میں فلم ڈاؤن کٹر کو بیٹ کم اہمیت دی جاتی تھی۔ سب مل کر کام کرتے تھے۔ جب فلم ٹائٹل کے لئے پیش ہوتا تھا تو ایک کارکن کا نام بطور ڈاؤن کٹر کے پیش کر دیا جاتا تھا یہ طریقہ "کارڈسٹن" میں بھی مانج تھا۔ ڈی این پائی فلم ایڈیٹر تھا اور اپنے کام میں بہت ہوشیار چٹا کچھ متفقہ طور پر سبھی فیصلہ ہوا تھا کہ بحیثیت ڈاؤن کٹر کے اس کا نام فلم کے کریڈٹس ٹائٹلز میں پیش کیا جائے۔

اشوک جتنا اچھا کردار کار ہے اتنا ہی اچھا ہدایت کار بھی ہے اس کا علم مجھے "آٹھ دن کی شوٹنگ کے دوران میں پڑا۔ معمول سے معمولی منظر پر بھی وہ بہت محنت کرتا تھا۔ شوٹنگ سے ایک روز پہلے وہ مجھ سے نظر مال کیا ہوا سین ایٹا ادغسل لانے میں بیٹھ کر گفتگوں اس کی نوک چک پر غور کرتا رہتا یہ عجیب بات ہے کہ ہاتھ دوم کے علاوہ اور کسی جگہ وہ پوری توجہ سے فکر طلب امور پر غور نہیں کر سکتا۔

اس فلم میں چار نئے آدمی بطور ایکٹر پیش ہوئے۔ راجہ مہدی علی خاں اور چند ناٹھ اسٹاک، محسن عبداللہ، رچا سرائینا کے سابق شوہر اور دو قسم الحروف سٹے یہ ہوا کہ ایس مگر جی کو ایک رول دیا جائے گا۔ مگر وقت آئے پر وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس لئے گمان کے فلم "جل جل رہے نوجوان" میں

کیمرے کی دہشت کے باعث میں نے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر جی کو بہانہ ڈالتے آیا۔ اصل میں وہ خود کیمرے سے خوفزدہ تھے۔

ان کا رول ایک "شیل شو کٹ" فوجی کا تھا اس لئے لباس وغیرہ صاب تیار تھے۔ جب مگر جی نے انکار کیا تو اشوک بہت سٹیشیا کر ان کی جگہ اور کسے منتخب کرے۔ کئی دن شوٹنگ بند رہی۔ راتے سیاہ چرنی قال جب قال پیسے ہونے لگے تو اشوک میرے پاس آیا۔ میں چند مناظر کو دوبارہ کھو دیا تھا اس نے میز پر سے میرے کاغذ اٹھا کر ایک طرف رکھے اور کہا "پلو سنٹر"

میں اس کے ساتھ چل پر ۱۲۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے نئے گیت کی دُمن سنوانے لے جا رہا ہے مگر وہ مجھے سیٹ پر لے گیا اور کہنے لگا: پاگل کا پارٹ تم کو ملے گا۔

مجھے معلوم تھا کہ مگر جی انکار کر چکا ہے اور اشوک کو اس خاص رول کے لئے کوئی آدمی نہیں ملے گا۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ مجھ سے کہے گا کہ میں یہ رول ادا کروں، چنانچہ میں نے اُس سے کہا: پاگل ہوئے ہو، اشوک سنجیدہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ نہیں سنو تمہیں یہ رول لینا ہی پڑے گا۔ راجہ مہدی علی خاں اور ادو چندر ناتھ اشوک نے بھی اصرار کیا۔ راجہ نے کہا: تم نے مجھ کو اشوک کا بہنوئی بنا دیا حالانکہ میں شریف آدمی ہرگز اس کے لئے تیار نہ تھا کیونکہ میں اشوک کی عزت کو ہر دم پاس رکھتا ہوں۔

بن جاؤ گے تو کون سی آفت آ جائے گی؟

نے تار کے ذریعے سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی ادھوری میں چلا گیا ہوتا کہ
 مجھے ساوک کا انتظام تھا جب اشوک اور وہ دونوں بمبئی ٹائیکز میں اکٹھے ہوئے تو
 میں ان کے ساتھ تھا یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے لئے انگریزوں
 کامیوں پر نقشے بنا رہا تھا جس میں چنگی ڈال یہ بی جا لوگوں کو کھڑی ہو کر تماشا
 دیکھنے کے لئے جگہ بنا رہی تھی۔

میں نے جب بمبئی ٹائیکز میں قدم رکھا تو ہندو مسلم مساوات شروع تھے جس
 طرح کرکٹ کے میچوں میں وکٹیں اڑتی ہیں باؤنڈریاں لگتی ہیں اس طرح ان فسادوں
 میں لوگوں کے سر اڑتے تھے اور بڑی بڑی لگن لگتی تھیں۔

ساوک واپسانے بمبئی ٹائیکز کی ابتر حالت کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد
 جب انتظام سنبھالا تو اسے بہت سی شکایاں درپیش آئیں۔ غیر مزدوری عنصر کو جذبہ
 کے لحاظ سے ہندو تھا، محال باہر کیا۔ تو کافی گڑبڑ ہوئی مگر جب اس کی جگہ پر کی گئی تو
 مجھے عیسوی ہوا کہ کلیسیاں سب مسلمانوں کے پاس ہیں۔ میں تھا، شاپینٹ
 تھا، عصمت چغتائی تھی، کمال امروہی تھا، حسرت مکھنوی تھا، نذیر احمدی
 نامہ پانی تھی اور میوزک ڈائریکٹر غلام حیدر تھا یہ سب جمع ہوئے تو ہندو کارکن
 میں ساوک واپا اور اشوک کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے میں نے
 اشوک سے اس کا ذکر کیا تو ہنسنے لگا۔ میں واپا سے کہہ دوں گا کہ وہ ایک ٹانٹ
 پلاوے۔

ڈانٹ بتائی گئی تو اس کا اثر اٹا ہوا۔ واچا کو گنم خط موصول ہونے لگے کہ اگر اس نے اپنے استوڈیو سے مسلمانوں کو باہر نہ نکالا تو اس کو آگ لگا دی جائے گی۔ یہ خط واچا پڑھتا تو آگ بجھو لایا جاتا تھا۔ سارے مجھے سے کہتے ہیں کہ میں غلطی پر ہوں۔ میں غلطی پر ہوں..... میں غلطی پر ہوں تو ان کے باوا کا کیا جانتا ہے..... آگ لگائیں تو میں ان سب کو اس پر جھونک دوں گا۔

اشوک کا دل و دماغ فرقہ وارانہ تعصب سے بالکل پاک ہے وہ کہیں ان خطوط پر سوشل ہی نہیں سکتا تھا۔ جن پر آگ لگانے کی دھمکیاں دینے والے سر جتے تھے وہ مجھ سے ہمیشہ کہتا: منشور یہ سب دیوانگی ہے..... اُمہتہ اُمہتہ دودھ ہر جائے گی۔

مگر اُمہتہ اُمہتہ دودھ ہونے کے بجائے یہ دیوانگی جیستی ہی چلی جا رہی تھی....
... اور میں خود کو مجرم محسوس کرنا تھا اس لئے کہ اشوک اور واچا میرے دوست تھے۔ وہ مجھ سے شور سے لیتے تھے اس لئے کہ ان کو میرے خطوط پر بھروسہ تھا۔ لیکن میرا یہ خطوط میرے اندر سکڑ رہا تھا.... میں سر ہٹا تھا اگر بیٹے ٹائیکڑ کو کچھ ہو گیا تو میں اشوک اور واچا کو کیا منہ دکھاتاؤں گا۔

فتنات زوروں پر تھے ایک دن میں ادا اشوک بھی ٹائیکڑ سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں اس کے گھر دیکھ بیٹھے رہے۔ شام کو اس نے کہا۔ چلو میں تمہیں چھوڑاؤں.... شدت کش کی خاطر وہ سوڑ کو ایک خالص اسلامی محلے میں

لے گیا..... سامنے سے ایک برأت آ رہی تھی جب میں نے بینڈ کی آواز سنی تو میرے اوسان خطا ہو گئے۔ ایک دم اشوک کا ہاتھ پکڑ کر میں چلا آیا۔ وادامنی۔ یہ تم کو صراخے؟

اشوک میرا مطلب سمجھ گیا۔ مسکرا کر اس نے کہا: کوئی ٹکڑہ کرو۔ میں کیونکر ٹکڑہ کرتا۔ موٹر ایسے اسلامی محلے میں تھی۔ جہاں کسی ہندو کا گزر ہی نہیں ہو سکتا تھا اور اشوک کو کون نہیں پہچانتا تھا کون نہیں جانتا تھا کہ وہ ہندو ہے..... ایک بہت بڑا ہندو جس کا قتل سر کر خیز ہوتا..... مجھے عربی زبان میں کوئی دیا نہیں تھی۔ قرآن کی کوئی موزوں و مناسب آیت بھی نہیں آتی تھی۔ دل ہی میں میں اپنے اور پلستین صبح رہا تھا اور دھڑکتے ہوئے دل سے اپنی زبان میں بے جوڑی دعا مانگ رہا تھا کہ اے خدا مجھے سرخرو رکھو..... ایسا نہ ہو کوئی مسلمان اشوک کو مار دے۔ اور میں ساری عمر اس کا غن اپنی گردن پر محسوس کرتا رہوں۔ یہ گردن قوم کی نہیں میری اپنی گردن تھی مگر یہ ایسی ذلیل حرکت کے لئے دوسری قوم کے سامنے خداست کی وجہ سے جھکنا نہیں چاہتی۔

جب موٹر بات کے جلسوں کے پاس پہنچی تو لوگوں نے چلنا شروع کر دیا "اشوک کمار..... اشوک کمار" میں بائیں رخ ہو گیا۔ اشوک اشیرنگ پر ہاتھ رکھے خاموش تھا میں خوف ہراس کی سبب لہجہ کے بدلنے سے یہ کہنے والا تھا کہ

لکھنے فرمئے

دیکھو ہر شے کرو۔ میں مسلمان ہوں۔ یہ مجھے میرے گھر چھوڑنے جلدی ہے۔۔۔ کہہ دو تو جوانوں نے آگے بڑھ کر بٹے آرام سے کہا: اشوک جان آگے راستہ نہیں ملے گا ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ:

اشوک پھاٹا؟ اشوک ان کا بھائی تھا۔ اود میں کون تھا؟۔۔۔ میں نے دفعۃً اپنے لباس کی طرف دیکھا جو کھادی کا تھا۔۔۔۔۔ معلوم نہیں اتھوں سے مجھے کیا بھیا ہو گا مگر ہر سکتا ہے گا انہوں نے اشوک کی موجودگی میں مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔

موٹر میں اس اسلامی محلے سے نکل تو میری جان میں جان آئی میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اشوک ہنسنا تم خواہ مخواہ گھبرائے۔۔۔۔۔ ٹوٹنٹوں کو یہ لوگ کچھ نہیں کہا کرتے:

چند روز بعد بجے ٹائیکزیں نذیرا جھیری کی کہانی راجہ محبوب کے نام سے فلم بند ہوئی آپر میں نے جب کڑی نکتہ چینی کی اود اس میں کچھ تبدیلیاں کرنا چاہیں، تو نذیرا جھیری نے اشوک اود دوا چاسے کہا:۔۔۔۔۔ منٹو کو آپ ایسے باختر کے دوران میں نہ جھٹایا کریں وہ چوٹو خود افسانہ نویس ہے اس لئے متعصب ہے۔

میں نے بہت غور کیا۔ کچھ کچھ میں نہ آیا۔ آخر میں نے اپنے آپ سے کہا منٹو بھائی۔۔۔۔۔ اگلے راستہ نہیں ملے گا۔۔۔۔۔ موٹر روک لو۔۔۔۔۔ ادھر باجو کی گلی سے چلے جاؤ:

اود میں چپ چاپ باجو کی گلی سے پاکستان چلا آیا جہاں میرے افسانے نے ٹھنڈا اگرشتہ پر مقدمہ چلایا گیا۔

زنگ

عرصہ ہوا۔ لواب پختا دی کی صاحب زادی تسنیم (مستر تسنیم سلیم) نے
مجھے ایک خط لکھا تھا۔

• تو کیا خیال ہے آپ کا اپنے بہنوئی کے متعلق؟ وہ جو خاندانہ
آپ کی طرف سے لگا کر رہتے ہیں تو مجھے اپنے لئے خدا دی مرگ
کا انڈیلٹ ہوا جاتا ہے۔ اب میں آپ کو تفصیل سے بتا دوں گا کہ
یہ حضرت مجھے آپ کے نام سے چھیڑا کرتے تھے اور ان کا
تخیال تھا کہ جب وہ میرے نادیمہ بھائی سے ملیں گے، تو
نہ جانیں کیا کیا حماقتیں سرزد ہوں گی... اور مجھے شرمندگی
ہرگز اور اب پر سوں سے متصور ہیں کہ بیٹی جن کو خوش سے ملو۔

علاقات نفس وادہ بقول تسنیم کے وہ میرے بہنوئی تھے اس لئے ان کی خاطر داری کے سوا ادہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ گھر میں جو حاضری تھا ان کو ادان کے معاصیوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ فلم سے متعلق لوگوں کے پاس ایک ٹھننے کی چیز شہر تنگ ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ بھی ان کو شہری ساؤنڈ اسٹوڈیو میں رکھا دی گئی۔ غالباً ”پھول“ ٹھنی جیسے ڈائریکٹر و مانیٹر یعنی آصف بنا رہا تھا۔

سلیم اداؤن کے ساتھیوں کو بنظائر سلطان پر جانا چاہیے تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنا پروگرام بنا کر بیٹے پیسے تھے۔ سلیم نے یہیں تذکرہ مجھ سے پوچھا کہیں صاحب زرگیں کہاں ہوتی ہے۔ آج کل؟

میں نے اندازہ مذاق کہا: اپنی مل کے پاس۔

میرا مذاق غیر طبعی موت کی گود میں چلا گیا۔ جب میرے مہمانوں میں سے ایک نے بڑی قزاقانہ سلوہ لوسی سے کہا: ”جتن بائی کے پاس؟“

”جی ہاں“

سلیم نے پوچھا: کیا اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ میرا یہ مطلب ہے کہ میرے یہ دوست اس کو دیکھنے کے بہت شوق میں ہیں۔ کیا آپ اس کو چاہتے ہیں؟

میں نے جواب دیا: جاسا نہیں۔۔۔۔۔ مگر معمولی سا۔

ایک صاحب نے ہر سے ڈسب انداز میں سوال کیا: کیوں؟

”اس نے کون سے اور مجھے ایسی تک کسی فلم میں اکٹھے کام کرنے کا موقع نہیں ملا؟“
 سلیم نے یروش کر کہا؟ ”تو جھوٹے..... ہم آپ کو خواہ مخواہ تکلیف
 دینا نہیں چاہتے۔“

لیکن میں خود زگس کے ٹان جانا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ راولہ کیا مگر اکیلا جانا مجھے پسند
 نہیں تھا۔ ساتھ ملنا تو تھا مگر نہایت ہی بے ہودہ۔ یعنی وید سے بھاڑ بھاڑ کر گھر کرنے
 والا۔ اب موقع تھا آدمی سادہ لون تھے۔ مجھیں میاشی کے طور پر زگس کو
 ایک نظر دیکھنا چاہتے تھے تاکہ ”پلس“ اپنی جاگیروں اور ریاستوں میں جا کر
 اپنے دوستوں اور معاصروں کو شہود فلم اسٹڈیوز کے چشم دید حالات
 سنائیں۔ چنانچہ میں نے سلیم سے کیا؟ ”تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ چلتے ہیں۔ لیکن
 بے ملاقات ہر جائے۔“

میں زگس سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ بجے میں اتنی ایکڑ میں تھیں جن کے ٹان
 میں جب چاہتا تھا اسکا سکتا تھا۔ مگر خاص طور پر زگس سے ملنے کا کیا مطلب تھا؟
 میرا خیال ہے اس کا جواب دینے سے پہلے میں آپ کو ایک دلچسپ
 واقعہ سنا دوں۔

میں فلستان میں ملازم تھا۔ صبح جاتا تو شام کو آٹھ کے قریب لوٹا ایک ہفتہ
 اتفاق سے ایسی جلدی ہوئی۔ یعنی میں دوپہر ہی کے قریب گھر پہنچ گیا بعد ازاں
 میرا تو ساری فضا مرقعش نظر آئی۔ جیسے کوئی سڑک کے کنارے کو چھوڑ کر خود چھپ گیا ہے

ڈورنگ ٹینس کے پاس میری دو سائیاں کھڑی بٹھا ہوا اپنے بال کو نچوڑ رہی تھیں۔
مگر آج کی انگلیاں ہوا میں چل رہی تھیں۔ ہونٹ دونوں کے پھر پھر اڑ رہے تھے
مگر آواز نہیں نکلتی تھی دونوں میں جی کر گھبراہٹ کی ایسی تصویر پیش کر رہی تھیں جو
اپنی گھبراہٹ پر چھپانے کی خاطر بے مطلب دوپٹے اوڑھنے کی کوشش کر رہی ہر طرف
کمرے کے دروازے کا پردہ اندھ کی طرف دبا ہوا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا دونوں بنوں نے ایک دوسرے کی طرف تصورات
ننگیوں کی طرف دیکھا۔ ہولے ہولے کھسک پھسکی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے
کہا: "سچا جی سلام!"

"وعلیکم السلام" میں نے غور سے ان کی طرف دیکھا کیا بات ہے؟
میں نے سوچا کہ سب کچھ کرنا جا رہی ہیں۔ دونوں نے میرا سوال سن کر پھر
کھسک پھسکی پھر ایک دم کھلکھلا کر بنیں اور دوسرے کمرے میں بھاگ گئیں۔
میں نے سوچا کہ شاید انہوں نے اپنی کسی سہیلی کو مدعو کیا ہے۔ وہ آنے
والی ہے۔ اور چونکہ میں غیر متوقع طور پر طبعی جلا آیا ہوں اس لئے ان کا پروگرام دھم
برہم ہو گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں کچھ دیر تک تینوں بنوں میں سرگوشیاں ہوتی رہی ہیں
وہاں وہی ہنسی کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے جڑی بہن یعنی میری
بیوی بٹھا ہوا اپنی بنیں سے مخاطب، مگر دراصل مجھے سناتے کے لئے یہ

ہستی ہوئی باہر نکل۔ مجھے کیا کہتی ہو۔ کہنا ہے تو خود اُن سے کہو۔۔۔۔۔ سادات صاحب آج بہت جلدی آگئے؟

میں نے وجہ بیان کر دی کہ اسٹوڈیو میں کرنی کام نہیں تھا اس لئے چلا آیا۔ پھر لڑائی ہوئی سے پوچھا: ”کیا کہنا چاہتی ہیں میری سالیوں؟“
”یہ کہنا چاہتی ہیں کہ نرگس آدمی ہے۔“

”تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ آئے کیا وہ پہلے کبھی نہیں آئی؟“

میں سمجھا کہ وہ اُس پارسی لڑکی کی بات کر رہی ہے جس کی ماں نے ایک مسلمان سے شادی کر لی تھی اور ہمارے چٹوس میں رہتی تھی۔ مگر میری بیوی نے کہا: ”ہائے اور پہلے کب ہمارے ڈاں آئی ہے؟“
”تو کیا وہ کوئی اور نرگس ہے؟“

”ہی نرگس ایکٹرس کی بات کر رہی ہوں؟“

میں نے تعجب سے پوچھا: ”وہ کیا کرنے آدمی ہے یہاں؟“

میری بیوی نے مجھے سارا قصہ سنایا۔ گھر میں ٹیلیفون تھا جسے تینوں بیہنیں فرصت کے اوقات میں بڑی فراخ دلی سے استعمال کرتی تھیں۔ جب اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی کرتی تھک جاتیں تو کس ایکٹرس کا نمبر گھادیتیں وہ مل جاتی تھیں اس سے آڈٹ پٹانگ گفت و گو شروع ہو جاتی۔۔۔۔۔ ہم آپ کی بہت مدد میں آج ہی دلی سے آئی ہیں۔ بڑی شکلوں سے آپ کا نمبر حاصل کیا ہے آپ سے

فران آتے ہوں گے۔ مگر یہ تین لوگیاں ان سے کچھ مختلف تھیں اس لئے وہ سخت بے چین تھی کہ ان کی اصلیت جانے اور ان سے ملے جلے چنانچہ جب بھی اُسے معلوم ہوتا کہ ان پر اسرارِ نوکیلوں نے اُسے جادو سے تروہ سوکام چھوڑ کر آتی اور بہت دیر تک ٹیلیفون کے ساتھ چپکے رہتی۔

ایک دن نرگس کے پیسہ ہمارے پر ہاتھ لگے ہو گیا کہ ان کی ملاقات ہو کے رہے گی میری بیوی نے اپنے گھر کا پتا اچھی طرح سبھا دیا اور کہا کہ اگر پھر یہی مکان ٹھہریں دقت ہو تو بائی کھڑ کے پن کے پاس کس جوتی سے ٹیلی فون کر دیا جائے۔ وہ سب وہاں پہنچ جائیں گی۔

جب میں گھر میں داخل ہوا۔ بائی کھڑ کے ایک اسٹور سے نرگس نے فران کیا تھا کہ وہ پہنچ چکی ہے مگر مکان نہیں مل رہا۔ چنانچہ تینوں افراد قری کے عالم میں تیار ہو دی تھیں کہ میں بلائے ناگیا کی طرح پہنچ گیا۔

چھوٹی دو کا خیال تھا کہ میں ناراض ہوں گا بڑی لیکن میری بیوی بعض بوکھلائی ہوئی تھی کہ یہ سب کیا ہوا ہے.... میں نے ناراض ہونے کی کوشش کی مگر مجھے اس کے لئے کوئی معقول جواب نہ ملا۔ سارا فقرہ کان پر لچپ اور بے حد معصوم تھا۔ اگر کان مچولی کی یہ حرکت صرف میری بیوی سے مراد ہوئی ہوتی تو بالکل جدا بات تھی۔ ایک سال آدھ گھروالی ہوتی ہے اور یہاں دو سالیاں تھیں پورا گھر ان کا تھا میں جب اُٹھا تو دوسرے کمرے میں خوش ہونے اور تالیاں

میں تم سے کیا کہوں جب ٹیلیفون آتا۔ ہلکی ہلکی ہانسی..... میں ہزدو چھتی یہ کہن
 ہے جس سے اتنی دیر میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں مجھے کہتی کوئی ہیں۔ جانتی نہیں کون
 ہیں۔ مگر ہی جی اچھی۔ روایک بار میں نے بھی ٹیلی فون آٹھایا۔ گفت گو ماشاء اللہ
 جی شائستہ تھی کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ مگر صاف کرنا کہ نہت اپنا ہم پتا
 صاف بتاتا ہی نہیں تھیں کہ کہ ہے بل اُن خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ کہنے لگی لیلی
 انہوں نے بلایا ہے۔ اپنا ایڈریس دے دیا ہے۔ میں نے کہا، پاگلی جی ہو
 منتر جانے کون ہیں۔ کون جنہیں ہیں۔ پر اس نے میری ایک ڈھائی بس پیچھے
 چوکنی چنانچہ مجھے ساتھ آتا ہی پڑا..... خدا کی قسم اگر معلوم ہو جا کہ یہ آتھیں تھارے
 گھر کی ہیں.....

میں نے بات کاٹ کر دیا: "تو ساتھ آپ نازل نہ ہوتیں؟
 جہن بائی کے کتے ہیں دے ہوئے پان میں چوڑی سکراہٹ پیدا ہوئی ہی
 کی ضرورت ہی کیا تھی..... میں کیا کہیں جانتی نہیں۔
 مرحومہ کو اردو ادب سے بڑا شغف تھا میری تحریریں بڑے شوق سے
 پڑھتی اور پسند کرتی تھیں ان دنوں میرا ایک مضمون "ساتھ" میں شائع ہوا تھا۔
 غالباً ترقی یافتہ قبرستان، معلوم نہیں اس کا ذہن کیوں اس طرف پھا گیا خدا کی
 قسم منتر..... بہت خوب لکھتے ہو۔ غلام کیا طنز کیا ہے اس مضمون میں..... کیوں ہے بل
 اس دن کیا حال ہوا تھا میرا یہ مضمون پڑھ کر؟

مگر ڈنگس اپنی نادیدہ سہیلیوں کے متعلق سوچ رہی تھی۔ اضطرابِ جبرے
بہر میں اس نے اپنی ماں سے کہا: چلو بانی!

جتن بانی مجھ سے مخاطب ہوئی: چلو بانی!

گھسٹاؤں ہی تھا۔ موٹر اشارت ہوئی اور ہم بیچ گئے۔ اوپر باگمن سے تینوں
بہنوں نے ہمیں دیکھا۔ چھوٹی دو کامرے خوشی کا مجرا حال ہوتا تھا خدا معلوم آپس
میں کیا کھسک پھڑک رہی تھیں۔ جب ہم دروازہ پر پہنچے تو عجیب و غریب طریقے پر سب
کی عذات ہوئی ڈنگس اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ حد میں میری
بیوی اور جتن بانی وہیں بیٹھ گئے۔

بہت دیر تک مختلف زاویوں سے کان چول کے سطلے پر مبصر کیا گیا میری بیوی
کو جو کھا ہٹ جب کسی قدر کم ہوئی تو اس نے میزبان کے فرائض سرالہام
دینے شروع کر دیئے۔

میں اور جتن بانی نغمہ اند شریں کے حالات پر تبادلہٴ خیالات کرتے رہے
پان کھالے کے معاملے میں بڑی خوش ذوق تھی۔ ہر وقت اپنی پسند نبیا ساتھ
رکھتی تھی۔ بڑی دیر کے بعد موقع ملا تھا۔ اس لئے میں نے اس پر خوب مائع
صاف کیا۔

ڈنگس کو میں نے ایک مدت کے بعد دیکھا تھا۔ دس گیارہ برس کی تھی جب
میں نے ایک دو مرتبہ نعلوں کی ناٹشیں غلطی میں اسے اپنی ماں کی انگلی کے ساتھ

پہنچ دیکھا تھا چند حیاتی ہوتی آنکھیں بے کشش سا لمبو ترا چہرہ۔ سوکھی سوسلی
 ٹانگیں ایسا معلوم ہوتا تھا سوکے اُٹھنے والے یا سونے والے بے گراں بدہ ایک جلن زد
 تھی۔ عمر نے اس کی خالی جگہیں پُر کر دی تھیں۔ مگر آنکھیں وہیں کی وہیں تھیں۔ چہرے اور
 خواب زدہ۔۔۔ جلد بیاڑ۔۔۔ میں نے سوچا اس رعایت سے اس کا نام گرس
 موزوں و مناسب ہے۔

طبیعت میں نہایت ہی معصوم کھنڈ پان تھا۔ بار بار اپنی ناک پر پھنسی تھی جیسے
 اذلی دکام کی شکایہ دہرست میں اس کو ادا کے طہ پر پیش کی گیا ہے، مگر اس کے
 اداس اداس چہرے سے صاف عیاں تھا کہ وہ اپنے اندر کردار نگاہی کا جوہر دکتا ہے
 ہونٹوں کو کئی قدر صیقل کرات کرنے اور سکڑنے میں گوبنی ہر ایک بناوٹ تھی مگر صاف
 پتا چاتا تھا کہ یہ بناوٹ سنگار کا روپ اختیار کر کے رہے گی آخر کردار نگاہی کی بنیادیں
 بناوٹ ہی پر استوار ہوتی ہیں۔

ایک بات جو خاص طور پر میں نے محسوس کی وہ یہ ہے کہ گرس کو اس بات کا
 لاطی احساس تھا کہ وہ ایک دن بہت بڑی استاد بننے والی ہے مگر یہ دن قریب تر
 لانے اور آسے دیکھ کر خوش ہونے میں اسے کوئی عجلت نہ تھی اس کے علاوہ
 اپنے لڑکپن کی نشتی مٹی خوشیاں گھسیٹ کر بڑی بڑی بے جنگم خوشیوں کے دائرے
 میں نہیں لے جانا چاہتی تھی۔

تینوں ہم عمر لڑکیاں دوسرے کمرے میں جو بائیں کمرے ہی تھیں ان کا دائرہ

کہ ٹانپنے لگی اور کھڑی ہو گئی۔ اب کھڑے سینڈل مار رہے ہیں میں نے کہا آپ جا بیٹھے۔ میں تو صفحہ کے پاس بیٹھی ہوں۔

جذ بن بائی غالباً کسی نواب کی بات کر رہی تھیں جو بہت ریاض تھا آپاسادات کی وجہ سے یہ بات ممکن نہ ہو سکی۔ جب پھر شروع ہوئی تو آپاسادات نے بھی اس میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ کاشیا واڑ کی قریب قریب تمام ریاستوں اور ان کے قواہل کو وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔ کیونکہ ریاست مانرول کے نواب ایل خان میں بیٹھی گئی تھیں۔

جذ بن بائی اپنے پیشے کی وجہ سے تمام والیان ریاست کو اچھی طرح جانتی پہانتی تھیں۔ باتوں باتوں میں ایک بڑی ریاست خورم کی طوائف کا ذکر چھڑ گیا۔ آپاسادات شروع ہو گئیں۔ ”خدا ان سے محفوظ رکھے۔ جس کے ساتھ چھٹی ہیں۔ اس کو دین کا رکھتی ہیں نہ دنیا کا۔ دولت برباد۔ صحت برباد۔ عورت برباد۔ مسخر طعن میں تمہیں کیا بتاؤں، سو بیادوں کی ایک بیلری ہے یہ طوائف۔“

میں اور میری بیوی سخت پریشان کہ آپاسادات کو کیسے روکیں۔ جذ بن بائی بڑی فراخ دلی سے آپاسادات کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی اور ہم دونوں پسینہ پسینہ ہونے جا رہے تھے ایک دو بار میں نے ان کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ اور زیادہ جوش میں آ گئیں۔ جی بھر کے گالیاں دینے لگیں۔ لیکن یک لخت انہوں نے جذ بن بائی کی طرف دیکھا ان کے سفید گوشت بھرے چہرے پر ایک

عجیب و غریب تھر تھری پیدا ہوئی۔ ان کی ناک کی کیں کا سیرالوہان کی جنبش کے ساتھ دو تین دفعہ بڑی تیزی سے چمکا اور پھر ان کا منہ کھلا۔ خود سے اپنی دالوں پر دو ہتھ مار کر انہوں نے تسلاتے جھٹے بے میں جتن بائی سے کہا: ”آپ؟“
 آپ تو جتن آپ جتن بائی ہیں نا؟

جتن بائی نے بڑی متانت سے جواب دیا: ”جی ہاں!“
 آپا سادات کا منہ اور زیادہ کھلا۔ اور تو آپ میرا مطلب ہے کہ آپ تو بہت ادنیٰ طوائف ہیں۔ کیوں صفو جان؟ صفو جان برف ہو گئی۔ میں نے جتن بائی کی طرف دیکھی اور سکا ریا۔ میرا خیال ہے بہت ہی وابستہ قسم کی سکرامنٹ تھی۔ جتن بائی نے یوں ظاہر کیا جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور اس جی ریاست خود قسم کی طوائف کے اچھا حالات بیان کرنے شروع کر دیے جن کا ذکر چھوٹے پر آپا سادات کو بھر دیا پڑا ہے۔

جتن بائی کی کوشش کے باوجود بات نہ چلی۔ آپا سادات کو اپنی غلطی کا اور میں اپنی خفت کا بہت ہی شدید احساس تھا مگر جب لوکیاں لگیں تو قضا کا تقدّر دور ہو گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد زگرس سے فرمائش کی گئی کہ وہ گانا سنائے۔ اس پر جتن بائی نے کہا: ”میں نے اس کو موسیقی کی تعلیم نہیں دی مگر میں بالواس کے خلاف تھے اور سچ پوچھیے تو مجھے بھی پسند نہیں تھا۔“
 تھوڑا بہت ٹھن ٹھن کر لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی بیٹی سے مخاطب ہوئی

”سنا دو جے لی..... جیسا بھی آتا ہے سنا دو“

زگس نے بڑی ہی مصعومانہ بے تکلفی سے گانا شروع کر دیا... پہلے بچے کی کن ٹری تھی آواز میں دس نہ لڑج، میری چھوٹی سالی اُس سے لاکھوں دیرے بہتر گاتی تھی مگر ٹرائٹس کی گٹھی تھی اور وہ بھی بڑی پراسرار اس لئے دو تین منٹ تک اس کا گانا برداشت کرنا ہی پڑا۔ جب اُس نے ختم کیا تو سب نے تیراف کی ہیں اور آپا سادات خاموش رہے تھوڑی دیر کے بعد جہان باقی نے رخصت چاہی۔ لڑکیاں زگس سے گلے ملیں۔ دوبارہ ملنے کے وعدے وغید ہوئے۔ کچھ گھسٹ پھر بھی ہوئی اور بھارے مہان چلے گئے۔

زگس سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ لڑکیاں ٹیلی فون کرتی تھیں اور زگس اکہل موٹر میں چلی آتی تھی۔ اس آمدورفت میں اس کے ایکٹریں مہانے کا احساس قریب قریب مٹ گیا۔ وہ لڑکیوں سے اور لڑکیاں اُس سے جوں جتن تھیں جیسے وہ ان کی بہت پرانی بیٹی ہے یا کوئی رشتہ دار ہے لیکن جب وہ چلی جاتی تو کبھی کبھی تینوں بہنیں اس استعجاب کا اظہار کرتیں۔ خدا کی قسم عجیب بات ہے کہ زگس بالکل ایکٹریں معلوم نہیں کرتی۔

اس دوران میں تینوں بہنوں نے اس کی ایک تازہ فلم دکھائی جس میں نکلا ہے کہ وہ اپنے بیرو کی محبوبہ تھی جس سے وہ پیار کی باتیں کرتی اور کسے

عجیب عجیب نگاہوں سے دیکھتی تھی اس کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوتی تھی اس کا ہاتھ دباتی تھی میری میری کہتی تھی کہ بہت اُس کے نراق میں کہیں لمبی لمبی آہیں جھری تھیں۔ جیسے سچے چمے اُس کے عشق میں گر جا رہے اور اُس کی چھوٹی دوہیں اپنے کندھارے ایکٹنگ سے نا آشنا دلوں میں سوچتیں تھیں اور کہ وہ ہم سے پوچھ رہی تھی کہ گرا کی ٹوٹی کیسے بنائی جاتی ہے۔

زگرس کی اداکاری کے متعلق میرے خیال بالکل مختلف تھا وہ قطعی طور پر جذبات و احساسات کی صحیح عکاسی نہیں کرتی تھی۔ محبت کی بغض کس طرح جلتی ہے یہ انٹاری انگلیاں کیسے محسوس کر سکتی تھیں عشق کی دوڑ میں تھک کر ٹائٹا اور اسکول کی دوڑ میں تھک کر سانس کا پھول جانا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں میرے خیال ہے کہ خود زگرس بھی اس کے فرق سے آگاہ نہیں تھی اس کے شروع شروع کی فلموں میں چنانچہ دقیقہ دس نگاہیں فوراً معلوم کر سکتی ہیں کہ اس کی اداکاری کیسے فریب کاری سے معرا تھی۔

تصنع کا یہ کمال ہے کہ وہ تصنع معلوم نہ ہو لیکن زگرس کے تصنع کی بنیادیں چونکہ تجربے پر استوار نہیں تھیں اس لئے اس میں یہ خرابی نہیں تھی۔ یہ صرف اس کا خلوص تھا وہ بے پناہ خلوص جبراً سے اپنے شوق سے تھا کہ وہ جذبات و احساسات کے نہایت ہی خام اظہار کے باوجود اپنا کام نبھا جاتی تھی علیرود تجربے کے ساتھ ساتھ وہ بہت پختگی اختیار کر چکی ہے اب اس کو عشق کی دوڑ میں

مومن باپ ایک بڑے رئیس زادہ تھے جہن بائی کے گھر کی تانوں اور مرکبوں میں ایسے اچھے کوہن دنیا کا ہوش نہ رہا غریب و ست تھے صاحب ثروت تھے اعلیٰ یافتہ تھے۔ صحت مند تھے مگر یہ سب دولتیں جہن بائی کے در پر غفلت اور گدگد گرہن گشتیں جہن بائی کے نام کا اُس زمانے میں ڈنکا بجتا تھا۔ بڑے بڑے نواب اور راجے اُس کے محروں پر سونے اور چاندی کی بارشیں برساتے تھے مگر جب بادشاہیں قسم جاتی ہیں اور آسمان ٹکھڑا جاتا تو جہن بائی اپنے مومن کو اٹھا کر سینے سے لگاتی کہ اسی مومن کے پاس اس کا تن تھا۔

مومن باپ تدارم آخر جہن بائی کے ساتھ تھے وہ ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ اس لئے کہ وہ راجوں اور نوابوں کی دولت میں غریبوں کے غم کی بڑی سنگم جلی تھی اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ اُن کے عشق کا دھارا ایک ہی سمت نہیں بہتا۔ وہ مومن باپ کو محبت کرتی تھی کہ وہ اُس کے بچوں کا باپ تھا۔

خیالات کی دلی میں جانے کہ صبر سہ گیا۔ زرگس کو جہ جہال و کیش میں بننا تھا چنانچہ وہ بن گئی اس کے باہم عروج تک پہنچنے کا راز جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کا نہیں ہے جو قدم بہ قدم منزل بہ منزل اس کے ساتھ رہا ہے۔

ایک بات جہاں علاقوں میں خاص طور میں محسوس کی وہ یہ ہے کہ زرگس کو اس بات کا احساس تھا کہ جن لوگوں سے وہ ملتی ہے وہ جدا قسم کے آب و گل سے بنی ہیں وہ آں کے پاس آتی تھیں۔ گھنٹوں ان سے معصوم معصوم

باقی کرتی تھی۔ مگر وہ اُن کو اپنے گھر مدعو کرنے میں ایک عجیب قسم کی جھجک محسوس کرتی تھی اس کو شاید یہ ڈر تھا کہ وہ اس کی دعوت ٹھکرا دیں گی یہ کہیں آگے نہ بڑھے گی اس کے یہاں کیے جاسکتی ہیں میں ایک دن گھر پر موجود تھا کہ اس نے سرسری طور پر اپنی سہیلیوں سے کہا: اب کہیں تم بھی ہمارے گھر آؤ؟

یہ سُن کر تینوں سہیلیوں نے بڑے ہی ہنسنے پر اُن سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ ہم زگرس کی یہ دعوت کیسے قبول کر سکتی ہیں لیکن میری بیوی چونکہ میرے خیالات سے واقف تھی اس لئے ایک روز زگرس کے سہیم اصرار پر اُس کی دعوت قبول کر لی گئی اور مجھے بتائے بغیر تینوں اُس کے گھر چلی گئیں۔

زگرس نے اپنی کار صبح دی تھی جب وہ بجے کے خوبصورت ترین تمام میرین ڈرائنگ کے اُس فلیٹ میں پہنچیں۔ جہاں زگرس رہتی تھی تو اسٹوں نے محسوس کیا کہ ان کی آمد پر خاص انتظامات کیے گئے تھے۔ سوچیں بالواسطہ اُس کے دوست جو ان لوگوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ وہ گھر میں داخل نہ ہوں۔ کیونکہ زگرس کی سہیلیاں آدمی میں مردانہ کردار کو جس اس کمرے میں آنے کی اجازت نہیں تھی جہاں ان معزز مہمانوں کو بٹھا دیا گیا تھا خود جتن بااثر تصویق دینے کے لئے رسمی طور پر ان کے پاس بیٹھی اور اندر چلی گئی۔ وہ اُن کی معصوم گفت گوئیوں میں خاموش نہیں ہونا چاہتی تھی۔

تینوں سہیلیوں کا بیان ہے کہ زگرس اُن کی آمد پر سچائی و سہاٹی تھی وہ اس قدر

عروش تھی کہ بادِ گھبراہٹ جاتی تھی۔ اپنی سہیلیوں کی خاطر دلدی میں اس نے بڑے جوش کا اظہار کیا۔ پاس ہی پیرنڈین ڈبیری تھی اس کے "ٹک ٹیک" "شہود تھے گاڑی میں جا کر زرگس خود یہ مشروب جگ میں تیار کر کے لائی کیونکہ وہ یہ کام نوکر کے سپرد کرنا نہیں چاہتی تھی اس لئے کہ چھلر کے اندر آنے کا احتمال تھا۔

خاطر دلدی کے اس جوش و غروش میں زرگس نے اپنے نئے میڈٹ کا کلاس توڑ دیا۔ مہانوں نے انکس کا اظہار کیا تو زرگس نے کہا بھگونی بات نہیں بنی ہی تھی یہاں گی مگر ڈبیری ان کو چپ کرادیں گے اور معاملہ رفع دفع ہو جائے گا۔

موسن بالبو کو اس سے اور اس کو موسن بالبو سے بہت محبت تھی۔

"ٹک ٹیک" چلانے کے بعد زرگس نے مہانوں کو اپنا البم دکھایا جس میں اس کے مختلف نمونوں کے اشل تھے۔ اس زرگس میں جو ان کو یہ فریوڈ دکھادی تھی اور اس زرگس میں جو ان تصویروں میں موجود تھی کتنا فرق تھا۔ تینوں بیبیں کبھی اس کی طرف دیکھتییں اور کبھی البم کے اوراق کی طرف اور اپنی حیرت کا یوں اظہار کرتیں۔

"زرگس۔ تم یہ زرگس کیسے بن جاتی ہو؟"

زرگس جواب میں صرف مسکراتی۔

میری بیوی نے مجھے بتایا کہ گھر میں زرگس کی ہر حالت، ہر ادا میں الٹ پرت تھا۔ اس میں وہ شوخی، وہ طرازی، وہ نیکیاہن نہیں تھا جو اس کے سراپا میں پردے پر نظر آتا ہے وہ بڑی ہی گھر پر قسم کی لڑکی تھی میں نے خود ہی محسوس

کیا تھا۔ لیکن جانے کیوں اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں مجھے ایک عجیب و غریب قسم کی اداسی تیرتی نظر آتی تھی۔ جیسے کوئی لادار سف لاش، تالاب کے شہرے پانی پر جوا لے چکے بلکہ جھونکوں سے اور تلاش پذیر ہے۔

یہ قطعی طور پر طے تھا کہ شہرت کی جس منزل پر نرگس کو پہنچنا تھا وہ کچھ زیادہ دور نہیں۔ تقدیر اپنا فیصلہ اس کے حق میں کہہ کے تمام متعلقہ کاغذات اس کے حوالے کر چکی تھی لیکن پھر وہ کیوں مغموم تھی کیا غیر شعوری طور پر وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ عشق و محبت کا یہ مصنوعی سمیں کھیلنے کھیلنے ایک دن وہ کسی ایسے لائق و دوق صحرا میں نکل جائے گی۔ جہاں سڑاب ہی سڑاب بہل گے پیاس سے اُس کا حلق سوکھ رہا ہو گا اور آسمان پر چھوٹی چھوٹی بدلیوں کے تھنوں میں صرف اس لئے دودھ نہیں اُترے گا کہ وہ یہ خیال کریں گے کہ نرگس کہ پیاس محض بناوٹ ہے زمین کی کوکھ میں پانی کی بوندیں اور زیادہ اندر کو سمٹ جائیں گی اس خیال سے کہ اُس کی پیاس صرف ایک دکھاوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود نرگس بھی یہ محسوس کرنے لگے کہ میری پیاس کیسے چھوٹی پیاس تو نہیں۔

اتنے برس گزر جانے پر میں اب اُسے پر دے پر دیکھتا ہوں تو مجھے اس کی اداسی کچھ متحمل سن نظر آتی ہے۔ چہے اس میں ایک مستعد جستجو تھی لیکن اب یہ جستجو بھی اداس اور مضمحل ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب خود نرگس ہی

دے سکتی ہے۔

تینوں بہنیں چونکہ جلدی جلدی رگس کے ہاں گئی تھیں۔ اس لئے وہ زیادہ تر ملک اس کے پاس نہ بیٹھ سکیں۔ چھوٹی دو کو یہ اندیشہ تھا کہ ایسا نہ ہو مجھے اس کا علم ہو جائے چنانچہ انہوں نے رگس سے رخصت چاہی۔ اور واپس گھر آ گئیں۔

رگس کے متعلق وہ جب بھی بات کرتیں۔ مگرم پھر کر اس کی شادی کے مسئلے پر آ جاتیں۔ چھوٹی دو کو یہ جاننے کی خواہش تھی کہ وہ کب اور کہاں شادی کرے گی۔ بڑی جس کی شادی جوئے پانچ برس ہو چکے تھے۔ یہ سوچتی تھی کہ شادی کے بعد وہ ہاں کیسی بنے گی۔

کچھ دیر تک میری بھری نے رگس سے اس خفیہ ملاقات کا حال چھپائے رکھا آخر ایک روز بتا دیا۔ میں نے مصنوعی حسرتی کا اظہار کیا۔ تو اس نے سچ سمجھے مجھے مجھ سے معافی مانگی اور کہا۔ واقعی ہم سے غلطی ہوئی۔ مگر خدا کے لئے اب آپ اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے گا۔

وہ چاہتی تھی۔ کہ بات مجھ تک نہ ہے۔ ایک ایجنٹس کے گھر جانا تینوں بہنوں کے نزدیک بہت محبوب بات تھی۔ وہ اس حرکت کو چھپانا چاہتی تھیں چنانچہ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی ماں سے بھی نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ بالکل تنگ خیال نہیں تھی۔

میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ ان کی وہ حرکت حرکتِ مذموم کیوں تھی۔ اگر

وہ زنگس کے ان گئی تھی تو اس میں ہلائی ہی کیا تھی۔ اداکاری سبب کیوں بھی جاتی ہے۔ کیا ہمارے اپنے خاندان کے سہنے میں ایسے افراد نہیں ہوتے۔ جن کی سادسی عمر فریب کاریوں اور طبع کاریوں میں گزر جاتی ہے۔ زنگس نے تو اداکاری کو اپنا پیشہ بنایا تھا۔ جس نے اس کو راز بنا کر نہیں رکھا تھا۔ کتنا بڑا فریب جس میں یہ لوگ مبتلا رہتے ہیں۔

اس معنوں کے آغاز میں میں نے ایک خط لکھا کہ حسہ نقل کیا ہے جو مجھے تسنیم سلیم نے لکھا تھا۔ اب اس کی طرف لوٹتا ہوں۔ دراصل ساری بات ہی اسی سے چلی تھی۔

بڑا مجھے زنگس کو اس کے گھر میں منے کا اشتیاق تھا۔ اس لئے میں مصروف ہونے کے باوجود سطر سلیم اور ان کے مصاحبوں کے ساتھ میرین ڈرائنگ روم چلا۔ چاہیے تو یہ تھا۔ کہ میں فون کے ذریعے سے جیدان ہائی کو اپنی آمد سے مطلع کر دیتا اور یہ بھی معلوم کر لیتا کہ زنگس فارغ بھی ہے یا نہیں۔ لیکن میں عام زندگی میں بھی چونکہ ایسے تکلفات کا قائل نہیں۔ اس لئے بغیر اطلاع دیے وہاں جا دھکا جیدان ہائی باہر برآمدے میں بیٹھی سر دتے سے چھایا کاٹ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو غصہ آواز میں کہا: "اوہ منٹو۔ آؤ۔ بھائی آؤ۔ پھر زنگس کو آواز دی۔

پے بی۔۔۔ تمہاری سہیلیاں آئی ہیں؟

میں نے قریب جا کر اسے بتایا کہ میرے ساتھ سہیلیاں نہیں۔ سہیلے ہیں؟

جب میں نے نواب پھتاری کے داماد کا ذکر کیا تو اس کا بوجھ بدل گیا : بلاوا نہیں۔
نرگس دوڑی دوڑی آئی۔ تو اس سے کہا : تم اندر جاؤ بے بی۔ منٹو صاحب کے
دوست آئے ہیں۔

بدن ہائی نے میرے دوستوں کی کچھ اس انداز سے آؤ بگلت کی۔ جیسے وہ
مکان دیکھنے اور پسند کرنے آئے تھے۔ وہ بے تکلفی جو میرے لئے مخصوص تھی۔
غائب ہو گئی۔ بیٹھو تشریف رکھیے میں تبدیلی ہو گیا۔ کیا یہ ہو گے۔ کیا نوش فرمائے گا
ہی گیا۔ تم آپ ہو گیا۔ اور میں خود کو چند محسوس کرنے لگا۔

میں نے اپنی اور اپنے دوستوں کی آمد کا تعابیان کیا۔ تو بدن ہائی نے
بڑے ہی پُر تعصن انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے میرے ساتھیوں سے
کہا ایسے بی سے غنا چاہتے ہیں۔۔۔ کیا تاؤں کئی دنوں سے غریب کی طبیعت ناساز
ہے۔ دل بات کی شوٹنگ نے اسے بے حد محفل کر دیا ہے۔ بہت سنج کرتی ہیں
کہ ایک روز آرام کرو۔ مگر شوقی رسا ہے کہ نہیں سستی محبوب نے بھی کہا کہ بیٹا کوئی
حرج نہیں۔ تم ریسٹ کرو۔ میں شوٹنگ بند کر دیتا ہوں۔ مگر مانی۔۔۔۔۔

آج میں نے زبردستی روک لیا۔۔۔۔۔ زکام سے ٹٹھال برہم رہی ہے۔ غریب !

یہ سُن کر میرے دوستوں کو ظاہر ہے۔ بہت مایوسی ہوئی نرگس کی ایک
جھلک وہ ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے دیکھ چکے تھے۔ اور اس کو مفضل طور پر دیکھنے کے لئے
بے تاب تھے۔ جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ بے بی کی طبیعت ناساز ہے تو انہیں بڑی

گرفت ہوئی۔ جتن بانی ادھر ادھر کی باتیں کئے جاتی تھیں۔ جن سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا۔ گروہ متورڑی دیر کے بعد جانیاں لینے لگیں گئے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ نرگس کی ناسازش طبیعت کا بہانہ محض رسمی ہے چنانچہ میں نے جتن بانی سے کہا۔ یہ بی کو ذمہ دت تو ہوگی۔ مگر آہ اتنی دور سے آئے ہیں۔ خدا بلا بھیجے !

اعدائے میں چار مرتبہ کہلوانے کے بعد نرگس آئی۔ سب نے اٹھ کر قہقہا سے سلام کیا۔ میں بیٹھا رہا۔ نرگس کا داخلہ فلمی تھا۔ اس کا سلام کا جواب دینا فلمی تھا اس کا بیٹھنا اٹھنا فلمی تھا۔ اس کی گفتگو فلمی تھی جیسے سیٹ پر مکالمے بول رہی ہو۔ اور میرے ساتھیوں کے سوال جواب بڑے ہی تواریفانہ قسم کے اوٹ پٹانگ تھے۔

”آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی !“

”جی ہاں آج ہی بلجے پہنچے ہیں !“

”کل پرسوں واپس چلے جائیں گے !“

”آپ ماشاء اللہ اس وقت ہندوستان کی جوتی کی ادالکارہ ہیں !“

”آپ کے ہر فلم کا ہم نے پہلا شور دیکھا ہے !“

یہ تصویر جو آپ نے دی ہے میں اسے اپنے اہم میں لگاؤں گا !

اس دوران میں مہین باو بھی آگئے۔ گروہ خاموش بیٹھے رہے کبھی کبھی اپنی

بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں گھا کر ہم سب کو دیکھ لیتے۔ اور ہر خدا جانے کس سوچ

میں فرق بہر جلتے ۔

سب سے زیادہ باتیں جتن بانی نے کیں۔ ان میں اس نے ملاقاتوں پر بڑھے
 واضح الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ وہ ہندوستان کے ہر ماہی اور ہر نواب کو اندر باہر
 سے اچھی طرح جانتی ہے۔ نرگس نے جتنی باتیں کیں بہت محقر اور بناوٹ سے
 بہر پریتیں۔ اس کی ہر حرکت اور ہر اداسے یہ صاف منتر شمع تھا کہ وہ اپنے منے
 والوں کو یہ چیزیں پلیٹ میں ڈال کر بڑے تکلف سے پیش کر رہی ہے تاکہ وہ اس
 کا شکر ادا کریں۔ وہ دلی طور پر معذرت و تشکر تھے۔ مگر اس امتنان و تشکر سے نرگس
 متشقی نہیں تھی۔ وہ غالباً جواب میں تعصّب ہی کی طالب تھی ۔

یہ ملاقات کچھ بہت ہی چپکی رہی میرے لئے بھی اور میرے ساتھیوں کے
 لئے بھی میری موجودگی میں وہ کھل کر امتحان باتیں نہیں کر سکے تھے اور میں ان کی
 موجودگی کے باعث بہت ہی تکلیف دہ گھٹن محسوس کرتا رہا تھا۔ بہر حال نرگس
 کا دوسرا رنگ دیکھنا دلچسپی سے غامض نہیں تھا ۔

سلیم اپنے دوستوں کے ساتھ دوسرے روز پھر نرگس کے ہاں گئے۔ اس
 کی اطلاع انہوں نے مجھے مددی۔ میرا خیال ہے اس ملاقات کا رنگ کچھ اور بھی
 ہر گاسختی کے ساتھ جس جنگ کا ذکر تسنیم نے اپنے خط میں کیا ہے وہ مجھے
 بالکل یاد نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اس وقت وہاں موجود ہوں۔ کیونکہ جتن بانی کو
 شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی اور مجھے کسے اکثر شعر اپنا کلام سنانے کے لئے

وہاں جایا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نخب سے ان کی شاعری ہی پر اختلاف رائے کے باعث بھی سی پچ ہو گئی ہو۔

نرگس کا ایک اور دلچسپ رنگ میں نے اس وقت دیکھا جب اشوک میرے ساتھ تھا۔ جتن بانی کوئی اپنا ذاتی قلم تیار کرنے کا ارادہ کر رہی تھی اس کی خواہش تھی کہ اشوک اس کا ہیرو ہو۔ اشوک حسب عادت اکیلا جانے سے گھبراتا تھا، چنانچہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔

دوران گفتگو میں کئی نکتے تھے۔ کاروباری نکتے، دوستانہ نکتے، خوشامدی نکتے یہ نکتے بڑے ہی دلچسپ طریقے پر آپس میں گڈمڈ ہوتے رہے جتن بانی کا اندازہ کبھی بزرگانہ ہوتا تھا۔ اور کبھی ہم عصرانہ۔ وہ کبھی پروڈیوسر بن جاتی اور کبھی نرگس کی ماں۔ ایسی ماں جو اپنی بیٹی کی قدر و قیمت بڑھانا چاہتی ہے موبہاں باپ سے کبھی کبھی ماں میں ماں ملانی جاتی تھی۔

لاکھوں روپے کا ذکر آیا۔ وہ جو خرچ ہو چکے تھے۔ خرچ ہونے والے تھے اور جو خرچ کیے جا چکے تھے۔ سب کا حساب انگلیوں پر گنوا یا گیا۔ نرگس کا یہ اندازہ تھا کہ دیکھو اشوک، مانتی ہوں کہ تم مجھے ہرٹے ایکٹرو ہو۔ تمہاری دھاک پیٹھی ہوئی ہے۔ مگر میں بھی کسی طرح کم نہیں۔ تم مان جاؤ گے کہ میں اداکاری کے میدان میں تبادلا مقابلہ کر سکتی ہوں۔ چنانچہ اس کی تمام گوششیں اس نقطے پر مرکوز تھیں۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی اس کے اندر عورت بھی بیدار ہو جاتی تھی کہ

وہ اشوک سے یہ کہتی معلوم ہوتی: تم پر ہزاروں لڑکیاں فریفتہ ہیں۔ لیکن میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میرے بھی ہزاروں چاہنے والے موجود ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی مرد سے پرچہ لو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس چیلنج کی بجلی سی جھلک بھی ہوتی: ہو سکتا ہے تم ہی مجھ پر مزا شروع کر دو!

اور جتن بانی کبھی مصالحت کی طرف جھک جاتی کہ نہیں، اشوک تم اور بھی دونوں پر دنیا مارتی ہے۔ اسی لئے تم میں چاہتی ہوں کہ تمہیں ایک ساتھ پیش کروں تاکہ ایک قتل عام ہو۔ اور ہم سب خوب فائدہ اٹھائیں۔ کبھی کبھی وہ ایک اور انداز اختیار کر لیتی اور مجھ سے غنا طلب ہوتی۔

’نمشو، اشوک آتا بڑا ایکٹریں گی ہے۔ لیکن خدا کی قسم بہت ہی ٹیک آؤںی ہے۔ بڑا کم گو بڑا ہی شریلا۔ خدا عمر دراز کرے۔ میں جو فلم شروع کر رہی ہوں اس میں اشوک کے لئے خاص طور پر میں نے گیر کچٹر لکھوایا ہے۔ تم سنو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔‘

میں یہ گیر کچٹر سننے بغیر ہی خوش تھا۔ اس لئے کہ جتن بانی کا گیر کچٹر خود بہت ہی دلچسپ تھا۔ اور نرس جو رول ادا کر رہی تھی۔ وہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ تھا۔ میرا خیال ہے اگر پردے پر وہ حالات پیش کئے جاتے اور اس سے کہا جاتا کہ اشوک سے مل کر تمہیں ایسی گفتگو کرنا ہے تو وہ کبھی اتنی کامیاب نہ ہوتی جتنی کہ وہ اس وقت تھی۔

باتوں باتوں میں شریا کا ذکر آیا۔ تو جہن بائی نے ناک ہوں چڑھا کر اس میں اور سارے کے سارے خاندان میں کیڑے ڈالنے شروع کر دیئے۔ شریا کی عیب جوئی وہ ایک فرض کے طور پر کرتی تھی۔ اس کا گلا خراب ہے۔ بے سرکشی ہے اتنا کہ ہے۔ دانت بڑے و احیات ہیں۔ ادھر شریا کے ہاں تو زنگس اور جہن بائی ہر عمل جراحی شروع ہو جاتا تھا۔ شریا کی نانی جو حقیقت میں اس کی ماں تھی حقے کے بٹنے اور اڑا کر دروں کو غرب گستی تھی۔ زنگس کا ذکر آتا تو وہ بڑا سامنے بنا کر مرثیوں کے انعام میں جگت کرتی۔ منہ دیکھو جیسے گلا سڑا پتیا ہوتا ہے۔

مرہن بابو کی خوبصورت اور بڑی بڑی آنکھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسند چکی ہیں۔ جہن اپنے دل کی بقایا حسرتیں اور تفساںیں بے منوں مٹی کے نیچے دفن ہے اس کی بے بی زنگس نفع اور بناوٹ کے آخری زینے پر پہنچ کر معلوم نہیں اور اوپر دیکھ رہی ہے یا اس کی اداس اداس آنکھیں نیچے سب سے پہلے زینے کو دیکھ رہی ہیں جب اس نے گھٹٹیوں چٹنا لیکھا تھا۔ وہ خیر و کن روشنی میں تاریک ترین سائے کی تلاش میں ہے۔ یا تاریک ترین سائے میں روشنی کی غنمی سی کرن ٹول رہو ہے!۔ روشنی اور سائے کا تانا بانا ہی زندگی ہے اور اس تانے بانے کی حکما سی غنمی زندگی جس میں کبھی ریا پیچ، ایسا غم بھی آ جاتا ہے۔ جب روشنی روشنی رہتی ہے دسایہ دسایہ!

کشت زعفران

”لائس لون — نین اون — کیمرو ریڈی — شارٹ مشرنگ تپ؟
شارٹ؟“

”سین قرنی فور — ٹیک ٹن؟
”نیلا دیوی آپ کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا پیشاب پیا ہے؟
کٹ کٹ؟“

لائس لون ہنریس — دی ایچ ڈی سائی نے رافیل ایک طرف رکھتے ہوئے
بڑے اطمینان سے اشوک سے پوچھا: ”اوکے مشرنگ گولی؟“

اشوک نے جوہل جین کر راکھ ہونے کے قریب تھا۔ قبر آلود نگاہوں سے
خلا میں دیکھا اور نہ ہر کے چند بڑے بڑے گھونٹ جلدی جلدی پی کی کہ چہرے

پر مصنوعی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ڈیساٹی سے کہا: "ڈنڈر نل! پھر اس نے
 سنی چنڑ تپڑوں سے میری طرف دیکھا: "کیوں غمناک؟
 میں نے ڈیساٹی کو گلے لگا لیا: "ڈنڈر نل؟"

ہمارے چاروں طرف لوگ اپنی اپنی ہنسی کا بہت بڑی طرح لگا گھونٹ
 رہے تھے۔ ڈیساٹی بہت خوش تھا۔ چونکہ اس نے بہت دیر کے بعد میرے
 منہ سے اپنی اس قدر پُر جوش تعریف سنی تھی۔ دراصل اشوک نے کچھ عرصہ پہلے
 مجھے منع کر دیا تھا کہ میں اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار ہرگز نہ کر دوں۔ کیونکہ اسے
 امیر شہ تھا کہ ڈیساٹی بوکھلا جائے گا۔ اور سارا دن غارت کر دے گا۔
 جب چند لمحات گزر گئے تو ڈیساٹی نے مکالمہ آموزہ ٹوکشٹ سے کہا:
 "ٹوکشٹ صاحب! ٹوکشٹ ڈاٹا لگ؟"

یہ سن کر اشوک جو کہ آٹھ دن "نامی ظلم ڈاٹا ٹوکشٹ کر رہا تھا، مجھ سے مخاطب
 ہوا۔ غمناک میرا خیال ہے پہلا ڈاٹا لگ ایک دن اور سے میں؟
 میں نے ڈیساٹی کی طرف دیکھا: "کیوں ڈیساٹی صاحب! — میرا
 خیال ہے اس دفعہ اور بھی ڈنڈر نل ہو جائے؟"

ڈیساٹی نے گجراتی انداز میں اپنا سر ہلایا: "ہو سنوئے راجی گرا گرم
 معاملہ ہے؟"

دھارام چلایا: "لائٹس اون؟"

لاٹس روشن ہوئیں، ڈیساٹی نے رائفل سنبھالی۔

ڈکٹھ جھٹ سے ڈیساٹی کی طرف پیکا اور مکالموں کی کتاب کھول کر کہنے

لگا: "مسٹر ڈیساٹی، ذرا وہ ڈائلاگ یاد کر لیجئے؟"

ڈیساٹی نے پوچھا: "کون سا ڈائلاگ؟"

ڈکٹھ نے کہا: "جی جی آپ نے آناؤنڈرفل بولا تھا۔ ذرا اُسے دہرا

لیجئے۔"

ڈیساٹی نے رائفل کندھے پر جاتے ہوئے بڑے سنگین اعتماد سے کہا

"مجھے یاد ہے۔"

ڈکٹھ نے مجھے اشارہ کیا: "منٹو صاحب ذرا آپ سُن لیجئے؟"

میں نے ڈیساٹی کے کانڈھے پر ہاتھ رکھا اور بڑے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا

"اں تو وہ کیا ہے ڈیساٹی صاحب — نیلا دیوی، آپ کوئی فکر نہ کیجئے۔"

میں نے بھی پشاور کا پانی پیا ہے؟

ڈیساٹی نے اپنے سر پر پشاور سیٹنگی کا زلوئے درست کیا، اور دیر (افلم می

نیلا دیوی) سے مخاطب ہو کر کہا: "نیلا دیوی، آپ کوئی پشاور نہ کیجئے، میں نے

بھی آپ کا پانی پیا ہے؟"

دیر! اس قدر بے تحاشا ہنسی کہ ڈیساٹی ڈر گیا: "کیا ہوا مس دیر؟"

دیر! سارا سچی کے آپٹکل میں ہنسی دباتی سیٹ سے باہر چلی گئی۔ ڈیساٹی نے

تشریش کا ہر کرتے ہوئے ڈکٹ سے پوچھا: کیا بات تھی؟
 ڈکٹ نے اپنا ہنسی سے اُبتا ہوا منہ دوسری طرف کر دیا۔ میں نے ڈیساٹی
 کی پریشانی دور کرنے کے لئے کہا: نختنگ میریس۔ کھانسی آگئی؟
 ڈیساٹی ہنسا: اودہ پھر وہ مستہ ہو کر اپنے مکالے کی طرف متوجہ ہوا۔ نیلا
 دیوہی!۔ آپ کوئی کھانسی دیکھتے ہیں نے بھی دیوہی کا...
 اشوک اپنے سر کو تھکے مارنے لگا۔ ڈیساٹی نے دیکھا تو منتظر ہو کر اس سے
 پوچھا: کیا بات ہے مشر گنگولی؟
 گنگولی نے ایک زور کا مکالہ اپنے سر پر مارا: کچھ نہیں۔ سر میں درد تھا۔
 تو ہو جائے ٹیک؟

ڈیساٹی نے اپنا کدو سا سر ہلایا: ہوا!
 گنگولی نے مردہ آواز میں کہا: کیمرو ریڈی۔ ریڈی مشر جگتاپ؟
 بھوتپو سے جگتاپ کی منشا ہٹ سنائی دی۔ ریڈی!
 گنگولی نے اور زیادہ مردہ آواز میں کہا۔
 "شارٹ؟"

کیمرو اشارت ہوا۔ کھپ اشک ہوئی۔
 "سین تھری فر۔ ٹیک ایون؟"
 ڈیساٹی نے راضی ہوائی اور تیرا سے کہنا شروع کیا۔ خیلا پانی۔ آپ

کوئی دیوی نہ کیجئے۔ میں نے بھی پشاور کا

اشوک دیوانہ وار چلتا یا ! کٹ کٹ !

ڈیساٹی نے رائفل فرسز پر رکھی۔ اور گھبرا کر اشوک سے پوچھا۔ ایتی ٹیک
سٹرنگولی ؟

اشوک نے ڈیساٹی کی طرف قاتلانہ نگاہوں سے دیکھا۔ مگر فوراً ان میں بھڑیل

کی سی نرمی اور مصروفیت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ کوئی نہیں۔ بہت اچھا

تھا۔ بہت ہی اچھا۔ پیروہ محمد سے مخاطب ہوا۔ آؤ منٹو، ذرا باہر چلیں !

سیٹ سے باہر نکل کر اشوک قریب قریب رو جیا۔ غصہ بناؤ، اب کیا کیا جا

مجھ سے یہ وقت ہو گیا ہے۔ پشاور کا پانی اس کے منہ پر چڑھتا ہی نہیں۔ میرا

خیال ہے بچے کے لئے بریک کر دیں۔

بڑا مستقل خیال تھا۔ کیونکہ ڈیساٹی سے یہ فوری توقع بالکل فضول تھی کہ وہ

صبح مکالمہ بول سکے گا۔ ایک دفعہ اگر اس کی زبان پر کوئی چیز جم جائے تو بڑی

شکل سے ہنسی خفی۔ اصل میں اس کا حافظہ بالکل صفر تھا۔ اسے چھوٹے سے چڑنا

مکالمہ ہی یاد نہیں رہتا تھا۔ اگر سیٹ پر وہ پہلی بار کوئی مکالمہ محنت کے ساتھ

ادا کر جاتا تو اسے بعض اتفاق سمجھا جاتا تھا۔ مگر لطف یہ ہے کہ غلط ادائیگی کے

باد جو ڈیساٹی کو قطعاً اس بات کا احساس نہیں ہوتا تھا کہ اس نے مکالمے کو

کس حد تک۔ کس رُلا دینے والی حد تک سمجھ لیا ہے۔

مکالمے کی ٹانگ توڑ کر اس کو مکمل طور پر اپنا بیچ کر کے وہ عام طور پر حاضرین کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھا کرتا تھا۔ اس کی ایک دوڑ کھڑا نہیں بیٹھتا۔ تعزیر کا موجب ہوتی تھی۔ مگر جب وہ حد سے نجا بند کر جاتا تو سب کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ اس کے سر کے کھڑے کھڑے کر دیے جائیں۔

میں فلستان میں تین برس رہا۔ اس دوران میں ڈیساٹی نے چار فلموں میں حصہ لیا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس کے ایک مرتبہ میں پہلے ہی مرحلے میں اپنا مکالمہ صحت سے ادا کیا ہو۔ اگر حساب لگایا جائے تو آج بھاتی نے اپنی فلمی زندگی میں لاکھوں فٹ فلم صنایع کیا ہوں گا۔

اشوک نے مجھے بتایا کہ ڈیساٹی کی دوسری ٹیکس کار بیکار ڈھپچتر ہے۔ یعنی بجے نہیں ہیں اس نے ایک بار ایک مکالمے کو چوتھ مرتبہ غلط ادا کیا۔ یہ صرف حسین ڈائریکٹر انزاوشن ہی کا عرصہ تھا کہ وہ بہت دیر تک ضبط کیے رہا۔ آخر اس کا پیمانہ بھر نہ ہو گیا۔ سرپرٹ کو اس نے ڈیساٹی سے کہا: مسٹر ڈیساٹی مصیبت یہ ہے کہ لوگ تمہیں پسند کرنے لگے ہیں۔ تمہیں پردے پر دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیتے ہیں اور آج میں نے تمہیں ضرور اٹھا کر باہر پھینک دیا ہوں گا۔

اور فرانزاوشن کی اس صاف گوئی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھری ٹیکس کار ہونے اور اسٹڈیو کے ہر کارکن کو ماری ماری ڈیساٹی کو دم دلا سادیتے کا فرض ادا کرنا پڑا لیکن کوئی حیلہ کارگر نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایک بار اکھڑ جائے تو کوئی دوا یا دھما

بہر ثابت نہیں ہوئی۔ ایسے وقتوں میں چنانچہ یہی مناسب خیال کیا جاتا تھا کہ نتیجہ خدا کے ہاتھ سونپ کر دھڑا دھڑالے کیا جائے۔ جب اس کی اور ڈیساٹی کی مرضی ایک وقت شامل حال ہو جائے تو سجدہ شکرانہ ادا کرے۔

اشوک نے پلج کے لئے بریک کر دیا۔ جیسا کہ عام دستور تھا کسی نے ڈیساٹی سے مکالمے کے بارے میں گفت گو نہ کی تاکہ جو کچھ ہو چکا ہے۔ اس کی یاد تازہ نہ ہو۔ اشوک اور دھڑا دھڑالے کی گیتیں سناتا رہا۔ ڈیساٹی نے حسب معمول اپنی طرف سے مزاح اچھین باتیں کیں۔ جن میں قذہ برابر مزاح نہیں تھا۔ لیکن سب ہنستے رہے۔ پلج ختم ہوا، شوٹنگ پھر شروع ہوئی۔ اشوک نے اس سے پوچھا: کیوں ڈیساٹی صاحب، آپ کو ڈایا لگا یا دسے؟

ڈیساٹی نے بڑے دھڑلے کے ساتھ کہا: ”جی ہوا“
 لائٹس اون ہوئیں۔ سین تقری فیروز ایک نو شروع ہوا۔ ڈیساٹی نے لائٹس
 بہر اکر دیر سے کہا: ”نیلا دیو... آپ — آپ — اور ایک دم رک گیا۔“
 آئی ایم سوری؟

اشوک کا دل بیٹھ گیا۔ لیکن اس نے ڈیساٹی کا دل رکھنے کے لئے کہا: ”کوئی بات نہیں — جلدی کیجئے۔“

”سین تقری فیروز ایک تقریبی“ شروع ہوا۔ مگر ڈیساٹی نے پشاور سے پشاور
 کو الگ نہ کیا۔ جب چند اور گردشیں بھی بار آور نہ ہوئیں، تو میں نے الگ بجاکر

اشوک کو بہ مشورہ دیا "دادا منی" دیکھیں کہ وہ جب ڈیساٹی یہ کام لہا کر رہا ہے
تو وہ یکسرے کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے اس کا بتایا مقتدا کرے۔ یعنی چنیا در کا
چناب پیسا ہے ایکسرے کے سامنے نہ کر کے نہ بولے ؟

اشوک سمجھ گیا کیوں کہ اس شکل سے بچنے کی ایک طرف ہی ترکیب تھی
کیونکہ ہم بڑی آسانی سے یہ کام بعد میں ڈب کر کتے تھے۔ اگر وہ سارا کام یکسرے
کے سامنے نہ کر کے ادا کرتا تو اس کے ہنٹوں کی جنبش صحیح مکالمے کے ساتھ
چپاں نہ ہو سکتی۔

جب ڈیساٹی کو یہ ترکیب سمجھائی گئی تو اسے بہت ٹھیس پہنچی۔ اس نے
ہم سب کو یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی وہ اب غلطی نہیں کرے گا مگر اپنی
سر سے گر چکا تھا۔ اور وہ بھی پشاند کا، اس لئے اس کی منت سماجت بالکل
نہ ہوتی تھی، بلکہ اس سے کہہ دیا کہ وہ جو اس کے دل میں آئے بول دے۔

ڈیساٹی بہت بد دل ہوا۔ لیکن اس نے مجھ سے کہا: "کوئی بات نہیں منٹو
میں نہ دوسری طرف مڑوں گا۔ لیکن آپ دیکھیے گا کہ میں ڈاگ بائیکل کو ریٹ
بولوں گا۔"

سین تھرٹی فور۔ ٹیک نوٹین کی آواز آئی۔ ڈیساٹی نے بڑے عزم کے
ساتھ داخل ہوا میں ہرائی اور ویلا سے مخاطب ہو کر کہا: "نیلا دیوی آپ کوئی
فکر نہ کیجئے! یہ کہہ کر وہ مڑا۔ میں نے بھی پشاند کا چناب پیسا ہے ؟"

کشتِ زعفران

سین کٹ ہوا۔ ڈیوائی نے فتح مندانا انداز میں رائفل گندھے پر دکھی اور
اشوک سے پوچھا: کیوں مشرنگولن؟ اشوک اب باکی سنگ دل بن چکا تھا اس
نے بڑے دھمکے انداز میں کہا: ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... پھر وہ
کیمرو میں ہریپ سے مخاطب ہوا: چلو ٹیکٹ شوٹ!

شوٹنگ ختم ہوئی۔ مجھ اپنے ایک دوست کے ساتھ جرنل گیٹ جانا تھا
اس نے ہم جلدی جلدی اسٹیشن پہنچے۔ گاڑی کمری قس ہم ایک ڈبے میں بیٹھ
گئے کیا دیکھتے ہیں کہ ڈیوائی صاحب بھی برا جان میں اندسافروں کو اپنے کارنامے
سنا رہے ہیں..... میز دوست جو اس دن کی شوٹنگ دیکھ چکا تھا۔ ڈیوائی کے پاس
بیٹھ گیا۔ دورانِ گفت گویں اُس نے ایک بڑا بے ڈبب سا سوال کیا۔

”سیٹ پر جو لوگ ڈائلاک بھول جاتے ہیں اُس کا کیا علاج کیا جاتا ہے؟“

ڈیوائی نے جواب دیا معلوم نہیں۔ میں تو ایک دفعہ بھی نہیں بھولا۔
اُس کا یہ جواب بے حد مصدوم تھا۔ جیسے وہ ڈائلاک بھول جانے کے مرض
سے قطعاً نا آشنا ہے..... میرا خیال ہے کہ خود اُس کو اس کا کامل یقین تھا کہ اُس سے
کوئی غلطی سرزد نہیں ہوتی اور یہ درست تھا اس لئے کہ غلطی کا احساس تو
صرف اُسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے اگر صحت کے متعلق کچھ تصور انسان
کے دماغ میں موجود ہو۔ ڈیوائی مرحوم کے دماغ میں کوئی ایسا خاندہ ہی نہیں تھا
جو غلط اور صحیح میں تمیز کر سکے، وہ اس سے باہل بے نیاز تھا، مصدومیت کی حد تک

وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا مزاح کار تھا۔ کیمرہ غلط ہے وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑا کردار کا رہتا تھا۔ قطعاً ٹاڈا درست ہے ایسا گناہ آنجہاں نے کبھی سرزد نہیں ہوا۔ لوگ اگر اُس کی حرکات پر ہنس ہنس کے دوسرے ہوتے تھے تو اُس کا باعث قدرت کی چھیڑ خالی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس کی تخلیق ہی ایسے آب و گل سے کی تھی جس میں زعفران گندہی ہو۔

ایک دفعہ پولیس کو درس پر میں نے دوسرے اُس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی بیوی سے کہا: وہ ڈیسا ٹی ہے.... وہ آ

میری بیوی نے اُس جانب دیکھا اور بے اختیار ہنستا شروع کر دیا۔ میں نے اُس سے پوچھا: اتنی دُور سے دیکھنے پر اس قدر بے تحاشا ہنسنے کی وجہ کیا ہے؟

وہ میرے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکی۔ صرف یہ کہہ کر وہ اور زیادہ ہنسنے لگی: معلوم نہیں!

آنجہاں کی پولیس کا بہت شوق تھا۔ اپنی بیوی اور لڑکی کو ساتھ لانا تھا مگر دس روپے سے زیادہ کسی نہیں کھیلتا تھا۔ اُس کے بیان کے مطابق کئی جوتے اُس کے بہت ہی قریبی دوست تھے جو اس کو سولہ آنے کھری ٹپ دیتے تھے یہ ٹپ وہ اکثر دوسروں کو دیتا تھا۔ اس درخواست کے ساتھ کہ وہ اسے اپنے ہمک رکھیں اور کسی اور کو نہ بتائیں خود وہ کسی اور کی دی ہوئی ٹپ پر کھیلتا تھا۔

دیس کر دی پر جب میں نے اُس کو اپنی بیوی سے شہادت کرایا تو اس نے ایک شعور یعنی یقین ٹپ دی۔ جب وہ آئی تو اُس نے میری بیوی سے پرتعجب پہچے میں کہا: حد ہو گئی ہے..... یہ ٹپ تو آنا ہی مانگتی تھی: اُس نے خود ایک دوسرے نمبر کا گھوڑا کھیلا تھا جرپلیں آگیا تھا۔ اس پر اُس نے کسی قسم کے تعجب کا اظہار نہیں کیا تھا۔

ڈیسا کی آنجہانی کی اداسی زندگی کے متعلق لوگوں کی معلومات بہت محدود ہیں۔ خود میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہجرات کے ایک توسط گھرانے کا نند تھا۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اُس نے ایل ایل بی کیا۔ چھ سات برس تک بجے کی چھوٹی حدالتوں کی خاک چھانتا رہا۔ اُس کی پریکٹس معمول تھی لیکن اس کا گھر بار چلانے کے لئے کافی تھی۔ لیکن جب وہ دماغی علاج کرنے میں گرفتار ہوا۔ تو اُس کی مالی حالت بہت بدتر ہو گئی ایک عرصے تک نیم پاگل رہا۔ علاج معالجے سے یہ عارضہ دور تو ہو گیا مگر ڈاکٹروں نے دماغی کام کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ خطرہ تھا کہ مریض پھر عود کر آئے..... اب ڈیسا کی غریب تحے لئے بڑی مشکل تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ وکالت ناپسند ہے کہ یکسر دماغی کام تھا۔ اس لئے ادھر ادھر جمع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کچھ عرصے تک وہ ادھر ادھر ڈاٹھ پھاؤں مارتا رہا۔ تسمات سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں تھی حالانکہ اُس کی رنگوں میں تثبیت ہجراتی غن تھا۔

میں ڈٹے رہے آخر کامیاب رہے اس فلم کے بعد ڈیساٹی بیجے ٹائیکز کے فلموں کا
 جزو لاینفک بن گیا اس کے بغیر بیجے ٹائیکز کی فلم غیر مکمل اور دو کھپ چکی سمجھ جاتی تھی۔
 ڈیساٹی اپنی کامیابی پر خوش تھا مگر اس کو حیرت ہرگز نہیں تھی وہ سمجھتا تھا کہ
 اس کی کامیابی اس کی ذکاوت و ذکاوت اور ان تھک کوششوں کا نتیجہ ہے مگر
 خدا بہتر جانتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا اس کی شہرت اور کامیابی میں ذرہ برابر دخل
 نہیں تھا یہ صرف قدرت کی قسم ظریف تھی کہ وہ فلموں کا سب سے بڑا انراٹ بن گیا تھا۔
 پوری موجودگی میں اس نے فلمسٹن کے تین فلموں میں حصہ لیا ان تین فلموں کا
 نام علی الترتیب یہ ہے "چل چل رہے نوجوان"، "شکایتی" اور "آٹھ دن"۔ ہر فلم کی
 تمیازی کے دوران میں ہم اس کی طرف سے متعدد بار مایوس ہوئے مگر اشراک اور
 مگر جی چکر مجھے بتا چکے تھے کہ اس سے کام لینے کے لئے پتا قطن طود پر مار دینا
 پڑتا ہے اس لئے مجھے اپنی جلد گھبرا جانے والی طبیعت کو قابو میں رکھنا پڑا اور
 بہت محنت تھا کہ میں "چل چل رہے نوجوان" کی شرمگ ہی کے دوران میں ٹوکرے
 جہان کو چل پڑتا۔ ویسے کبھی کبھی غصے کے عالم میں یہ خواہش جڑی قدرت سے پیدا
 ہوتی تھی کہ کبیرہ آشاکر اس کے سر پر دے مارا جائے۔ مگر دونوں کا پورا بوم اس
 کے حلق میں کھونس دیا جائے اور سارے بلب اتار کر اس کی لاش پر ڈھیر
 کر دیتے جائیں مگر جب اس قصد سے اس کی طرف دیکھتے تو یہ سنا کا نہ عزم
 ہنسی میں تبدیل ہو جاتا۔

مجھے معلوم نہیں عزرائیل علیہ السلام نے اُس کی جان کیوں کر لی ہوگی کیونکہ اُس کو دیکھتے ہی ہنسی کے مارے اُن کے پیٹ میں بیڑ چڑھنے لگے۔ مگر متناہے کافر مشق کے پیٹ نہیں ہوتا۔ کچھ ہی ہو ڈیسا کی جان لیتے ہوئے وہ یقیناً ایک بہت ہی دلچسپ تجربے سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

جان لینے کا ذکر آیا تو مجھے "شکاری کا آخری سین یاد آگیا اس میں ہیں ڈیسا کی جان لینا تھا۔ انہیں بے رحم جاپانیوں کے ٹاتھوں زخمی ہو کر مرنا تھا اور مرتے وقت اپنے ہر ہندو بد بھاد شاگرد بادل و اشوک و دھواں کی محبوبہ دیر سے مخاطب ہو کر یہ کہنا تھا کہ وہ اس کی موت پر مفہوم نہ ہوں، اور اپنا نیک کام کئے جائیں مکالموں کی صحت ادا لگی کا سوال حسب معمول تھا گلاب یہ مصیبت درپیش تھی کہ ڈیسا کی کو کس انداز سے مارا جائے کہ لوگ نہ ہنسیں میں نے تو اپنا فیصلہ دے دیا تھا کہ اس کو اگر سچ مچ بھی مار دیا جائے تو لوگ ہنسیں گے وہ کبھی یقین ہی نہیں کریں گے کہ ڈیسا کی مر رہا ہے یا مڑ چکا ہے۔ اُن کے ذہن میں ڈیسا کی کی موت کا تصور ابھی نہیں سکتا۔

میرے اختیار میں ہوتا تو میں نے یقیناً یہ آخر کا سین حذف کر دیا ہوتا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ کہانی کا بہاؤ ہی کچھ ایسا تھا کہ انہام میں اُس کی کیریکٹر کی موت ضروری تھی جو کہ اُسے سونپا گیا تھا، کئی دن ہم سوچتے رہے کہ اس مشکل کا کوئی حل ہی جانے مگر ناکام رہے۔ اب اسکے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ اُسے مڑنا دکھایا جائے۔

مکالموں کی صحت اب ثانوی اہمیت رکھتی تھی۔ جب دیر سلیں کی گینیں تو ہم سب نے نوٹ کیا کہ وہ نہایت ہی مضحکہ خیز طریقے پر برتا رہا ہے۔ شوک اور دیر سے منہ ہوتے ہوئے یہ کچھ اس انداز سے اپنے دونوں ہاتھ ہلاتا ہے۔ جیسے کوک بڑا کھلوتا اس کی یہ حرکت بہت ہی خندہ خیز تھی۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ وہ ساکت پڑا رہے اور اپنے بازوؤں کی جنبش نہ دے۔ مگر دماغ کی طرح اس کا جسم بھی اس کے اختیار سے باہر تھا۔

بڑی دیر کے بعد آخر شوک کو ایک ترکیب سُر بھی اور وہ یہ تھی کہ جب سین شروع ہو تو دیر اور وہ دونوں اس کے ہاتھ پکڑ لیں یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن جب یہ دے پر یہ فلم پیش ہوئی اور ڈیساں کی موت کا یہ منظر آیا تو سارا حال قہقہوں سے گونج اُٹھا۔ ہم نے فوراً دوسرے شوک کے لئے اس کو تینہنی سے مستحضر کر دیا۔ مگر تا شنائیوں کے دماغ میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ آخر تھک ہار کر اس کو لیجے کا ویسا چنے دیا۔

ڈیساں آنجنابی جے حد کہنوس تھا کسی دوست پر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں کرتا تھا بڑے عرصے کے بعد اس نے قسطوں پر شوک سے اس کی پرانی موٹر خریدی وہ خود چونکہ ڈرائیور کرنا نہیں جانتا اس لئے ایک ملازم رکھنا پڑا مگر یہ ملازم ہر دسویں چند دھوپیں روز بدل جاتا تھا۔ میں نے ایک روز اس کی وجہ دریافت کی تو ڈیساں گول کر گیا۔ لیکن مجھے ساؤنڈ ریکارڈسٹ جگتا پنے بتایا کہ

ڈیساٹی صاحب ایک قاضی اور کہتے ہیں کہ نے کے طبع پر اُس کا کام دس بارہ روز دیکھتے ہیں اور پھر اُسے "کنڈم" کر کے دوسرا دکھ لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ مگر اُسی دوران میں اُس نے خود موثر چلا ناسیکھ لیا۔

انجمنی کو دس کی شایست بہت عرصے سے تھی یہ مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا تھا کہ جس کے کہنے پر اُس نے ہر روز دو بار کے طبع پر تھوڑی سی خشک سیلنگ کھانا شروع کی تھی اب وہ اس کا عادی بن گیا تھا شام کو سرویس کے موسم میں برانڈی کا آدھا پیگ بھی پیتا تھا اور خوب چمکا کرتا تھا۔

"آٹھ دن" میں ایک سین ایسا تھا کہ اُسے پانی کے تب میں بیٹنا تھا موسم خوش گوار تھا مگر اُس کی حد سے نازک طبیعت کے لئے ناقابل برداشت حد تک سرد تھا۔ ہم نے اس کے پیش نظر پانی گرم کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ دو کفن مینبرے کہہ دیا کہ برانڈی تیار رکھے جن اصحاب نے یہ نعم دیکھی ہے۔ اُن کو یہ منتظر مزود یاد ہو گا جس میں ٹیکم لارڈ ڈیساٹی (سر زیندر کے فیلٹ کے غسل خانے میں شب میں بیٹھا ہے سر پر برف کی تھیلی ہے۔ ایک چھوٹا پنکھا چل رہا ہے۔ اور وہ شراب کے نٹے میں راحت یہ کہہ رہا ہے "چاروں طرف سرد رہی سند ہے۔ اور پر برف کا پہاڑ ہے..... وغیرہ وغیرہ"

شوٹنگ ختم ہوئی تو جلدی جلدی ڈیساٹی کے کپڑے تبدیل کرانے لگے اور اُس کے بدن کو اسی طرح خشک کیا گیا۔ پھر اُس کو ایک پیگ برانڈی کا دیا گیا

یہ اُس کے صلیب سے نیچے اتری تو اُس نے جینا شروع کر دیا۔ اتنی تھلیل مقدار ہی نے اُسے پورا شرابی بنا دیا، کمرے میں مرف میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ بچے کشت جبرے پہچے میں اپنے تمام کامناں کی داستان سنائے گا۔ پچھریوں میں وہ کیسے مقدمے لڑتا تھا اور کیسے شاندار اور درود دار طریقے پر اپنے مڑکوں کی وکالت کرتا تھا۔

ڈیپٹی قائدِ منظم محمد علی جناح مرحوم اور شری بھولا جاتی ڈیپٹی کی قانون حالی اوسان کے زورِ وکالت کا بہت متعرف تھا۔ قائدِ منظم مرحوم سے وہ کئی بار حریف ملاقات حاصل کر چکا تھا اور متعدد مرتبہ عدالتِ عالیہ میں اُس کی قانونی مشائشاں سن چکا تھا۔

غالباً ”انڈین“ نمانے ہی کا زمانہ تھا کہ حکومتِ پنجاب نے نوبروفمبر ۱۹۲۲ء میرے وارنٹ جاری کئے میرے افسانے۔ نوبروفمبر کی کا الزام تھا۔ اس کا ذکر ڈیپٹی سے ہوا تو اُس نے اپنی قانونی واقعیت بگھڑنا شروع کر دی۔ دعتاً جیسے ایک دلچسپ شراکت سوجھی، وہ یہ کہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لئے اُسے منتخب کروں۔ عدالت میں یقیناً ایک بنگلہ مرہر پاسبور جاتا جب وہ میری طرف سے پیش ہوتا۔ میں نے اس کا ذکر کر ہی سے کیا وہ فوراً مان گئے بات واقعی مرے کی تھی۔

گھما جوں کی قبرست بنائی تو میں نے انڈین چارلی فرد محمد کو بھی اس میں شامل کیا۔

چارہ اور ڈیڑھ ساڑھے لاہور کو عدالت کے کمرے میں کھینچنے کے لئے کافی تھے، میں اس کا تصور کرتا تو میرے سامنے وہ دو میں ہنس لاپشتر پھوٹنے لگتا۔ مگر افسوس کہ شرتنگ کی مشکلات کے باعث میرا یہ دلچسپ خواب پروا نہ ہوا۔

ڈیڑھ ساڑھے نے متعلقہ دفعہ کے متعلق تمام مطوعات حاصل کر لی تھیں جو میرے نزدیک نقل ضروری نہیں تھیں اس لئے کہ میں تو صرف تفریح چاہتا تھا۔ تو محمد چارلی نے بھی اپنی گواہی کا خاکہ تیار کر لیا تھا مگر وہ آدھری طبیعت میں کچھ اس طرح اپنے غموں کی شرتنگ میں مصروف تھا کہ ایک دن کے لئے بھی بیٹھے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

ڈیڑھ ساڑھے کو افسوس تھا کہ آسے اپنی قانونی قابلیت دکھانے کا موقع نہ ملے کہ نہجت کی نگاہوں سے یہ بالکل اوجھل تھا کہ جھے آس کی اس قابلیت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ جب وہ عدالت میں پیش ہو تو بار بار برکھلانے اور جو کچھ کہنا چاہتا ہے بار بار بھولے۔ پشاور کے پانی کو پشاپ بنائے اور اتنے ہی ٹیک کرانے کہ سب کی طبیعت صاف ہو جائے۔

ڈیڑھ ساڑھے غرچکایے زندگی میں صرف ایک بار آس نے ہی ٹیک ہونے نہیں دیا۔ برسرِ عمل کٹے بغیر آس نے عزرائیل علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کی۔ اور لوگوں کو مزید ہنسائے بغیر موت کی گرد میں چلا گیا۔

بابوراؤ پٹیل

طالبان اذیتیں کی بات ہے کہ بابوراؤ سے میری ملاقات ہوئی، میں ان دنوں ہفتہ وار "مصورہ ایڈٹ" کیا کرتا تھا، تنخواہ داجی تھی، یعنی کل چالیس روپے ماہوار "مصورہ" کا ایک نذیر لودھیانوی چاہتا تھا کہ میری اس آمدنی میں کچھ اضافہ ہو جائے، چنانچہ اس نے میرا تعارف بابوراؤ پٹیل، ایڈیٹر "علم انڈیا" سے کرایا۔

اس سے پہلے کہ میں اپنی اس ملاقات کا حال بیان کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ "علم انڈیا" معروضی وجود میں کیسے آیا، آپ کو یاد ہوگا ایک نیا دستا جب پونڈی پر جاتے تھے کہ "علم انڈیا" اپنے پورے عروج پر تھی، "امریت منقش" اور "امر حیات" جیسے امر "علم انڈیا" میں کر کے اس نے ہندوستان کے اکناف و اطراف میں غیر معمولی شہرت حاصل کر لی تھی، اب وہ ایک معمولی ادارہ نہیں رہا تھا بلکہ پرجات "گلو"

میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس کا ہر دکن عزم و اجتہاد کے نقشے میں منور تھا شام دام سید فتح لال، دھائیر..... سب کو ایک ہی گن تھی کمان کی کہنی فن اور تکنیک میں سب کو جیسے چھوڑ جائے۔

اسی زمانے میں جب کہ پربھات، وسعت اختیار کر رہی تھی اور عالم عدوت کی طرح خوبصورت اور باد تار تھی اس نے اپنے بطن سے تین بچے پیدا کئے۔

۱۔ فیس یکمیز، جو پربھات کے قلعوں کا واحد تقسیم کار ادارہ مقرر ہوا اس کے مالک بابو راڈ پائی تھے۔

۲۔ بی۔ بی۔ سمنت اینڈ کمپنی۔ اشتہاروں کے تقسیم کار۔ پربھات کے تمام قلعوں کی نشر و اشاعت کا کام اس ادارے کے سپرد ہوا۔

۳۔ نیروجیک پرنٹنگ پریس..... گننام سا پریس تھا اس کے مالک یاد کرتے ان کو پربھات نے اپنے تمام پوسٹروں، دستی اشتہاروں اور کتابچوں کی جیپان کا کام تفویض کر دیا۔

نعم آدمی نیروجیک پرنٹنگ دکان سے پیدا ہوا۔ یاد کر بابو راڈ کا دوست تھا۔ معمولی سا پڑھا لکھا آدمی، ان دنوں نے مل کر پلان بنایا، پریس موجود تھا، کاغذ دستیاب ہو سکتا تھا۔ کچھ گھرانوں میں بہت سستا تھا، بی۔ بی۔ سمنت کمپنی موجود تھی، اس سے پربھات نعم کمپنی کے علاوہ دوسری نعم کمپنیوں کے اشتہار بن سکتے تھے۔ ظاہر ہے کہ سب لوازم موجود تھے..... اور بابو راڈ

بڑا مہنت آدمی تھا اور وقت پر کس میں اس کے علاوہ وہ خواب دیکھنے والا آدمی نہیں انگریزوں کے معاملے کے مطابق وہ کیل کے سر پر چوٹ لگانا جانتا ہے چنانچہ جب "قلم انڈیا" کا پہلا پرچہ شائع ہوا تو یہ واقعہ ہے ہندوستان میں فلمی مصنفات کا ایک نیا ادوار کھلنا شروع ہوا۔

بابوراؤ کے قلم میں فصاحت تھی، بلاغت تھی، لکھنے کی سبک کلاسیک تھی اس کے علاوہ اس میں ایک ناقابلِ نقل طنز اور مزاح تھا ایک زہر تھا جو میں سمجھتا ہوں یہاں ہندوستان میں کسی انگریزی لکھنے والے ادیب کے قلم کو نصیب نہیں ہوا۔ بابوراؤ کے قلم کی جس محفل نے اس کی وحاک جمانی وہ اس کا لڑکیا بہت ہی لڑکیلا طنز تھا جس میں بکا سا گند پٹنا بھی شامل تھا۔ اس صنف سے ہندوستانی لکھکیں بالکل نا آشنا تھیں اس لئے اس کی تحریریں لوگوں کے لئے چاٹ کا مزہ دینے لگیں۔

بابوراؤ بڑے شہسے کا آدمی ہے اس نے اپنا دفتر اپلا سٹریٹ کی مبارک بلڈنگ کے ایک وسیع و عریض فلیٹ میں قائم کیا اور اسے ہر ممکن طریقے سے بارعب بنایا۔

مبارک بلڈنگ کے اسی وسیع و عریض دفتر میں بابوراؤ سے میری پہلی ملاقات ہوئی اس دفتر میں "قلم انڈیا" کے غالباً سات آٹھ شمارے نکل چکے تھے جو میں محض اسے دفتر میں دیکھ چکا تھا اور شاید ہر گے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

میرا خیال تھا ایسی سنسری انگریزی کہنے والا اور نو کیلے طنز کا مالک، وہ بلا پتہ اور
 تیکے تیکے نقشوں والا آدمی ہوگا، مگر جب میں نے ایک باٹ کو ایک جہاز میز
 کے پاس گھومنے والی کرسی پر بیٹھے دیکھا تو مجھے سنت نامیدی ہوئی، اس کے
 چہرے کا کوئی نقش، کوئی خط ایسا نہیں تھا، جس میں اس کے قلم کو ہلکا سا عکس
 بھی نظر آئے، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، چوڑا ہلکا چہرہ، موتی ناک، بڑا ادھیات لب
 و جان، داشت بد نما..... لیکن پیشانی بڑی۔

جب وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کے لئے اٹھا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے اونچا
 ہے۔ یعنی کافی دراز قد ہے۔ مضبوط ذیل ڈول، لیکن جب اُس نے ہاتھ ملایا تو گرت
 بڑی ڈھیل اور جب اس نے اردو میں بات چیت شروع کی تو میرا سارا مزہ گرا
 ہو گیا۔ گفتگو ادا کا سائب و لہجہ بات بات میں بیٹی کے سوالیوں کی طرح "سالا کہن
 تھا ادا گایاں بکتا تھا۔

میں نے خیال کیا، شاید اس لئے کہ اس کو اردو نہیں آتی، لیکن جب اُس نے
 ٹیل فون پر کسی سے انگریزی میں گفتگو شروع کی تو خدا کی قسم میرے دل میں شک
 پیدا ہوا کہ یہ شخص ہرگز ہر گو وہ بابورا تو پاٹیں نہیں جو نظم انڈیا کا ادارہ یہ کہتا ہے
 "بے کالنگ" رٹم کرتا ہے ادا سوالوں کے جواب دیتا ہے، معاذ اللہ کیا اب دلجو
 تھا، اب گھٹا تھا کہ انگریزی سرسچی میں اور مر سچی، بیٹی کی گزند بول میں بول رہا ہے۔
 یہاں بھی ہر فعل شاپ کے لہجہ یا اس سے پہلے ایک "سالا" ضرور آتا تھا۔

میں نے دل میں کہا کہ اگر میں سالابابو داؤد پائٹل ہے تو سالابابو مسعودت حسن منٹو نہیں ہوں۔

تمہاری دیرگشت گزرتی، تیرا دل دھیا لوی نے میری بہت تعریف کی اس پر بابو داؤد نے کہا کہ مجھے بالوم ہے۔ وہ سالابابو داؤد گزرتے ہی ہر پختے بچے کو مسعودت حسن کے سنا جاتا ہے۔ پھر وہ مجھے مخاطب ہوا کہ یہ سالابابو منٹو کیا ہوا۔ میں نے اس کو اس کا مطلب بتا دیا۔

سالابابو منٹو اتنا تھا کہ پر بات کے کسی فلم کی "چرچہ" یعنی کتابچے میں جو کہانی کا خلاصہ تھا اور مجھے بابو داؤد نے لکھا تھا۔ مجھے اس کا اردو میں ترجمہ کرنا تھا۔ میں نے یہ خلاصہ لے لیا اور ترجمہ کر کے تیرا دل دھیا لوی کے ہاتھ آئے بھجوا دیا۔ جو اس نے بہت پسند کیا۔

اس کے بعد دیر تک میری اس کی ملاقات نہ ہوئی، میں دفتر سے بہت کچھ ہر ملک تھا۔ فلم کمپنیوں میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے در بدر مارے پھرتا، یہ اس وقت بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

بابو داؤد نے کسی نہ طرح شانتارام کو آکسایا کہ وہ "پر بات" کا ایک ٹاڈہ پرچہ شائع کرے، جس میں وہ بالکل نئے انداز سے ان کی فلم کمپنی کی افغان کے فلموں کی پیشکش کرے گا۔ شانتارام گوان پڑھ تھا۔ مگر آرتھ تھا اور بہت اعلیٰ پائے کا۔ طبیعت میں آپ بیتی خود مان گیا اب اس پھر کیا دیر تھی "پر بات"

نکل آیا اور بڑی شان سے، بابوراؤ نے واقعی جسے ان کے اور پیارے انداز میں
پر حیات والوں اور ان کے غلوں کی پیشگی کی۔

نذیر لدھیانوی بڑا وقت شناس اور مطلب نکالنے والا آدمی تھا۔ قرآن
بابوراؤ کے پاس پہنچا۔ یہ اسکیم ہے کہ کہ پر حیات کے ہر شملے کے کچھ حصے معصوم
میں بھی شائع ہونے چاہئیں۔

میں یہاں ایک بات عرض کر دوں کہ بابوراؤ نے چونکہ مغلیں کے دن دیکھے
میں، اس لیے وہ حاجت مندوں پر ہمیشہ مہربان ہو جاتا ہے اس کو معلوم تھا کہ نذیر
کی مالی حالت کوئی زیادہ اچھی نہیں، اس لیے وہ فوراً اس کی تجویز مان گیا۔ لیکن اس کو
شبہ تھا کہ جو کچھ اس نے انگریزی میں لکھا ہے۔ اردو میں منتقل نہ کر سکے گا۔ نذیر نے
میر انعام لیا تو وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا۔

ایمان کی بات ہے میر انگریزی کا علم بہت محدود ہے۔ بابوراؤ نے جو کچھ
لکھا تھا وہ میری سمجھ سے بالا تر تو نہ تھا۔ مگر اس کا اردو میں من و عن ترجمہ
کرنا بہت ہی دشوار تھا اس کا ایک خاص طرز تھا الفاظ کی نشست و برخاست
ایک خاص قصب کی تھی، انگریزی اور امریکی دونوں محاورے سے تھے بعض الفاظ
پر وہ کبھی کبھی لکھا تھا اب میں کیا کرتا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہی بات سمجھ میں
آئی کہ مضمون سامنے رکھوں اور اس کے مفہوم کو اپنے انداز اور اپنی زبان میں
منتقل کر دوں، چنانچہ میں نے یہی کیا۔

جب یہ خرافات چھپ گئی تو زبیر پارچے لے کر اس کے پاس گیا۔

میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا: سالہ تو میں بابو راؤ بننے کی کوشش کرتا ہے؟

میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس کو ساری بات سمجھا دی کہ تباری تحریر کو اوروں میں لانے کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ میں سمجھتا ہوں میں نے جو کیا جائز ہے؟

دائیں ہاتھ کی آخری انگلیوں میں سگریٹ دبائے ٹیٹ دیہیتوں اور مایوں کی طرح اس نے مٹھی بند کر کے زرد کاکش لیا اور کہنے لگا: سالہ تم نے مابہ گل ریز سے سب کتنا بہت مزا آئی۔ میں نے اس کو کہا: (گالی)۔ تو تو کہتا تھا کہ اوروں کا بہت بڑا رائیٹر ہے؟

میں اس داد سے بہت خوش ہوا۔ چنانچہ ملے ہو گیا کہ آئندہ تم مجھے کاغذ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔ مگر وہ ہی پرچوں کے بعد بند ہو گیا، کیونکہ پرچہ بارت فلم کمپنی اتنے زائد شاؤنڈ خرچ کی کینسل نہیں ہو سکتی تھی۔

میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جانا چاہتا کہ وہ مجھے کچھ نہ کر اور موضوعات کی طرف لے جائیں گی۔ جو اس داستان کے ریٹروں کے اندر چھپے ہوئے ہیں، مجھے اصل میں بابو راؤ پائیل کے مشق اپنے تاثرات بیان کرتا ہیں۔

چند ایسے واقعات ہوئے کہ تئیر سے میرے نڈنڈ (ابھی

نہیں یہ بعد کی بات ہے ابھی ان — میں نے شادی کا ارادہ کر لیا۔ ان دنوں میں
 اسپرٹل فلم کمپنی میں اسی روپے ماہوار پر نوکر ہوا تھا۔ یہاں ایک برس ملازمت
 کی۔ مگر تنخواہ صرف آٹھ مہینے کی تھی۔ چار مہینے کی باقی تھی۔ کہ اس کمپنی کا دیوال
 پٹ گیا۔

یہاں سے میں سرورج فلم کمپنی میں چلا گیا۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ میں داخل ہوا
 ہی تھا کہ کمپنی نے بند ہونے کا ارادہ کر لیا تھا، مجھے یقین ہوئے والا تھا کہ میں ہنر
 قدم ہوں کہ اس کمپنی کے بند ہونے کے فوراً سے ہی عرصے بعد اس کے سیٹھ نے
 اتھ پائوں مار کر اسی چار دیواری میں ایک نئی کمپنی کھڑی کر دی۔ یہاں میں سو
 روپے ماہوار پر ملازم ہوا۔ ایک کہانی تھی۔ یہ تین چوتھائی ٹھکانی بھی گئی۔ اس
 دکان میں میرا نکاح ہو چکا تھا۔ اب صرف دھنسی باقی تھی۔ جس کے لئے مجھے پچھلے
 کی ضرورت تھی۔ تاکہ کوئی معمولی سالیٹ کرائے پر لے کر اسے گھر میں تبدیل کر سکوں۔
 جب روپیہ مانگنے کا وقت آیا تو شیٹنا تو بھائی نے صاف جواب دے دیا۔
 اور کہا میری حالت سخت خراب ہے، اس کی حالت تو جو خراب تھی سوتی، لیکن
 یہ خود فرمایا میری حالت کتنی خراب ہو گئی۔ میں نے سیٹھ کو سارے واقعات
 سے آگاہ کیا۔ مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رہی، معاملہ بڑھ گیا۔ تو تو میں میں
 شروع ہوئی تو اس نے مجھے کمپنی سے نکال باہر کیا۔ میری عزت پر یہ صاف
 حملہ تھا، میرا وقار بالکل مٹی میں مل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تہتہ کر لیا کہ وہیں باہر

سدد دروازے پر بیٹھ کر بھوک بھڑکی شروع کر دیں گا۔

اس معاملے کی خبر کسی دکانی طریقے سے بابو راؤ تک پہنچ گئی۔ اس نے پہلے تو نانو بھائی ٹویانی کو فون پر بہت گالیاں دیں، جب اس کا کچھ اثر نہ ہوا، تو سیدھا اسٹریو پنچا اور بارہ سو روپے کا فیصلہ آٹھ سو روپے میں کر دیا۔ میں نے کہا چلو جا گئے چور کی ٹنگوٹی ہی سہی۔

میرا گھر بس گیا۔

ہاں میں آپ سے یہ کہنا بھول گیا، جس جس زمانے میں اسپرٹل فلم کمپنی میں تھا۔ ان دنوں وہاں ایک بہت ہی شریف الطبع ایکٹرس پیدا ہوئی تھی نام سے سنی میرے پہلے فلم کسان کنیا رنگین، کی بیرونی ہی تھی۔ میرے اس کے بڑے دوست تعلقات تھے، لیکن اس کا صبح یعنی جہان تلقت بابو راؤ پائیل سے تھا، جو اس پر بڑی کڑی نگرانی رکھتا تھا۔

یہاں آپ کو یہ بتا دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بابو راؤ پائیل کی اس وقت دو بیویاں تھیں، ان میں سے ایک کریم نے دیکھا ہے، جو ڈاکٹر تھی۔

خیر چند ایسے واقعات ہو گئے کہ مذکور نے میری سب سے لوٹ خدمت اور دوستی شکر ادا کی۔ ہم دونوں الگ ہو گئے، اس کا مجھے افسوس نہ تھا، میں اس سے تباہی کیا تھا، لیکن پھر بھی وہ میرے مکان کا کرایہ جو پچیس روپے بنتا تھا۔ ادا کر دیا کرتا تھا، ان دنوں میں نے بیڈیو میں بھی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ بس کن اب

چونکہ میری رکیلی جان کا سوال نہیں تھا، اس لئے میں نے سرچا کو باہر راؤ سے
 مٹا چاہئے۔ لیکن ٹھہریئے۔۔۔ میں آگے چلا آیا۔ وہ میان میں مجھے آپ سے
 کچھ اور بھی کہنا تھا۔

میری شادی عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی، کچھ ایسے قسے تھے کہ
 میرے گھر میں سوائے میری والدہ کے اور کوئی نہیں تھا، مسلم انڈسٹری کے
 تمام آدمی آ رہے تھے۔ ان کی خاطر رہی کون کرتا، ایک نہایت عورت چھاپڑی کیا کر
 سکتی تھی۔

باہر راؤ کو کہیں سے معلوم ہوا کہ منٹو پریشان ہے تو اس نے اپنی چستی بگلیں
 لکھ چڑھا دیں اور بھیج دیا کہ باؤ، اس کی والدہ کا ہاتھ بٹاؤ، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔
 پھر اتنے میری بیوی کو شاید کوئی فریوڈ وغیرہ بھی دیا تھا۔

چلیئے اب چلتے ہیں۔۔۔ جی ہاں میں باہر راؤ کے پاس پہنچا، اس لیے کہ
 وہ اردو کا ایک منہ دار اخبار کارواں بھی نکالتا تھا، صرف اس غرض سے کہ عابد گل نے
 مجھے طے چڑا کر اس کا دوست تھا، روزی کا ایک دوسید بن جائے۔ مگر وہ ایک
 لاابالی طبیعت کا شاعر آدمی تھا۔ اور ان دنوں اخبار سے عقیدہ ہو کر مکالمہ نویس
 گیت نگاری اور فلم سازی کے چکر میں پڑا تھا۔

میں نے باہر راؤ کو ہر طرف کا رہ نرش دکھایا۔ جو مجھے نذر نے بھیجا تھا، اسے
 دیکھ کر باہر راؤ، لفظ کے لئے چکرا گیا۔ بہت بڑی گالی دے کر اس نے

صرف اتنا کہا : ایسا ؟

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا ۔

بابر راؤ نے فوراً ہی کہا : تو سالانہ ادھر کیوں نہیں آ جاتا — اپنا کڑاں ہے — سارے کو پوچھنے والا ہی کوئی نہیں ؟

میں نے جواب دیا : اگر ایسی بات ہے تو میں تیار ہوں ؟

بابر راؤ نے زور سے آواز دیا : ریشا !

دروازہ کھلا ۔ ایک مشہور پتہ دیوں اور سخت چھاتیوں والی گہرے سانولے رنگ کی گر سپین لڑکی اندر داخل ہوئی ۔

بابر راؤ نے اسے آنکھ مار سی : ادھر آؤ !

وہ اس کی لکسی کے پاس چلی گئی ۔

بابر راؤ نے کہا : منہ ادھر کر دو ؟

اس نے حکم کی تعمیل کی ۔

بابر راؤ نے ایک ایسا دھپا اس کے چوتھوں پر مارا کہ اس کے گولہوں کا سلا گوشت بن گیا : جاؤ گا غنڈ پیل لاؤ ! لڑکی جس کا نام ریشا کار لائل تھا اور جو بابر راؤ کی بیک وقت بیکر لری ، شینوا اور واسٹہ سٹی چلی گئی اور فوراً ہی مشلٹ ہینڈ کی کپڑی اور فیس لے آئی ۔ بابر راؤ میرے نام کا اپائنٹ منٹ میٹر کھرانے لگا بتخوہ کے پاس پہنچا ترک گیا اور مجھ سے مخاطب ہوا : کیوں منتو کتنا چلے گا ؟

پھر غور ہی کیا: ایک سو پچاس ٹھیک ہے ۱

میں نے کہا: "نہیں؟"

بابوراؤ سنجیدہ ہو گیا: دیکھو منٹو — یہ سالہ کاروں زیادہ انورڈ نہیں کر سکتا؟

میں نے کہا: "تم میرا مطلب غلط سمجھ رہے ہو — میں ساٹھ روپے بابوراؤ پر کام کروں گا۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ؟"

بابوراؤ سمجھا، میں اس سے مذاق کر رہا ہوں، پر جب میں نے اسے یقین دلایا کہ میرا یہاں کوئی مطلب نہیں تو وہ اپنے محض گنوار بچے میں برلا، "سالہ میڈ" بنا۔

میں نے اس سے کہا: میں میڈ ٹائپنگ پاگل تھا ہی کبھی۔ لیکن میں نے، "ساتھ روپے اس لئے کہے ہیں کہ میں وقت کا پابند نہیں رہنا چاہتا۔ جب چاہوں گا انوں گا۔ جب چاہوں گا۔ چلا جاؤں گا۔ لیکن کاروں وقت پر نکلتا رہے گا۔"

بات طے ہو گئی۔

میں نے بابوراؤ کے دفتر میں خائبہ چھ سات بیٹے کام کیا اس دوران میں مجھے اس کی عجیب و غریب شخصیت کے متعلق کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

اس کو دنیا کار ٹائل سے مشغول تھا اور وہ کبھی تھا کہ دین میں اور کوئی راہ کی اس کے من و مہال کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دنیا کار ٹائل جیسا کہ عالم کرپشن کرکٹر کا دستور ہے۔ من و مہال پر سختی چلی رہی تھی لیکن بابوراؤ کی وجہ سے اس کا عہد بڑھ گیا۔

مجھے یقین ہے اگر ریشا اردو بول سکتی تو وہ اسے چند دنوں میں نہیں آسمان پر پہنچا دیتا۔ اس کو اپنے قلم اور اس کے زور پر بہت ناز ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں اگر کھڑکی کا ایک ٹکڑا لے لوں اور کہنا شروع کر دوں کہ نرتے سمرٹ ہے تو یقیناً وہ چرب بے حرکت نرتے سمرٹ بن جائے گی۔ اور لوگ اس پر ایمین لائیں گے۔

پہا دیوی گمنامی کے گڑھے میں پڑی تھی، مگر جب اس کے آغوش میں کئی قوس نے اسے محو کرمین یعنی رنگوں کی مکھ بنا دیا۔ ان دنوں فلم انڈیا کے ہر شامے میں اس کے وہ جنوں فوٹو ہوتے تھے۔ جن کے نیچے وہ بڑے چست قعرے اور چلے لکھتا تھا۔

بابر راؤ خود ساختہ آدمی ہے۔ جو کچھ بھی وہ اس وقت تھا اور جو کچھ وہ اس وقت ہے اس کے بنانے میں کسی کا ہاتھ نہیں۔ جوانی ہی میں اس کی اپنے باپ سے کسی بات پر ان بن ہو گئی تھی۔ چنانچہ دونوں کے تعلقات منقطع ہو گئے بابر راؤ سے میں نے جب بھی بڑھے پائیل کے بارے میں سنا کہ وہ سالانہ حرامی ہے۔

معلوم نہیں ان دنوں میں سے حرامی کون ہے اگر بلکہ پائیل حرامی ہے (بابر راؤ کے معنوں میں) تو خود بابر راؤ بھی اس تہ سے حرامی پن میں جہاں تک جنوں کا تعلق ہے، کئی جوتے آگے ہے اپنے اور اپنے باپ کے طاقتور۔

بابو راؤ کے تلم میں جس نو کیلے طنز کا میں نے ذکر کیا ہے، اگر اس کے اسباب
تلاش کیے جائیں تو اس کی ادائیگی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ وہ غزنی کا عمو دین
کر کیوں بت شکنی کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے کو بچپن میں اس کے والد نے اس کی
فطرت توڑنے اور اپنے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کی شادی کی۔
مگر اس کی مرضی کے خلاف — دوسری شادی اس نے خود کی۔ مگر اس نتیجہ
وہ خود دھوکہ کھا گیا۔ اور چڑ گیا۔ اپنے آپ سے — ہر ایک سے !

بابو راؤ کے کردار کے شہ نشینوں میں کئی بت اور دھمے اور شکستے پڑے
ہیں۔ کئی بڑے حرامی ہیں۔ بیکٹریوں، بازاری ٹھکیاٹیاں ہیں۔ لیکن ان تہوں کو توڑ پھوڑ
کر اسے وہ لذت حاصل ہوئی جو سوسائٹ کا مندر ڈھاکر غزنی کے عسود کو
ہوئی تھی۔

وہ اونچے استخوان پر کسی کو میٹھے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، لیکن جو زمین پر
گرا ہوگا۔ اس کو اٹھانے کے لئے وہ کئی کوس چل کے آئے گا۔ اس کو اونچا
کرنے کے لئے وہ ایڑی چٹائی کا زور لگا دے گا۔ اور جب وہ افتادہ شخص اس کی
مدد سے اور اپنی محنت سے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔
تو وہ اس کو گرانے کی کوشش کرے گا۔

بابو راؤ عمو دین اصناف ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ شائقِ رام اس کے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا انارکٹر تھا

ایک وہ نالہ آ یا کہ اس نے اسی شانت آرام کے فطول میں جگہ اس کے کردار میں
میں کیرٹھے ڈالنے شروع کر دیئے کار واد کے وہ سخت غلات تھا لیکن بعد
میں بابو راؤ کو اس کی ہر ادا پسند آنے لگی۔ جو ادہ ہوا تو وہ پھر اس کے غلات ہو
گیا اس کا اسٹڈیو اور اس کی جائیداد ضبط کرانے کے لئے اس نے ایٹری
جوٹی کا زور لگایا لیکن غریب کی قسمت اچھی تھی کہ بال بال بچ گیا۔

بچ میں ایک ذمہ دار آیا کہ اس نے بھاگ دہل اعلان کر دیا کہ مسلم ساری
صرف میاں بھائی (مسلمان) جانتے ہیں جو رکھ رکھاؤ جو سلیقہ اور قرینہ مسلمان
نظم ڈاکٹر کٹرولی کو دو بیعت ہوا ہے وہ کسی سند و نظم ساز کے سنے میں نہیں آ سکتا
میں وہ دن بھی جانتا ہوں جب تک مقوی راج کر وہ ایک خیر کرم بھجنا تھا اور
وہ دن بھی یاد ہیں جب کہ کشور سا ہوا سے بہت کھلتا تھا۔

بابو راؤ پر دوسرے پڑتے ہیں نفسیاتی طور پر اس کا دماغ بالکل درست
نہیں وہ ایک بھکی ہوئی بھٹکی ہوئی طاقت ہے۔ ایک اندھی طاقت جو کبھی ادھر اپنا
سر چھوڑتی کبھی ادھر۔ وہ ایک ایسا آرٹسٹ ہے جو اپنے زعم میں گمراہ ہو گیا ہے
میں جب کار واد میں تھا تو مسلم اندیا میں میری ذہانت و ذکاوت
کے چرچے عام ہوتے تھے وہاں سے نکلا تو میں "یہ منو کون ہے" — جانے
کون بلا ہے "ہو گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب میرا نظم "آٹھ
دن پیش ہوا تو اس نے اس کے ریویو میں اپنی ٹپنی آمار کر مجھے سلام کیا اور کہا

کو شہر ہارے ملک کا منفرد زمین افنا نہ نکلا ہے۔

جب بابوراؤ پر سب بات ظلم کہنی سے شک تھا تو شانت آپٹے ہندوستان کی خوبصورت ترین فلم ایکٹس متی دیاں سے جلیحدہ ہوا تو وہ ایک دم بد صورت ہو گئی اس کے غلات اس نے کافی زہرِ مسلم اندھا "میں اگلا گروہ بھی مرے گی کچی ہے ایک روز سواری کا لباس پہنے بابوراؤ کے دفتر میں گھس گئی اور شراب شراب چھ سات ہنٹاس کے جڑ دیئے۔

منا تھا کہ اونٹ کی کل سیدھی نہیں ہوتی متی اونٹ کے بعد درجہ بابوراؤ پٹیل کا آتا ہے اس کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں — عرصہ ہوا بیٹی کی انگریزی صحافت کے باؤسٹری بی ہارنی مین (مرحوم) نے "مجھے سنی نال" کے خاص کالوں میں چند فقرے بابوراؤ پر چیت کر دیئے۔

بابوراؤ کو بڑا تاؤ آیا اس نے حبث ہنگ حوت کا مقدمہ دائر کر دیا اتنی برس کا گرگ جہانذیرہ ہارنی مین بہت ہنسا اس نے ایک دوست کے ذریعے سے بابوراؤ کو یہ پیغام پہنچایا کہ دیکھو اگر تم چاہتے ہو کہ میں لڑوں تو میں تیار ہوں لیکن اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو دو ہزار کا رقم ہانے ہاتھ سے سمجھا دو تاکہ میں خاموش رہوں۔

بابوراؤ کو اوہ تاؤ آیا پر جب اس نے ٹھنڈے دلی سے غور کیا اور بڑے ہارنی مین کے کارناموں پر نظر ڈالی تو دو ہزار روپے اکل نذر کر دیئے۔

وہ بے وقوف ہے — پہلے وجہ کا اہم ہے اور اس کے دل میں انسانیت کی رفق موجود ہے۔ وہ نرا کھوڑا جوان نہیں، غریبوں کا ہمدرد ہے۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے، ایک مرتبہ اس نے ایک بات پر طوفان برپا کر دیا تھا۔

بٹی میں جو اپنی عمارتیں ہیں ان میں لغٹ لگی ہے، بیڑھیاں بھی ہوتی ہیں۔ سب کو بہ عیش و مستحال کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن غریب لڑکیوں کو نہیں اگر صرف پانچویں منزل کے لئے ایک خط ہو تو اسے پورا قطب صاحب چڑھنا اور اتنا پڑے گا۔ بابوراؤ نے بہت طوفان مچایا اور اس خلاف انسانیت حکم کے خلاف بہت دیر تک صدائے احتجاج بلند کی اور آخر اسے منسوخ کرا کے رہا۔

اس نے ہندوستانی صنعتِ فلم سازی کی سطح بلند کرنے میں قابلِ ستائش خدمات سرانجام دی ہیں۔ غیر ملکی فلم سازوں سے جو ہندوستان ہندوستانی عداوت اور خود ہندوستانیوں کا مسخہ اڑایا کرتے تھے۔ اس کا اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ روپ کا درد کیا اور ان لوگوں کو ان کی حماقتوں سے آگاہ کیا۔

وہ کئی بچوں کا باپ ہے۔ درجنوں تو نہیں ہوں گے، لیکن ایک درجن کے قریب حوروں کے کیونکہ ایک دن جب میں اس کے گھر گیا تھا تو اس نے اپنے تمام بچوں کو فالِ ابن کا حکم دیا۔ بابوراؤ ان سب کا شیوق باپ ہے۔

مگر —

بس اسی گھر کے بدوہ بابوراؤ شروع ہوتا ہے جس کا آنا اور اس کے

بعد کا کچھ حصہ میں نے دیکھا، تھیوٹاسیس، عظمت و بزرگی کے خلاف جو ہلکی سی کد
اس کی تحریروں میں جھلکیاں بیٹی تھی اور آہستہ آہستہ نمایاں ہو رہی تھی۔ اب اپنے
پرے بھیاںک ہاس میں جلوہ گر ہے۔

عمود غزنوی کی بت شکنی کا وہ جکا سا پر تو، جو اس کے دل دواغ میں بھڑ
تھا۔ اب نہایت جھوٹی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔

درمیان میں اس نے جواہر لال نہرو کی ہر دلعزیزی اور عظمت سے بڑھ
کر اس کو گاندھی کا سہاگ اور ساری قوم کے سر کا درد کہا تھا۔ یہی چیز
اب بگڑ کر پاکستان کی دشمن بن گئی ہے۔ اس لئے کہ پاکستان حقیقت بن گیا
ہے اور دنیا کے نقشے پر اپنے لئے ایک اہم جگہ پیدا کر رہا ہے۔ یہ اس کی کج رٹ
طبیعت کے خلاف ہے۔

”فلم انڈیا“ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، صرف فلم سے متعلقہ مضامین
ہونے چاہئیں۔ اور ہوا کرنے تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس میں سیاسیات نے
بھی سڑکا نا شروع کر دیا۔ اور اب تو یہ حالت ہے کہ سیاسیات، فعلیات اور جنیت
کچھ اس طرح آپس میں گڑبڑ ہو گئے ہیں کہ باطل باوراء کی موجود پر ڈونڈ ذہنیت
کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ ایک ہی جگہ پر آپ کہ پاکستان، مراہمی ڈسائی، عورتوں
کے ایام اور دیر کے پتیا ناچہرے کا ذکر ملے گا۔

بیات کا کہ ہو گا، ساتھ ہی باوراء کی تو مندی اور مردی، اس کے ساتھ

اپاریہ کشور ساہو اور آخر میں وہ گاندھی ٹوپی کو اپنی پہنوں کوں سے اڑانے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

سیاسیات میں قدم رکھ کر وہ سمجھتا ہے کہ یہ بھی کوئی ریٹل ہے، سوشل ہے، پنا ہے۔ جسے وہ ڈگڈگی بجا کر ہانس پر چڑھا دے گا۔ اور خوشامد کیجیے گا۔ حالانکہ وہ اندرونی طور پر جانتا ہے کہ فلم سازی کے میدان میں وہ بہت بُری طرح ناکام رہ چکا ہے اور اس میدان میں اس سے بھی زیادہ ناکام رہے گا۔ مگر میز چنڈ اس کی سرشت میں داخل ہے۔

نچہ سے آپ پوچھیے تو بابوراؤ کو ہندوستان سے غرض ہے نہ پاکستان سے وہ دراصل ظلمت اور بزرگی کا دشمن ہے۔ ورنہ وہ اپنے اس بنگلے میں نریش ہے جو اس نے ایک بڑی رقم دے کر عمر پارک میں خریدی ہے۔ اپنی بیکر ٹری سوشیل رانی سے عورت ہے جس کو آسمانوں پر چڑھانے کے لئے اس نے 'فلم انڈیا' دہریں تک وقف کیے رکھا۔ اس کو ایک فلم میں بھی پیش کیا۔ اس خیال سے کہ دوسرے کا ہاتھ رانی کو نہ لگے۔ اس نے یہ فلم خود ڈی آر کٹ کیا۔ لیکن نتیجہ سفر۔

اس کی بابوراؤ کو کوئی پروا نہیں۔ اس کے پاس رانی ہے اس کے پاس ریس کے گھوڑے ہیں۔ اس کے پاس بہترین دفتر ہے۔ اس کے پیٹ میں سرطان ہے۔ لیکن اس کی تھوڑی سی کافی دولت ہے وہ اگر کامریکے جاسکتا ہے اور اس کا علاج کراسکتا ہے۔ لیکن اس کو ایک بہت بڑا دک ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس کو یہ دکھ ہے کہ مسلمان کیوں اتنے بے وفّا ہوتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اس کے کئی مسلمان دوستوں نے اس سے بے وفائی کی ہے۔ ہندو دوستوں نے بھی کی ہے لیکن مسلمان اسے زیادہ عزیز نہ تھے۔ وہ ان کی عزت پسند کرتا تھا۔ ان کا رہن سہن پسند کرتا تھا۔ اس کو ان کی خوبصورتی پسند تھی۔ سب سے زیادہ اس کو ان کے کھانے پسند تھے۔

بابو راؤ عقائد کے لحاظ سے بہت روشن خیال ہے۔ اس کی ایک لڑکی پریس کے ایک مسلمان ملازم کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ مسلمان قریب قریب اُن پرہ تھا۔ اور بابو راؤ کی لڑکی ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ تھی۔ لیکن عشق ایسی چیزیں کب دیکھتا ہے۔ دونوں بھاگ گئے۔

بابو راؤ اُن دونوں کو پکڑ کر لے آیا۔ لڑکی کو لعنت سلامت کی اور چاہا کہ بے قصہ ختم ہو جائے، لیکن لڑکی نہ مانی۔ بابو راؤ نے اس سے پوچھا: تو کیا چاہتی ہے!

لڑکی نے جواب دیا: میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں؟ بابو راؤ نے اپنی لڑکی کی شادی پریس میں کام کرنے والے مسلمان سے کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس سے میری ملاقات ہوئی تو وہ آنکھوں میں آنسو بھر کے کہنے لگا: یہ تم سالہا مسلمان کیسا ہے۔ ایک ہم سے چوکر ہی بیٹا ہے۔ پھر کہتا ہے کھانے کے لئے بھی دو۔

اس پس منظر میں بھی بابر اور ان کی موجودہ ذہنی تخیلوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ وہ ایک فرد کا یا دو تین افراد کا بدلہ ایک پوری قوم سے لینا چاہتا ہے — ایک مذہب سے لینا چاہتا ہے بابر اور تاریخ کا طالب علم ہے کیا اس پر یہ حقیقت آشکارا نہیں کہ یہ قوم اور یہ مذہب سب نہیں، ایک شوش حقیقت ہے !

اسلام اور اودھ اسلام کے خلاف لوگ دیدہ دہشت کہتے رہے ہیں، لیکن اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ پاکستان کے خلاف بھی لوگ ایک طرح سے ہنگامہ مچاتے رہیں گے۔ اس سے کیا ہوتا ہے — مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ حالات نے کتنا شاندار قلم خلافت اور گندگی میں ڈبو دیا — کوئی آرٹسٹ کسی کی مذہبی دل آزاری کا باعث نہیں ہو سکتا، وہ آرٹسٹ تھا، لیکن افسوس کہ عام آدمی بن گیا۔ خدا کی قسم، قلم انڈیا کے چند پچھلے شمارے دیکھ، مجھے گھن آنے لگی —

بابر اور اودھ ایسی گرا رٹ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آرٹسٹ جمائیں میں تھا، یا تو سلطان بن کے اس کے پیٹ میں چلا گیا ہے، یا ان کی دو بیویوں کی بددعائوں پر شاہکار لائل کے بریدہ گیسوئوں — اور یہ ما دیری اور سو شیلا رانی کے بستروں میں دفن ہو گیا ہے۔

گنجے فرشتے

’ٹھنڈا گوشت‘ کا مقدمہ قریب قریب ایک سال چلا۔ ماتحت عدالت نے مجھے تین ماہ قید با مشقت اور تین سو روپے جرمانے کی سزا دی۔ کیشن میں ریل کی توہی ہو گیا۔ (اس حکم کے خلاف سرکار نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر رکھی ہے۔ مقدمے کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی)

اس دوران میں مجھ پر جو گزری اس کا کچھ حال آپ کو میری کتاب ’ٹھنڈا گوشت‘ کے دریا پے بعنوان زحمت مہر و خشاں مل سکتا ہے۔ دماغ کی کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ لکھنا چھوڑ دوں یا احتساب سے قطعاً بے پرواہ ہو کر قلم زنی کرتا رہوں۔ سچ پوچھئے تو طبیعت اس قدر کھٹی ہو گئی تھی کہ جی چاہتا تھا کوئی چیز لٹاٹ ہو جائے۔ تو اقلام سے کسی کو لے میں بیٹھ کر چند برس قلم اڑا

دوات سے دھند رہوں۔ دماغ میں خیالات پیدا ہوں تو انہیں پھانسی کے تختے پر لٹکا دوں۔ الاٹ منٹ میسر نہ ہو تو بلیک مارکنگ شروع کر دوں، یا ناجائز طور پر شراب کشید کرنے لگوں۔ آخر الذکر کام میں نے اس لئے نہ کیا کہ مجھے اس بات کا خدشہ تھا کہ ساری شراب میں خود پی جابیا کروں گا، خرچ ہی خرچ ہوگا۔ آمدن ایک پیسے کی بھی نہ ہوگی۔ بلیک مارکنگ اس لیے نہ کر سکا کہ سرمایہ پاس نہ تھا ایک صرف الاٹ منٹ ہی سنی جو کار آمد ثابت ہو سکتی تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی۔ مگر یہ واقع ہے کہ میں نے اس کے لئے کوشش کی پچاس پٹے حکومت کے خزانے میں جمع کرا سکے ہیں نے درخواست دی کہ میں امرت سرکا ہجرا ہوں۔ بیکار ہوں۔ اس لیے مجھے کسی پریس یا سینما میں حصہ الاٹ فرمایا جائے۔

درخواست کے چھپے ہوئے فارم تھے۔ ایک عجیب و غریب قسم کا سوالیہ تھا۔ ہر سوال اس قسم کا تھا جو اس امر کا طالب تھا کہ درخواست کنندہ پیٹ بھر کے جھوٹ بولے۔ اب یہ عجیب غم میں شروع سے رہا ہے کہ جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ میں نے الاٹ منٹ کرانے والے بڑے بڑے گھاگوں سے مشورہ کیا۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہیں جھوٹ بولنا ہی پڑے گا۔ میں راضی ہو گیا۔ لیکن جب چھپے ہوئے فارم کی خالی جگہیں بھرنے لگا تو روپے میں صرف دو یا تین آنے جھوٹ بول سکا۔ اور جب انٹرویو ہوا۔ تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ

صاحب جو کچھ درخواست میں ہے بالکل جھوٹ ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ہندوستان میں کوئی بہت بڑی جائیداد چھوڑ کے نہیں آیا۔ صرف ایک مکان تھا اور بس۔ آپ سے میں خیرات کے طور پر کچھ نہیں مانگتا۔ میں بزمِ خرد بہت بڑا اضافہ نہ کر سکتا تھا۔ لیکن اب مجھے عسوس ہوا۔ کہ یہ کام میرے بس کا لوگ نہیں اللہ جل میاں ایم۔ اہلم اور بھارتی دت کو سلامت رکھے۔ میں ان کے حق میں اپنی اضافہ نگاری سے سبک سر ہوتا ہوں اور صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حکومت مجھے کوئی ایسی چیز الاٹ کرے جس کے لئے مجھے کام کرنا پڑے اور اس کام کی اجرت کے طور پر مجھے پانچ چھ سو روپیہ ماہوار مل جایا کرے۔

حیرت ہے کہ میری اس گفتگو کا اثر ہوا۔ قریب تھا کہ مجھے کسی برف خانے میں کوئی حصہ الاٹ ہو جائے کہ بورڈ کے ممبروں سے کسی نے کہہ دیا تم لوگ یہ کیا غضب کر رہے ہو۔ یہ شخص جس کا نام سادات حسن منٹو ہے۔ ترقی پسند ہے۔ چنانچہ ایک قلم میری درخواست مسترد کر دی گئی۔

ادھر یہ ہوا۔ اٹھتر ترقی پسند مصنفین نے رجعت پسند قرار دے کر میرا حق پانی بند کر دیا۔ یہ بھی خوفِ لطیفہ راز۔ بہت دیر تک سوچا کیا، آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ مولے نے اوڑک ہٹی نہیں، چنانچہ قلم اٹھا کر پھر لکھنا شروع کر دیا۔ لیکن لکھنے سے پہلے مرحلہ درپیش رہا کہ موضوع کیا ہو۔ فوراً کیسی ہو۔

بہت سوچ بچا کہ بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی جان پہچان کے ایکٹ

ایکڑیوں پر کچھ لکھوں۔ اس سلسلے کا پہلا مضمون چنانچہ پری چہرہ نسیم ہائز کے عنوان سے ہوا جو روزنامہ آفاق میں چھپا۔ میں خوش تھا کہ ایک دستہ نکل آیا ہے جو حکومت کے احتساب سے پاک صاف رہے گا۔ اور لہارت پسند لوگوں کے لئے موجب اطمینان ہوگا۔ لیکن یہ مضمون چھپتے ہی طوفان برپا ہو گیا۔ آفاق کے دفتر میں بے شمار خطوط آئے جن میں مجھے طعون و مطعون گردانا گیا۔

سہ جہانائی کے آفاق میں ایک صاحب قاضی م۔ بشیر محمود صاحب ایوب فاضل کا ایک خط ایڈیٹر کے نام چھپا — ان کا مختص ملاحظہ فرمائیے۔

سعادت حسن منٹو کا مضمون — بے ضرر مضمون
پری چہرہ نسیم ہائز نظر سے گزرا۔ ساتھ ہی نسیم ہائز کا
مکتوب اپنے بھائی کے نام بھی پڑھا۔

منٹو نے بڑے اطمینان اور لطف لے لے کر بہن کے
بقا ہوا وصفت، مناقب، فقر شبیں اور حکایتیں توضیح اور
وضاحت کے ساتھ رقم کی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہن
کی قدر و منزلت، ساتھ اور ذہانت اور وقار کو کچھ حد تک
نظر انداز کر چکے ہیں۔ کسی حد تک یہ بہن کی تو بہن تھیں پس یہی
شمار ہوگا۔

ایسا لگتے ہیں انہیں حجاب و تامل کو خدا حافظ

کہنا پڑا ہوگا۔ مجھے اُن کے الفاظ پر اعتراض نہیں، حروف و کلمات پر گرفت نہیں اور نہ ہی معنوں پر حرف گیری کر رہا ہوں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں، کیا نسیم باؤ، غٹو صاحب کی حقیقت یہی ہے؟ — کیا غٹو اس کے معاشرے پر روشنی ڈالنے کی قوت اور جرات رکھتا ہے؟

غٹو بڑا خطرہ ہے۔ میرے دل میں اس کی بے انتہا عزت ہے۔ میں اس کے کافی کارنامے دیکھ چکا ہوں۔ اب ایک اور بے مزق قسم کا کارنامہ بھی لگے انھوں نے دیکھ لیا۔ میں غٹو دوست کی بدی چہرہ نسیم باؤ پر رائے زنی یا کتہہ چینی نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں — اور پھر اپنے غٹو پر کتہہ چینی کر بھی کیسے سکتا ہوں۔ اس کی بلند آشتیانی تک ابھی میری پہنچ نہیں۔

یہ خط چڑھ کر مجھے بہت کوفت ہوئی۔ اسے دو کرنے کے لئے میں نے یہ چند حروف لکھ کر محمد سرور صاحب کو بھیج دیئے۔

اس خط پر اور ایسے ہی دوسرے خطوں پر جو اس معنوں کے متعلق آفاق الکر دوسرے انجاءوں میں پہنچتے رہے، میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔

مرد صاحب نے شروع شروع میں ان خطوط کی کوئی پرواہ نہ کی اور منجھ سے
 لکھا: تم کہتے رہو۔ یہ سلسلہ کافی دلچسپ ہے، جاری رہنا چاہیے۔۔۔ میں نے جاری
 رکھا، محنت و ملامت میں جاری رہی۔ شام پر مضمون چھپا تو سیاہ لکھوٹ کی
 ایک خاتون تیرا نمناجہ نے ایک طویل خط لکھا، جسے پڑھ کر یقین مانتے بھٹے
 بہت ترس آیا۔ اس کے چند اقتباس دیکھو۔

میں سینا دیکھنا گناہ کبیرہ میں شمار نہیں کرتی تصویروں پر
 نظر پڑتے ہی آنکھوں پر پٹی باندھنے منہ میں دوڑی جاتی
 مگر میرے پاس بچے ہیں۔ اور میری آرزو ہے کہ وہ نیک
 اخلاق ہوں بسینا دیکھو دیکھو کہ اخلاق بتا نہیں بگڑتا ہے
 اس لیے میں نے سینا دیکھنا چھوڑ دیا۔۔۔ میں جانوں
 گی تو وہ بھی جانیں گے۔ زبردستی روکا تو اس آرزو کو
 دل میں پالتے رہیں گے۔ اور جب موقع ملے گا کہ
 پوری کر لیں گے۔

میں اتنی بڑی ہوں مگر بعض تصویروں پر نظر ڈالنا
 طبیعت کو گوارا نہیں ہوتا، ایسا پرچہ عموماً ہوتا ہے کہ
 کیا بتاؤں، جیسے کسی کی غلوٹ میں میز اجازت گئے
 جا رہے ہیں، اور یہ بات آداب و خرافات کے خلاف

ہی تو ہے۔ آپ کہیں گے، ایسے رسالے، اخبار، کتابیں
بچوں کو نہ دکھائی جائیں مگر یہ کتنا مشکل کام ہے کہ پڑھتے
پڑھتے اخبار یا رسالہ میٹر پر ٹکا دینے کی بجائے خاص
اہتمام سے تمہارے میں بند کرنے کی فکر کی جائے۔

ذرا 'مرلی کی دھن' دوبارہ پڑھ کر بتائیے کہ یہ کیا چیز
ہے؟ — کیا کوئی شخص خواہ کتنا بھی نیکی سے لڑ
اور اخلاق باختہ ہو۔ کیا اپنے گھر میں بیوی بچوں کے درمیان
بیٹھ کر یہ پڑ لطف یا گستاخ نے متبہ بات دہرا پستہ
کرتا ہے؟ — اُس نے چاہے کتنے ہی خم لٹھ کھائے
ہوں، شراب کے تالاب میں غوطے لگائے ہوں، چلی
کر بھند رہتا ہو۔ یا منکطات بکتا ہو۔ کتنی ہی عورتوں
کو دسترخوان کی چٹنی بناتا ہو۔ جب یاد کیا ہو۔ سہلی
محبت کہا ہو۔ اور نہ پا کر بستر کو آگ لگا دی ہو۔
ان چیزوں کو اخباروں کے ذریعے سے پھیل کر
کون سی انسانیت اور اخلاق کی خدمت ہوتی ہے۔
دوسروں کے بھی گھر ہوتے ہیں۔ اُن کے بھی بیری بچے
ہوتے ہیں۔ روکے لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ان کا خیال بھی

اپنے گھر اور بچوں کی طرح ہرنا چاہیے۔ کل دنیا مردوں
 ہی کی تو نہیں کہ خاک چھٹکتے پیرس بگنہ گی اچھا میں
 خود تھوڑی۔ معصوموں کو بھی ستائیں۔ کوئی پوچھنے والا
 نہیں — کوئی کہاں بھاگے۔ گھروں میں چسپیں نہیں
 آجباد، رسالے اور ادب جو بیچ ہو رہے ہیں۔ ماں، باپ کو
 چاہیے کہ وہ بھی ان کی پرورش اور آبپاشی شروع
 کر دیں تاکہ بہتر اور مکمل نتیجہ سامنے آئے۔ باپ بیٹے
 کو سکھائے کہ اس طرح شراب کے تالاب میں غوطہ
 لگا کر ان سابیوں کو اس طرح گھسیٹ لے جانا چاہیے
 اور مائیں اپنی بیٹیوں کو نئے نئے دام، بھانسنے کے دام
 حبلے سمجھا دیں۔ استغفر اللہ، کیسی انسانیت اور کیسا
 معاشرہ ہوگا — ذرا تصور تو کیجئے۔ سوچ سوچ کر
 میں کتنا حلقی ہوں۔

میں نے جب یہ خط پڑھا تو بھدا مجھ پر بہت اثر ہوا۔ مجھے تیرا نوکی حالت
 پر بہت ترس آیا، میں نے سوچا کہ اور کچھ نہیں تو اس خاتون پر میں نے اتنی
 بہت ظلم کیا ہے جس کا کنارہ مجھے ضرور ادا کرنا چاہیے۔ لیکن پھر میں نے سوچا اگر
 میں نے اپنی سبھ بوجھ کے مطابق یہ کنارہ ادا کرنے کی کوشش کی تو وہ سورت

جو بعض تصویریں پر نظر ڈال کر پہچان ہی محسوس کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے گویا وہ کس کی غفلت میں اجازت کے بغیر گھس گئی ہے۔ یقیناً اس کی تلب نہ لاکر یہ ہوش ہو جائے گی۔ اللہ بہت حکم ہے مریض جانے۔

مجھے اس کا پورا پورا احساس ہے کہ تیرا تو ذہنی مریضوں کی جس فہرست میں آتی ہے، اس کے تمام افراد قابلِ رحم ہیں — ان کا علاج جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ ان کے سامنے توڑوں کے کاگ اڑا اڑا کر تالاب بھرے جائیں۔ گندگی اچھالی جائے۔ اپنے سر میں خاک ڈالی جائے، بال توڑے جائیں۔ منقذات بھی جائیں۔ یہ کام خود سے نہ ہو سکے تو کرائے پر آدمی لائے جائیں۔ جو وہابی تباہی کہیں — شیخ، بیسوی صدیٰ دوران اور اسی قسم کے دوسرے پادروں کے تمام مضامین اشتہارِ عدلیت پڑھ کر بار بار انہیں سنائے جائیں۔ اگر یہ نسخہ کارگر ثابت نہ ہو تو سماعت حسنِ غلط سے کہا جائے کہ تیرا تو کا پرانا سینڈل اٹھاٹھے اور اپنے سر پر مارا کر اسے گھما کر دے۔

میں نے بہت سوچا تھا کہ ان مضامین کے عجوبے کا نام میں نے لگے فرشتے کیوں رکھا ہے — اب یہ سلوک کتے کتے اس کی وجہ تسمیہ معلوم ہو گئی ہے مجھے یقین ہے کہ میل تیا یا بڑا نسخہ ہرگز نہ مجرب نہیں ہے اور لوگ اپنی کمزوریاں دہر کرنے کے لیے مزورِ علم پر گیلانیاں کے غلامِ علم ہی کی گویاں

خریدیں گے، اور انجام کار سیالکوٹ کے کسی چوراہے میں کھڑے ہو کر مجھے
 نیترا توڑ کے پڑانے یا نئے سینڈل سے اپنا سر گھنا کر پڑے گا۔
 میراجی وانا معنوں تین گولے شائع ہوا تو اس سے بھی لوگوں کو تکلیف
 پہنچی۔ آفاق کے ایڈیٹر کو ایک صاحب خواجہ فرخندہ بنیادی صاحب
 نے یہ خط لکھا۔

آپ نے آفاق کے ادبی ایڈیشن میں سعادت حسن منٹر
 کا معنوں تین گولے شائع کر کے میراجی مرحوم منٹو صاحب
 اور خود آفاق کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ معنوں ایک
 مخصوص ادبی حلقے کے لیے تو شاید سوزوں تھا، لیکن
 ایک سنجیدہ اخبار اس کی اشاعت کا قطعاً متعلق نہیں
 ہو سکتا تھا۔

دنیا کے ہر مذہب ملک اور ہر مذہب سماج میں یہ
 اصول مروج ہے کہ مرنے کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں
 نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے
 صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں۔ اور عیوب پر پردہ
 ڈالا جاتا ہے۔ میراجی میں اگر کچھ کمزوریاں تھیں تو ان سے
 صرف ان کا مخصوص حلقہ اجاب ہی واقف تھا، دنیا تو

انہیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے جانتی اور
 عزت کرتی تھی۔ کیا غضب کہ ان کے ٹکڑے یاران کے
 مرنے کے بعد ان بولتوں کو الم نشرح کر رہے ہیں۔
 عصمت نے ددنی لکھ کر اپنے بھائی کو جس طرح
 خراج ادا کیا ہے غالباً ہمارے ادیب اب اسی ڈگر
 پر چل رہے ہیں۔ اور پھر اس معنوں کے معنی حصول
 کی کراہت کی مذہک مروتی۔ پناہ بھنا، نہ نفاست پسند
 طبائع اسے برداشت کر سکتی ہیں، وہ یہ معنوں گھر کی
 غلامین پڑھ سکتی ہیں، نہ بچے نہ لڑکیاں۔ اگر مٹر کے بیج
 آپ کا اہل ایڈیشن مکمل نہیں ہو سکتا تھا تو ایڈیٹر
 کے تلی اعتبار کو کیا ہو گیا تھا۔

میراجی مرحوم، مٹو اور آفاق کے ساتھ جو غلم ہوا تھا، وہ تو ہو گیا۔ اس
 جیسے کی اشاعت سے جو مزید غلم ہو گا۔ اس کا میں گواہ ہوں۔ اور یہ گناہ
 بنیادی صاحب کے سر پر ہے کہ وہ انہوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ
 دنیا کے ہر مذہب ملک اور ہر مذہب سماج میں یہ اصول مروج ہے کہ مرنے
 کے بعد خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو اسے اچھے الفاظ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔
 اس کے صرف محاسن بیان کیے جاتے ہیں اور محبوب پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔

ویسے میں ایسی دنیا پر ایسے مہذب تک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار رحمت
 بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار اللہ شخص
 لائڈر سی میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ وصل و ملا کر آئے اور رحمت اللہ علیہ کی
 کھونٹی پر شکا دیا جائے ۔

میرے اصلاح خانے میں کوئی شاذ نہیں، کوئی شیپو نہیں، کوئی غور و فکر پیدا
 کرنے والی شیپو نہیں — میں بازو لگا رکھتا نہیں جانتا — آغا حشر کی
 بھینگی آنکھ مجھ سے کسی حد تک نہیں ہو سکی۔ اس کے منہ سے گایوں کے بھانے
 میں بھول نہیں جھڑاسکا۔ میرا جی کی فضالت پر مجھ سے استری نہیں ہو سکی۔ اور نہ
 میں اپنے دستِ شام کو مجھ پر رکھتا ہوں۔ کہ وہ بر خود غلط عورتوں کو سبیاں نہ
 کہے — اس کتاب میں جو فرشتہ بھی آیا ہے، اس کو منڈان ہوا ہے اور یہ دم
 میں نہ بڑے سلیقے سے ادا کی ہے ۔

سعادت حسن منٹو

(علاؤ الدین سلیمی کاتب) (اردو بازار لاہور)

سَعَادَتِ حَسَن مَنُو

منٹو نہ تو کسی کو شرم دلاتا ہے نہ کسی کو راز راست پر
 لانا چاہتا ہے۔ وہ تو بڑی طنز پر مکرارٹ کے ساٹھ انسانوں
 سے یہ کہتا ہے کہ تو اگر چاہو بھی تو بھٹک کے بہت دور
 نہیں جاسکتے اس اعتبار سے منٹو کو انسانی فطرت پر کہیں
 زیادہ بھروسہ نظر آتا ہے۔

محمد حسن عسکری

”منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔
 چھوٹے، چمکاتے، اڑاب وہ ایک نثرین کرسچچ کے فلد
 مادے کو خارج کرنا چاہتا ہے مریض چیختا ہے، چلاتا ہے،
 بین کرتا ہے، منٹو کو اس کی پروا نہیں وہ اس قدر بیم
 ہے کہ کلورو فارم دینا بھی پسند نہیں کرتا۔

کرشن چندر

”منٹو آدم کی جزاؤں گناہ کا قائل ہے۔ منٹو کا انسان نوری
 ہے نہ ماری، وہ آدم خاکی ہے۔۔۔ وہ وجود خاکی جس میں
 بنیادی گناہ، فساد، قتل و خون وغیرہ کے باوجود، خدا نے نوری
 فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں۔

ممتاز شبیر